سلسلۂ اشاعت انجمن ترقی اردو اسلامیہ کالج لاہور

پنجاب میں اُردو

از

جناب حافظ محمود خاں صاحب شیرانی

پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور و لیکچرر پنجاب یونیورسٹی

جسکو

میاں نور حسن متعلم بی اے کلاس آنریری سیکرٹری انجمن ترقی اردو لاہور

نے

حسب ایمائے مجلس انتظامیہ انجمن مذکور

اپنے اہتمام سے شائع کیا
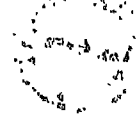
انتساب

آجکل پنجاب میں اردو زبان اور اس کے علم و ادب سے جو غیر معمولی دلچسپی نظر آتی ہے اس کی تعمیر میں

سب سے زیادہ

میرے دیرینہ مخدوم خان بہادر سر شیخ عبدالقادر بی.اے بیرسٹر ایٹ لا ممبر پنجاب لیجسلیٹو کونسل

کی خدمات زبان و ادب کا حصہ ہے اسلئے

میں اس ناچیز تالیف کے انتساب کے لئے جو از اوّل تا آخر، پنجاب اور اُردو کے باہمی تعلقات کے تذکروں سے لبریز ہے. آپ ہی کے نام نامی کو طغرائے عنوان بنانے کی عزت حاصل کرتا ہوں -!
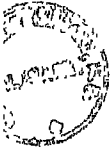
عرضِ حال

اس تالیف میں اُردو زبان کی قدامت پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے خصوصاً اُن مسائل پر جن کی رو سے پنجاب، اس زبان کی ابتدا، اور اس کی نشو و نما کا گہوارہ مانا جاسکتا ہے۔

اُردو زبان کے آغاز کا سرزمینِ پنجاب سے منسوب ہونا، کوئی نیا نظریہ یا عقیدہ نہیں ہے۔ اس سے پیشتر پنڈت کیفی (بعقیدۂ خود مذاق کے طور پر) اور شیر علی خاں صاحب سرخوش اپنے پرلطف تذکرہ "اعجازِ سخن" میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کرچکے ہیں مگر اس کتاب میں، اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ نظر ڈالی گئی ہے۔

اس تالیف کا نام اسکے آخری باب "پنجاب میں اُردو" کی رعایت سے رکھا گیا ہے، جو تمام و کمال پنجاب کے اُردو گو شعرا کے ذکر و اذکار سے مملو ہے۔

یہاں مجھے اس شکریہ کے اظہار سے بھی عہدہ برآ ہونا ہے؛ جو اس کتاب کی تالیف کے سلسلے میں بعض حضرات کی معاونت کی طرف سے مجھ پر عائد ہوتا ہے۔

اس فہرست میں سب سے پہلا نام میرے "کالج ناش" دوست پروفیسر سراج الدین آذر ام۔اے کا ہے۔ جن کے نفیس کتب خانہ کا دروازہ ہمیشہ میرے لئے کھلا رہا اور جنکی نادر کتابوں سے اس سلسلہ میں مَیں نے بہت کچھ مفید مطلب سرمایہ اخذ کیا ہے۔ ان کے بعد مجھے مولوی محبوب عالم صاحب مالک و مدیر "پیسہ اخبار"۔ جناب شیر علیخاں صاحب سرخوش جناب غلام دستگیر صاحب نامی میاں حفظ الرحمٰن صاحب منہاس اور عبد السبحان صاحب بی۔اے کا ذکر کرنا ہے۔ جنکی قیمتی امداد کا شکریہ، میری دلی مسرت اور خوش وقتی کا باعث ہے۔

اسلامیہ کالج لاہور — محمود شیرانی

فہرست مطالب

پنجاب میں اُردو

مُقدمہ

جب پرنسپل عبداللہ یوسف علی نے مجھ سے اُردو کے آغاز و قدامت کے موضوع پر لکھنے کیلئے ارشاد کیا تو میں نے ان سے عرض کی تھی کہ "مضمون اگرچہ دلچسپ ہے لیکن اس پر ہماری موجودہ معلومات کی روشنی میں قلم اُٹھانا قبل از وقت معلوم ہوتا ہے۔ اور صحیح اطلاعات کی بہم رسانی کے لئے شاید ابھی ایک عرصہ درکار ہوگا ——— !"

اُردو کی قدامت

ہم اُردو کے آغاز کو شاہجہاں یا اکبر کے دربار اور لشکر گاہوں کے ساتھ وابستہ کرنے کے عادی ہیں۔ لیکن یہ زبان اس زمانہ سے بہت زیادہ قدیم ہے بلکہ میرے خیال میں اس کا وجود انہی ایام سے ماننا ہوگا جب سے مسلمان ہندوستان میں آباد ہیں۔ اُردو کی قدامت کا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہوگا کہ گجرات و دکن میں اس زبان میں دسویں صدی ہجری کی ابتداء یعنی بابر کی آمد کے قبل سے، ادبیات کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے اور فارسی لغات کی شہادت سے جو نویں صدی ہجری میں ہندوستان میں لکھی جاتی ہیں، صاف واضح ہوتا ہے کہ اُردو زبان ان ایام میں تمام اسلامی ہندوستان میں سمجھی جاتی تھی۔ یہ لغات نگار اس کو **ہندی** کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اور ہندی سے ان کا مقصد یہی زبان ہے جسے ہم **اُردو** کہتے ہیں ——— !

بھاشا کا تعلق اردو سے

ہم اردو کو برج بھاشا کی بیٹی سمجھتے رہے ہیں! لیکن جب ان دونوں زبانوں کی صرف و نحو، اور دوسرے خط و خال اور خصائص پر غور کیا جاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے راستے مختلف ہیں! اردو، جہاں اپنے اسماء و افعال کو **الف** پر ختم کرتی ہے برج **واو** پر ختم کرتی ہے۔ برج میں جمع کا طریقہ بہت سادہ اور سہل ہے، لیکن اردو میں بہت پیچیدہ ہے۔ اردو میں مرکب افعال کا مع توابعات کے بہت رواج ہے۔ بھاشا میں یہ بات موجود نہیں ہے۔ اس لئے اردو کو بھاشا سے کوئی تعلق نہیں۔ ان میں ماں بیٹی کا رشتہ نہیں ہے بلکہ بہنوں بہنوں کا ——— !

اُردو کا ارتقا کس زبان سے ہوا؟

کہا جاتا ہے کہ مغربی ہندی، جس کی برج بھاشا، ہریانی، راجستھانی، پنجابی اور اردو شاخیں ہیں قدیم پراکرت سورسینی کی یادگار ہے!

لیکن جس زبان سے اُردو ارتقا پائی ہے وہ نہ برج ہے نہ ہریانی اور نہ قنوجی ہے بلکہ وہ زبان ہے جو صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ ہمیں تحقیق معلوم نہیں کہ جب مسلمان دہلی میں آباد ہوئے اس وقت اس علاقہ میں کیا زبان بولی جاتی تھی؟ آج دیکھا جاتا ہے کہ دہلی کے قریب ہی تین زبانوں یعنی ہریانوی برج اور راجستھانی کا سنگم ہوتا ہے اور گریرسن نے نصف دہلی کو ہریانوی زبان کے علاقہ میں شامل کر دیا ہے مگر راقم کی رائے میں ہریانوی کوئی علیحدہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں ہے بلکہ وہ پرانی اردو ہے یعنی وہی اردو ہے جو گیارھویں صدی ہجری میں خود دہلی میں بھی بولی جاتی تھی۔ اس میں اور اردو میں بہت کم فرق ہے۔ اگر ہم اس کو اردو نہ مانیں تو اردو کی شاخ ماننے میں تو ہمیں عذر نہیں ہونا چاہئے۔ بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ یہ زبان اسلامی دور میں دہلی کے اثرات میں بنتی ہے۔

مسلمانوں کی آمد کے وقت دہلی کی زبان

اب سوال یہ رہجاتا ہے کہ دہلی میں مسلمانوں کی آمد کے وقت کونسی زبان بولی جاتی تھی۔؟ یا وہ راجستھانی ہوگی یا برج! اس میں شک نہیں کہ آج دہلی میرٹھ مظفرنگر، سہارنپور، یا دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ دوآبہ میں اردو بولی جاتی ہے۔ لیکن اب سے تین صدی پیشتر، اس علاقہ کی یہ زبان نہ تھی، ..... بلکہ یہاں برج کا طوطی بول رہا تھا! مغلوں کی آمد کے وقت گنگوہ ضلع سہارنپور میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی (متوفی ۹۴۵ھ) باوجودیکہ ایسے علاقہ سے تعلق رکھتے تھے جہاں آج اردو مادری زبان ہے لیکن وہ اپنے ہندی اشعار ایسی زبان میں لکھتے ہیں جو برج کے مماثل ہے۔ علیٰ ہذا، مخدوم بہاءالدین برناوی (برناوہ ضلع میرٹھ) کے ہیں، لیکن ان کے ہندی اشعار قطعی برج میں ہیں! اس سے ظاہر ہے کہ دوآبہ میں برج زبان ہی مستعمل تھی۔ اردو نے ان علاقوں سے رفتہ رفتہ برج کو خارج کر دیا ہے جس طرح ہریانہ کے علاقہ سے ——— !

یہ بات ہمیں یاد رکھنی چاہئے کہ امیر خسرو دہلی کی زبان کو "دہلوی" لکھتے ہیں۔ ابوالفضل بھی آئین اکبری میں اسکو "دہلوی" کے نام سے یاد کرتا ہے! اب شیخ باجن (متوفی ۹۱۲ھ) بھی اسکو "دہلوی" کہتے ہیں۔ اور جو نمونہ اس زبان کا دیتے ہیں وہ قطعی اردو ہے ——— !

اردو دہلی میں کس طرح پہنچتی ہے؟ کیا پنجاب سے؟

اُردو، دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے، بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی میں جاتی ہے۔ اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کرکے جاتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لیکر گئے ہوں!

اس نظریہ کے ثبوت میں اگرچہ ہمارے پاس کوئی قدیم شہادت یا سند نہیں۔ لیکن سیاسی واقعات، اردو زبان کی ساخت نیز دوسرے حالات ہمیں اس عقیدہ کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں —— !

شہادت لسانی اور اردو ملتانی پنجابی کی مماثلت

اس کے متعلق شہادت لسانی کافی ہے —— ! ہم دیکھتے ہیں کہ اردو اپنی صرف ونحو میں ملتانی زبان کے بہت قریب ہے۔ دونوں میں اسما و افعال کے خاتمہ میں الف آتا ہے، دونوں میں جمع کا طریقہ مشترک ہے! یہاں تک کہ دونوں میں جمع کے جملوں میں نہ صرف جملوں کے اہم اجزا بلکہ ان کے توابعات و ملحقات پر بھی ایک ہی قاعدہ جاری ہے، دونوں زبانیں تذکیر وتانیث کے قواعد، افعال مرکبہ و توابع میں متحد ہیں! پنجابی و اردو میں ساٹھ فیصدی سے زیادہ الفاظ مشترک ہیں!

پنجابی اور اردو کا اشتراک

آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی کتب تاریخ و لغات کی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ہندوستان لاکھ کو "اک"۔ پاگ کو "پگ" کھانڈ کو "کھنڈ" بھانڈ کو "بھنڈ" ماٹ کو "مٹھ"۔ آنب کو "انب" مونگ کو "منگ" گاڑی کو "گڈی"۔ گڑیا کو "گڈی" تالاب کو "تل" بڑی جھیل کو "ڈھنڈ" اور چقندر کو "گنگلو" یا "گانگلو" کہتے تھے۔ اہل پنجاب انہی الفاظ کو آج بھی "لکھ" "پگ۔ کھنڈ۔ بھنڈ۔ مٹھ۔ انب۔ منگ۔ گڈی۔ گڈی۔ ڈھنڈ اور گونگلو بول رہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں کا وہ عنصر جو قدیم سے ان میں مشترک تھا رفتہ رفتہ اردو زبان سے خارج ہوتا رہا ہے۔

ایسے افعال و الفاظ مثلاً آکھنا۔ لوڑھنا۔ اپڑنا۔ پچھاننا۔ سٹنا۔ لانا (لگانا)۔ کھڑنا۔ سڑنا (جلنا) پانا (ڈالنا)۔ لڑنا (ڈسنا)۔ بندھنا (باندھنا) منگن (مانگنا) نسنا (بھاگنا)۔ کھیر (دودھ)۔ نال (ساتھ)، یائے مخلوط التلفظ۔ "ویں" ضمیر کا امر "سی" قسم کا مستقبل وغیرہ جو آج صرف پنجابی میں رائج ہیں کبھی اور قدیم اردو میں عام طور پر مستعمل تھے۔

اسی طرح اردو کے محاورات دان "دہاڑے"۔ "ملنا جلنا" "چپ چپاتا"۔ "مانگن تانگنا" "بال وال" وغیرہ میں اردو خوان ان کے جزو ثانی کو تابع مہمل کہنے کے عادی ہیں، مگر پنجابی زبان میں یہ الفاظ بامعنے ہیں اور آج بھی استعمال میں آ رہے ہیں۔

ادھر اردو کی اضافت کا۔ کے۔ کی۔ اگرچہ فی زمانہ اردو کے ساتھ مخصوص ہے پنجاب کے دیہات و قصبات نیز بعض دیگر اسما کے ساتھ اب بھی موجود ہے۔ الغرض یہ امور اردو اور پنجابی زبانوں کے اشتراک قدیم کے بیّن دلائل ہیں۔

پنجاب پر بیرونی وسیاسی اثرات

علاوہ بریں پنجاب، ہندوستان کی خوش قسمتی یا بدقسمتی کی کنجی بنا رہا ہے!

اور شمالی اطراف سے ہندوستان پر ہر عہد اور ہر زمانے میں حملے ہوتے رہے ہیں چنانچہ مسلمان بھی شمال ہی کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئے، انکی ابتدائی بستیاں، سندھ اور ملتان میں قائم ہوتی ہیں تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں صفاریوں اور سامانیوں کی بنا پر مغربی پنجاب اور سندھ میں ایرانی اثر فروغ پانے لگتا ہے

ملتان اور اسکے اطراف میں فارسی کا دور!

حتیٰ کہ چوتھی صدی ہجری کے عرب سیاح لکھتے ہیں، کہ ملتان و منصورہ میں فارسی بولی جاتی ہے۔ یہ سیاح یہاں کے بعض شہروں اور دریاؤں کے نام فارسی طرز میں لکھتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایرانی تمدن کے اثرات، ان اطراف میں بہت وسعت اختیار کر چکے تھے۔ چوتھی

پنجاب پر ایرانی تمدن کا اقتدار

صدی کے اواخر سے محمودی حملوں کا آغاز ہوتا ہے اور تمام پنجاب آل ناصر کے زیر اقتدار آجاتا ہے۔ آل غزنہ کی حکومت تقریباً ایک سو ستر سال تک رہتی ہے۔

غزنوی دور میں مسلمانوں کی نئی زبان!

اگر آل غزنہ سے پیشتر، مسلمانوں کو کسی ہندی زبان کے اختیار کرنیکی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تو اس عہد میں جو خاصہ دراز ہے وہ پنجاب میں کوئی نہ کوئی زبان سرکاری، تجارتی و معاشرتی اغراض سے اختیار کر لیتے ہیں جس کو غوریوں کے عہد میں، جب دار السلطنت لاہور سے دہلی جاتا ہے اسلامی

پنجاب کی نئی زبان کا مرکز ثقل دہلی میں منتقل ہوتا ہے

فوجیں اور دوسرے پیشہ ور اپنے ساتھ دہلی لے جاتے ہیں! دہلی میں یہ زبان برج اور دوسری زبانوں کے دن رات کے باہمی تعلقات کی بنا پر، وقتاً فوقتاً ترمیم قبول کرتی رہتی ہے اور رفتہ رفتہ اردو کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے!

پنجاب کا اردو کے ساتھ تعلق یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ بعد کے زمانہ میں بھی سیاسی اسباب اس تعلق میں تجدید پیدا کرتے رہتے ہیں۔ تغلق آٹھویں صدی میں سید اور لودھی نویں صدی ہجری میں ایسے خاندان ہیں جو خاص پنجاب سے نکل کر دہلی آتے ہیں۔ ان کے لشکر پنجاب اور پنجابیوں سے تعلق رکھتے تھے اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر ان نوواردوں نے دہلی کی زبان پر اور اثر ڈالا ہو۔

ساتویں صدی ہجری میں اس زبان کی حالت

ساتویں صدی ہجری میں اسمیں وہ خصوصیات نظر آتی ہیں جو ایک طرف اس کو پنجابی سے اور دوسری طرف برج سے ممیز کرتی ہیں! شیخ فرید الدین گنجشکر رح (متوفی سنہ ۶۶۴ھ) اور مادر مومناں کے درمیان اردو میں جو گفتگو ہوئی اس کے دو فقرے ہم تک پہنچے ہیں مادر مومناں نے کہا تھا "خوجا برہان الدین بالا ہے" شیخ نے جواب میں فرمایا "پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے" آخری فقرہ میں "کا" اور "ہوتا ہے" ایسے الفاظ ہیں جو اس جملہ کو پنجابی اور برج سے مختلف کر دیتے ہیں۔

آٹھویں صدی ہجری کا ایک اور فقرہ جو فیروز شاہ خلجی ۷۵۲ھ و سنہ ۷۹۰ھ کے حملہ سندھ سے تعلق رکھتا ہے تاریخ فیروز شاہی میں شمس سراج عفیف یوں نقل کرتے ہیں "برکت شیخ حجرہ یا اک موا اک رہا"

دہلی سے اردو، ہندوستان کے مختلف حصوں میں پہنچتی ہے

اسلامی سلطنت چونکہ دہلی پہنچکر بہت جلد مرکزی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اس لئے یہ زبان اسلامی لشکروں مہاجروں اور نوآبادکاروں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے ہر گوشے میں پہنچ جاتی ہے۔ خلجی اس کو گجرات اور دکن پہنچاتے ہیں؛ محمد تغلق جب آٹھویں صدی ہجری میں دہلی کو اُجاڑ کر دولت آباد کو آباد کرتا ہے تو یہ زبان، دکن میں مسلمان نوآبادکاروں کی ... زبان بنجاتی ہے۔ گجرات و دکن میں، دسویں صدی ہجری سے، اسمیں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ گویا دکن و گجرات میں اردو کے علیحدہ علیحدہ مرکز قائم ہو جاتے ہیں۔ اہل گجرات اس کو نویں صدی ہجری میں "زبان دہلوی" کے نام سے یاد کرتے ہیں لیکن آنیوالی صدی میں "گجری" یا "گوجری" کہنے لگتے ہیں! اسی طرح دکن میں پہلے پہل یہ زبان "زبانِ ہندوستان" کہلائی، بعد کو "دکنی" کہنے لگے۔ اہل دہلی، بارھویں صدی کے آخر سے اسکو "ریختہ" کہنے لگے جو دراصل موسیقی کی اصطلاح تھی۔ بعد میں کلام مخلوط بدو زبان کے معنے دینے لگی اور پھر نظم ہندی پر اس کا اطلاق ہونے لگا۔

اردو کی ہردلعزیزی

شاہانِ گجرات اُردو میں بات چیت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ محمود شاہ بیگڑہ کا یہ فقرہ تاریخ میں محفوظ ہے "نیچی بیری سب کوئی جھوڑے" بابر اس کی ہردلعزیزی دیکھ کر اسمیں ایک مصرعہ لکھتا ہے "مجکا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی" اگر مغلوں کا حملہ ہندوستان میں سدراہ نہ بنتا تو اسمیں شک نہیں کہ اردو بہت جلد فارسی کو ہٹا کر ہندوستان کی درباری زبان بنجاتی ——! فیروز شاہ تغلق کے بعد، ایکدم سی فارسی پر زوال آتا ہے، اور تغلق، سید، اور پٹھان اردو ہی اختیار کر لیتے ہیں! محمد شاہ تغلق، لفظ "کھرا کھڑی" کے تلفظ کو، اصلی دہلوی اور غیر دہلوی باشندوں کی شناخت کے لئے معیار مقرر کرتا ہے۔[۱] سوریوں کو فارسی سے سخت دشمنی تھی! اکبر کے عہد میں برہمنوں کے طفیل اردو میں سنسکرت کے الفاظ روشناس کئے گئے۔ لیکن بعد کو یہ طریقہ متروک ہوگیا۔ عالمگیر کے عہد سے دیکھا جاتا ہے کہ طبائع کا عام رجحان اردو کی طرف ہوتا جاتا ہے۔ اگرچہ اسکے اسباب سے ہم ناواقف ہیں ——!!

---

[۱] سلطان فیروز شاہ خلجی ۶۸۹ھ و ۶۹۵ھ نے اپنے عہد میں ایک لاکھ سے زیادہ غلام جمع کئے تھے جو زیادہ تر مشرقی ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے۔ فیروز شاہ کے جانشینوں کے عہد میں یہ لوگ مقتدر طاقت در ہوگئے تھے کہ سیاسی معاملات میں دخیل ہو کر ملک میں فتنہ و فساد برپا کرنے لگے۔ ناصر الدین محمد شاہ ۷۹۲ھ و ۷۹۵ھ نے تنگ آکر دہلی سے ان کا اخراج عام کر دیا اور حکم دیدیا کہ تین دن کے اندر اندر شہر خالی کر دیں اگر اس کے بعد نظر آئیں تو قتل کر دئے جائیں۔ اس سخت حکم کے باوجود اکثر کی مدت کے متعدد ارکان دہلی ہی میں مقیم رہے اور جب گرفتار ہوئے تو اپنے آپ کو دہلی کا اصلی باشندہ بیان کیا۔ محمد شاہ نے اصلی دہلوی اور پوربی و بنگالی کی شناخت کے لئے ان سے لفظ "کھرا کھڑی" کہلوایا چونکہ مشرقی ہند کے لوگ ہائے مخلوط التلفظ کے ادا کرنے میں عام ہندوستانیوں سے مختلف ہیں اس لئے یہ غلام دہلویوں سے بآسانی کے ساتھ پہچان لئے گئے اور تلوار کے گھاٹ اتار دئے گئے۔

شمالی ہندوستان میں اردو کا مرکز شمالی ہندوستان میں دکن سے ایک صدی بعد، تصنیفات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے مگر ابتدائی منازل میں اس کی رفتار بہت سست ہے! دہلی میں محمد شاہی دور میں اردو کا مرکز قائم ہونے سے پیشتر، یہ زبان دہلی کے مضافات اور اضلاع میں ادبی حیثیت اختیار کرتی ہے۔ شمالی ہند کے مصنفین میں سب سے پیشتر محمد افضل پانی پتی (یا جھنجھانوی) ہیں جو ۱۰۳۵ھ میں بعہد جہانگیر وفات پاتے ہیں۔ ان کا "بارہ ماسہ" بہت مشہور ہے۔ یہ تصنیف جس میں فارسی اثرات بہت نمایاں ہیں برج کے اثرات سے بھی خالی نہیں ہے ——— !

ہریانوی زبان کا مرکز ادھر ہریانی زبان کے علاقہ میں اردو گیارھویں صدی ہجری میں بعہد عالمگیر اپنا قدم جما لیتی ہے۔ جھجھر کے محبوب عالم عرف شیخ جیون متعدد تصنیفات اس زبان میں یادگار چھوڑتے ہیں۔ جن میں "دردنامۂ محمد" سب سے اہم ہے۔ ان کی دوسری تصنیفات "محشر نامہ" "خواب نامۂ پیغمبر" "دہیر نامۂ بی بی فاطمہ خاتون" کے نام ہم تک پہنچے ہیں۔ اسی عہد میں عبدالواسع ہانسوی، جو فارسی کی مشہور قواعد "دستور العمل فارسی" کے مصنف ہیں، بچوں کے لئے "نصاب سہ زبان" لکھتے ہیں، جس میں ذریعۂ تعلیم یہی زبان ہے ——— !

عہد عالمگیر کی ایک یادگار تحریک عالمگیر کے عہد کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس عہد سے کچھ عرصہ پیشتر ایک نئی تحریک وجود میں آتی ہے، جس کے ماتحت بچوں کی تعلیم کا ذریعہ ہندی زبانیں بنائی جاتی ہیں! عالمگیر کے عہد میں یہ تحریک عام ہو جاتی ہے اور بیشمار کتابیں بچوں کی تعلیم کے لئے لکھی جاتی ہیں جنہیں اکثر و بیشتر منظوم ہوتی ہیں۔ یہ سلسلہ ہندوستان کے اکثر صوبوں میں جاری ہو جاتا ہے مثلاً دہلی، دکن، اور پنجاب ——— !

ہریانی زبان اور اس کی حالت ہریانی زبان، دراصل ایک قسم کی اردو ہے جو گیارھویں صدی ہجری میں شاید اردو سے اسقدر مختلف نہیں تھی جس قدر کہ آج دیکھی جاتی ہے۔ کیونکہ زمانۂ مابعد میں، جبکہ ہریانی اپنی اصلی حالت پر قائم رہی، اردو میں دہلی کے محاورے اور شعراء کے تصرفات کی بنا پر کثیر تغیرات واقع ہوئے اور موجودہ اردو اسی اصلاح شدہ شکل کا نام ہے۔ ہریانی علاقوں میں تصنیفات کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ لیکن اس کے ادبیات کے متعلق ہماری موجودہ معلومات بہت محدود ہے۔ حضرت شاہ غلام جیلانی رہتکی مصنف "چوپایہا" (متوفی ۱۲۳۵ھ) اور مولوی محمد رمضان مصنف "آخر گت" و "بلبل باغ محمد" (۱۲۲۶ھ) اور النور رہتکی (جو اسی صدی کے نصف دوم سے علاقہ رکھتے ہیں) کے نام اور تصنیفات سے پتہ چلتا ہے کہ محبوب عالم کی تحریک

اس علاقہ میں برابر جاری رہی ہے ——— اگر ہریانی کی قید کو اڑا دیا جائے تو اور مصنفین بھی اس فہرست میں جگہ پا سکتے ہیں مثلاً میر جعفر زٹلی نارنولی جو عہد عالمگیر و فرخ سیر کے مشہور ہزال ہیں - اور امام بخش تھانیسری، مصنف معجزہ نبی جو بارھویں صدی کے بزرگ ہیں - اور دلبر میواتی جنہوں نے اپنا دیوان بہادر شاہ، بادشاہ دہلی کی خدمت میں بھیجا تھا ——— !

پنجاب میں اردو کا نیا مرکز پنجاب میں اردو کا نیا مرکز قائم ہوتا ہے - یہاں کے مصنفین میں سب سے مقدم مولانا عبدی ہیں جو ۱۰۷۴ھ میں بعہد عالمگیر فقہ ہندی تصنیف کرتے ہیں نقہ ہندی کی اردو بالکل پنجابی نما ہے اور جملوں کی بندش بھی پنجابی طرز کی ہے یہ تصنیف ہریانہ کرنال اور میوات کی زبان سے مختلف ہے - بارھویں صدی میں قصبہ بٹالہ (ضلع گورداسپور) میں اردو کا خاصہ چرچا رہا ہے - یہاں اردو کی تحریک شیخ محمد فاضل الدین بٹالوی (متوفی ۱۱۵۱ھ) کے مبارک ہاتھوں سے پروان چڑھتی ہے ! ان کے پیر بھائی شیخ نور بھی اس میں حصہ لیتے ہیں شیخ فاضل الدین کے فرزند شاہ غلام قادر (متوفی ۱۱۶۷ھ) اردو مثنوی موسومہ بہ رمز العشق کے مصنف ہیں - اور شاہ فقیر اللہ بھی اپنی اردو مثنوی ۱۱۲۰ھ میں اس کے تتبع میں لکھتے ہیں - بارھویں صدی کے نصف آخر میں پنجاب میں متعدد بزرگ ایسے نظر آتے ہیں جو اردو میں نظمیں لکھتے ہیں - شیخ محمد جان شیخ نصیر الدین محمد غوث بٹالوی - نامدار خاں دت - دلشاد پسروری (پسروری) غلام قادر جلالپوریہ اور رام کشن کے نام اس ذیل میں پیش کئے جا سکتے ہیں - بٹالہ کی تحریک کا "اس عہد کی دہلی میں اردو کی تحریک" سے کوئی تعلق نہیں ہے - اگرچہ دونوں کز قریب قریب ایک ہی زمانہ میں قائم ہوتے ہیں - پنجاب میں اردو نظم کا زیادہ رواج رہا ہے اور نثر نسبتاً کم ملتی ہے تاہم نثر کے نمونے موجود ہیں مثلاً کتاب "ہزار مسائل" اور رسالہ "سلوتری" جنکے مصنفین کا سراغ تا حال نہیں مل سکا ہے !

اردو کا آخری لیکن سب سے زبردست اور شاندار مرکز دہلی ہے جو ولی اورنگ آبادی کے اثرات میں قائم ہوتا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد وہاں سے لکھنؤ، اور لکھنؤ سے کلکتہ پہنچکر عام ہو جاتا ہے !

ہندی السنہ پر مسلمانوں کے احسانات یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندی السنہ کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کے بارے میں بھی چند کلمات اضافہ کر دئے جائیں ——— ایک ایسے زمانہ میں جبکہ مسلمانوں پر، برادران وطن، ہر قسم کے الزامات و اتہامات عائد کرنے کے عادی ہو رہے ہیں، ان کی تاریخ کو توڑ مروڑ کر مسخ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور ان کے احسانات کو، جو انہوں نے ہندوستان پر کئے گلدستہ طاق نسیاں بنایا جا رہا ہے!

ح

یہ بیان کرنا بالکل بے موسم معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسلمان ہی ہیں جنہوں نے برادرانِ وطن سے پیشتر ہندی زبانوں کی تہذیب و ترقی پر توجہ دی ہے! اس ملک کے شمال و مغرب کی زبانوں، یعنی پشتو، سندھی، کشمیری اور پنجابی کا قریب قریب تمام ادبی سرمایہ مسلمانوں کی کوششوں کا ممنونِ احسان ہے بنگالی زبان اور اس کے ادبیات کو فروغ دینے والے مسلمان ہیں! برج قنوجی اور اودھی کی ترقی میں بھی مسلمانوں نے خاصہ حصہ لیا ہے۔ کبیر، قطبن اور محمد جائسی ـــــ تلسی داس اور سورداس سے پیشتر میدان میں آتے ہیں ـــــ!

اردو املا اور رسم الخط | آخر میں اردو املا کے متعلق چند الفاظ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے ـــــ فارسی خط زمانۂ قدیم سے ہندی اصوات اور ہندی السنہ کے لکھنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ابتدا میں خط نسخ، نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان کی تمام زبانوں کے لئے مخصوص تھا۔ چنانچہ پشتو، سندھی اور پنجابی آج بھی نسخ میں لکھی جاتی ہیں۔ عالمگیر کے بعد شمالی ہند میں نستعلیق رائج ہوگیا۔ خاص ہندی اصوات کے لئے علیحدہ علیحدہ علامات مقرر کی گئی ہیں اور مختلف زمانوں میں مختلف طریقوں سے لکھی جاتی ہیں۔ مثلاً ٹ، ڈ، ڑ پر پہلے تین تین نقاط، بعد میں، چار چار نقاط لگائے جانے لگے ـــــ گجرات میں بارھویں صدی ہجری کی ابتداء میں ان پر ضرب کی علامت "×" لگائی جاتی تھی اور الف ممدودہ دو الف کی شکل میں لکھا جاتا تھا ـــــ نویں صدی ہجری میں گاف کے نیچے تین نقطے لگائے جاتے تھے، بعد میں اوپر لگانے لگے ـــــ ہائے مخلوط التلفظ کا استعمال بھی دیرینہ ہے ـــــ اردو کا آخری الف لاحقہ بتقلید فارسی "ہ" کی شکل میں لکھا جاتا تھا مثلاً لہسوڑہ، چیونہ، سہرہ، سہجنہ، ہیرہ۔ اسی طرح مالوہ، بنگالہ اور بجگانہ وغیرہ

عہدِ عالمگیری میں ایک ترمیم | عالمگیر کے عہد میں نضائل خاں کے عرض کرنے پر، کہ ہندی رسم الخط میں اسم و کلمہ کے آخر میں "ہے" نہیں آیا کرتی بلکہ الف ہوتا ہے جیسے کانا کہا جاتا ہے اور الف ہی کی طرح تلفظ کیا جاتا ہے۔ اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایسے الفاظ کو الف کے ساتھ لکھا جائے۔ عالمگیر نے یہ تجویز پسند کی اور حکم دیدیا کہ آئندہ ایسے کلمے

الف کے ساتھ لکھے جائیں یعنی مالوہ کو مالوا ، بنگالہ کو بنگالا ' وقس علیٰ ھذا۔
اس فرمان کی تعمیل نہ صرف شاہی دفاتر اور ٹکسالوں میں ہوئی بلکہ اردو خوان لوگوں
نے بھی یہی املا اختیار کرلیا - اور آئندہ لہسوڑا ، چونا ، سہرا سہجنا ، ہیرا
لکھا جانے لگا ——— !

الف لاحقہ کے استعمال پر اردو اور پنجابی کا اشتراک

الف لاحقہ ' اردو میں ایسا الف ہے جو اکثر خاتمہ کی غرض سے
بڑھا دیا جاتا ہے اردو اور پنجابی اس الف پر اس قدر مصر ہیں کہ
جہاں کہیں یہ حرف موجود نہیں ہے - اصل کلمہ میں اضافہ کردیا جاتا ہے - حتیٰ کہ
غیر زبانوں کے الفاظ پر بھی یہ عمل جاری ہوتا ہے۔ مثلاً مرغ سے مرغا - یہی حالت
نیول ، بھنور ، کوئل اور بھوس کی ہے جو نیولا ، بھونرا ، کوئلا اور بھوسا بنا لئے
گئے ہیں ——— !!

اُردو

لفظ اُردو ایران میں مغولی عہد کی یادگار ہے اور منتصف قرن ششم
میں فارسی زبان میں رائج ہو جاتا ہے، اس کے معنے امرا و سلاطین کی فرودگاہ
یا کیمپ ہیں۔ تاریخوں میں سب سے پیشتر یہ لفظ جہانکشا ئے جوینی میں ملتا
ہے جس سے دو اقتباس یہاں درج کئے جاتے ہیں:۔

"و ہر سال کہ از قومے شخصے را برق رسد قبیلہ و خانۂ او را از میان
خیلان بیرون کنند تا مدت سہ سال و بار دوے شہزادگان در نتوانند
آمد" (ص ۱۶۲ جلد اول)

"تمامت پادشاہزادگان در خدمت و بندگی قاآن بیرون اردو سہ نوبت
آفتاب را زانو زدند و بازا در اندرون اردو آمدند و مجلس لہو و طرب
آراستند" (ص ۱۴۵ جلد اول)

ہندوستان میں اس لفظ کا استعمال بابر کے عہد سے ہونے لگا ہے۔
تزک بابری سے ذیل کی مثال ملاحظہ ہو:۔

"در وقت رسیدن نزد بامیان چادرہا ے اوروق ما را کہ عقب ماندہ
بود می بینند ما را خیال کردہ زود برمی گردند۔ بہ اُردوے خود رسیدہ

بہیچ چیز تقلید نشدہ کوچ می کنند" (ص ۱۱۶ طبع ملک الکتاب)
مگر زبان کے معنوں میں اس کا استعمال چنداں قدیم نہیں ہے۔ اس کو رواج میں آئے سو، سوا سو سال کا عرصہ کم و بیش گذرتا ہے۔ ادبیات میں سب سے پیشتر میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے یہ نام اختیار کیا۔ چنانچہ نوطرز مرصع تالیف ۱۲۱۳ھ کا یہ فقرہ:

"اور یہ جو کوئی جو صاحب سیکھنے زبان اردوئے معلیٰ کا رکھے گا سو مطالعہ اس گلدستہ نگارین کیسے ہوش اور شعور فحوائے کلام حاصل کرے"۔

میر امن نے بھی تحسین کی تقلید میں یہی نام رکھا۔ چنانچہ باغ و بہار ۱۲۱۷ھ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

"حقیقت اردو کی زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے" (ص ۴)

اس کے بعد یہ لفظ عام ہو گیا۔ دریائے لطافت تصنیف ۱۲۲۳ھ میں میر انشاء اللہ خاں اور قدرت اپنے تذکرہ میں اسی نام سے یاد کرتے ہیں، انشا کہتے ہیں:-

"بالجملہ زبان اردو مشتمل است بر چند زبان یعنے عربی و فارسی و ترکی و برجی وغیر آں"

قدرت کہتا ہے:-

"کرشما زبان دکنی را گذاشتہ ریختہ را موافق اردوئے معلیٰ شاہجہاں آباد موزوں بکنید"

مولوی اکرم علی اخوان الصفا اردو تالیف ۱۲۲۵ھ میں لکھتے ہیں:-

"رسالۂ اخوان الصفا کہ انسان و بہایم کے مناظرہ میں ہے تو اس کا زبان اردو میں ترجمہ کر لیکن نہایت سلیس کہ الفاظ مغلق اس میں نہ ہو دیں"

غازی الدین حیدر والی اودھ کے دور میں محمد بخش مہجور نورتن کے دیباچہ میں میں رقم طراز ہیں :-

"اگرچہ اس نالایق رد خلایق نے سابق میں انشائے گلشن نوبہار غیرت گلزار اور انشائے چار چمن دل لگن پر از قصص دلفریب و فسانہائے عجیب بعبارت رنگین اور مضمون نو آئین زبان اُردو میں تحریر او تسطیر کی ہیں"

حاجی نعمت اللہ اپنی تفسیر سورۂ یوسف میں تحریر کرتے ہیں :-

"غرض اس خاید وں کی امید پر بیچ لکھنے ترجمۂ ہندی از روئے کتاب احسن القصص کے مشغول ہوا اور وجۂ نزول اس سورت متبرک کے اور عجوبات اور لطائفات کہ بیچ سمجھ نادان کے آئے اپنی زبان روزمرہ کے میں جمع کی اور مفید زبان اُردو کا ہوا"

اسی کی وجہ تسمیہ کے متعلق صاحب ظہیر الانشا لکھتے ہیں :-

"چوں بازارا در ترکی و فارسی اُردو گویند ضرورت استعمال این زبان مرکب در بازار ہا ضرور تر شد خصوصاً در بازار خاص پادشاہی کہ بہ تعظیم نام بازار خاص اردوے معلّٰی بود ۔ لہٰذا نام مزد نازہ مرکب نیز اُردوے معلّٰی قرار یافت تا اینکہ با نقراض از منہ آں تخصیص آداب شاہی باقی نماند آں التزام لفظ معلّٰی ہم نماند فقط اُردو باقی ماند پس وجہ تسمیۂ اردو ہمین است و اسم با مسمّٰی ریختہ است یعنے زبان عربی و فارسی دریں ریختہ اند"

(منقول از جلوۂ خضر)

میرامن کی بھی قریب یہی رائے ہے ۔ کہتے ہیں :-

"آخر امیر تیمور نے جن کے گھرانے میں اب تک نام سلطنت کا چلا آتا ہے ہندوستان لیا ۔ ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں

داخل ہوا اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا"...... جب حضرت
شاہجہان صاحبقران ثانی نے قلعۂ مبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ
تعمیر کروایا...... اور شہر کو اپنا دارالخلافت بنایا تب شاہجہان آباد
مشہور ہوا اگرچہ دلی جدی ہے وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے۔
اور وہاں کے بازار کو اردوئے معلّٰی خطاب دیا" (ص۴)

سرسید احمد خاں بھی اپنی تصنیف آثارالصنادید میں انہی بزرگوں کے
ہم آواز ہیں :-

"اور چونکہ یہ زبان خاص پادشاہی بازاروں میں مروّج تھی اس واسطے
اس کو زبان اردو کہا کرتے تھے۔ اور پادشاہی امیر امرا اسی کو
بولا کرتے تھے۔ گویا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی یہی زبان تھی۔ ہوتے
ہوتے خود اس زبان ہی کا نام اردو پڑ گیا"۔

مؤلف فرہنگ آصفیہ کہتے ہیں :-

"وہ چونکہ اول اول اس کی شاہجہانی لشکر سے ابتدا ہوئی۔ لہذا اس کا نام
بھی اردو پڑ گیا۔ قلعۂ معلّٰی کے لاہوری دروازہ کے سامنے اردو بازار
کے نام سے ایک بازار بھی آباد ہو گیا۔ جو بلاقی بیگم کے کوچے اور
چاندنی چوک کی سڑک کے جنوبی پہلو پر واقع تھا"۔

ان بیانات میں قریب قریب اکثر اسناد اس امر پر متفق ہیں کہ دہلی کے
اردو بازار کی بنا پر اس زبان کا نام زبان اردو ٹھہرا۔ ان کا یہ خیال ممکن ہے
کہ صحیح ہو۔ یہاں اردو بازار کے متعلق چند الفاظ کہنے ضروری ہیں۔ اس میں
شک نہیں کہ دہلی میں ایک بازار کا نام اردو بازار تھا جو قلعہ سے ملحق تھا۔ لیکن
اس کا پہلا نام لاہوری بازار تھا۔ آثارالصنادید میں سید احمد خاں خونی دروازہ

اردو بازار

کے ذکر کے بعد کہتے ہیں :۔

"اور اس کے آگے بڑا بازار جس میں چاندنی چوک وغیرہ سب بازار شامل ہیں مگر اگلے زمانہ میں یہ بازار لاہوری بازار یا اُردو بازار کہلاتا تھا . . . . .
یہ بازار قلعہ کے لاہوری دروازہ سے فتحپوری تک ہے ۔اس بازار کے پہلے حصہ کو تو اُردو بازار کہتے ہیں اور اس کے آگے جہاں ترپولیہ اور کوتوالی ہے وہ اسی نام سے مشہور رہے اور اس کے آگے چاندنی چوک کہلاتا ہے اور اس کے آگے فتحپوری کا ۔یہ بازار ہے چالیس گز کے عرض سے بیس گز ادھر اور بیس گز ادھر، بیچ میں سرتاسر نہر جاری ہے اور گرد نہر کے دو رستہ درخت لگے ہوئے ہیں"۔

صاحب سیر المتاخرین اسی بازار کے بیان میں فرماتے ہیں : ۔

"غرض اس بازار میں دو طرف دوکانیں گچ کی کرسی دار بہت موزوں و خوش قرینہ ہیں اور اُس کے سقف بام پر بالا خانے یک منزلہ و دو منزلہ اور بیچ میں اس کے دو سڑکوں کو سنگ ریزہ و بجری سے ایسا پختہ و مصفّا کیا ہے کہ آدمیوں کا منہ اور عمارت کا چہرہ اُس میں مثال آئینہ کے دکھائی دیتا ہے ۔ ہر روز اُس پر آب پاشی ہوتی ہے ۔اہل گذر کی رُوح تازی ہوتی ہے اور مابین دونوں سڑکوں کے نہر جاری ہے اور کناروں پر سرو درختی ہے کہ اس کی ہیئت مجموعی جدول بین السطور کتاب نظر آتی ہے"۔ (ص ۳-۵)

لاہوری دروازہ کی رعایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں اس بازار کا نام لاہوری بازار رکھا گیا ۔بعد میں معسکر کی رعایت سے اردو بازار کہلانے لگا ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ بازار ۱۸۵۷ء میں برباد کر دیا ۔چنانچہ میرزا

غالب اُردوے معلّٰی میں میر مہدی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"واہ رے حسن اعتقاد ۔ ارے بندۂ خدا اردو بازار نہ رہا اردو کہاں
دلی کہاں ، واللہ اب شہر نہیں کیمپ ہے چھاؤنی ہے نہ قلعہ نہ
شہر نہ بازار نہ نہر" (صفحہ ۱۸۴ اکمل المطابع)

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں :۔

"تم اردو کے میرزا قتیل بنگئے ہو ، اردو بازار میں نہر کے کنارے
رہتے تھے رود نیل بنگئے ہو"۔ (صفحہ ۱۷۴)

تعجب ہے کہ اُردو ایک بازار کا نام ہونے سے زبان کا نام اُردو رکھ دیا گیا لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ یہ کوئی قدیم نام نہیں ہے ۔ نہ قدما اس کا ذکر کرتے ہیں نہ شعرا اس سے واقف ہیں نہ تاریخوں میں اس کا ذکر آتا ہے ۔ اس کی قدامت کی تائید میں البتہ ایک بیان ملتا ہے ۔ جو حکیم شمس اللہ صاحب قادری نے اردوے قدیم میں دیا ہے ، وہو ہذا :۔

"موید الفضلا سے (جو فارسی کی ایک مستند لغت ہے اور بابر کی
آمد سے ایک عرصہ پہلے سلطان ابراہیم کے عہد میں لکھی گئی) ثابت
ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان میں اسلامی لشکرگاہیں اُردو
کہلاتی تھیں اور زبان اردو کو اہل اردو کی زبان کہا کرتے تھے ۔
چنانچہ کتاب مذکورہ میں ایک مقام پر تحریر ہے :۔

"در زبان اہل اُردو خون خرابا نامند"۔

یہ بیان میں خیال کرتا ہوں حکیم صاحب ممدوح نے نولکشور کی مطبوعہ موید الفضلا سے لیا ہے لیکن یہ نسخہ اگرچہ مالکان مطبع اس کو مصنف کا دستخطی بیان کرتے ہیں مصنّف کے عہد سے بہت بعد کا نوشتہ ہے جب قلمی نسخوں سے

اس کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو اس میں سینکڑوں الفاظ ایسے ملتے ہیں جو قلمی نسخوں میں موجود نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نو لکشور نے کوئی ایسا نسخہ چھاپا ہے۔ جس میں کسی غیر شخص نے بعد میں بہت کچھ اضافہ کر دیا ہے مثلاً لفظ برہم کی تشریح میں وہ کہتا ہے :-

"و فقیر گوید کہ ایں لغت را از مجوسے کہ در دین خود بغایت فاضل بود و آر دشیر نام داشت و در عہد محمد اکبر شاہ از کرمان بہندوستان آمدہ بود تحقیق نمودم" (ص ۱۵۹)

اب یہ بیان صاحب موید الفضلا کا نہیں ہو سکتا اس لئے کہ وہ اپنی تصنیف ۹۲۵ھ میں ختم کر چکا ہے اور یہ شخص اکبر کا ذکر ایسے الفاظ میں کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُس وقت زندہ نہیں تھا۔ دوسرے یہ جملہ یعنے "در زبان اہل اردو خوان خرا با گویند" مجھ کو موید الفضلا کے قلمی نسخہ میں نہیں ملا۔ اور کوئی تعجب نہیں اگر مطبع نو لکشور کے مصحح نے اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہو۔ اردو سلاطین کے لشکر گاہوں کو کہتے تھے۔ اس معنے میں مغلیہ عہد کے تمام مورّخ اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں حتیٰ کہ اکبر کے بعض ایسے سکوں پر جو اثنائے سفر میں لگائے جاتے تھے اکثر اوقات "ضرب اُردوے ظفر قرین" ہوتا تھا۔ اس کے بعض مسی سکوں پر ایک طرف "اردو ظفر قرین" اور دوسری طرف "ضرب الف فلوس ہوتا تھا۔

جب ہم تحسین کے پیشروؤں کی تصنیفات دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بزرگ اُردو اور اُردوے معلیٰ کے نام تک سے روشناس نہیں۔ استعمال میں لانا کجا، وہ اس کو ہندی کے نام سے پکارتے ہیں یا ریختہ کے

نام سے۔ چنانچہ میر جعفر زٹلی جن کا عہد عالمگیر سے لیکر فرخ سیر کے دَور تک ہے۔ اس کو ہندی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ اپنی تصنیف زٹل نامہ کے خاتمہ میں جو شامل کلیات ہے، لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ سبھی کوڑہ و کرکٹ است ۔ ہندی در ندی زباں لٹ پٹ است"

شاہ حاتم اپنے دیوان زادہ میں جو ۱۱۶۹ھ کی یادگار ہے اپنے متعلق لکھتے ہیں:۔

"در شعر فارسی پیرو صائب است و در ریختہ ولی را استاد می داند"

(از فہرست اسپرینگر ص ۶۱۱)

میر اثر اپنی مثنوی میں جو فی زمانا خواب و خیال کے نام سے مشہور ہے۔ اور ۱۱۵۳ھ اُس کی تاریخ تصنیف ہے لکھتے ہیں:۔

"ایک تو ریختہ ہے سہل زبان ۔ دوسرے جب کہ ہو بشوخی بیان

دیگر ؎

فارسی سو ہیں ہندوی سو ہیں ۔ باقی اشعار مثنوی سو ہیں

دیگر ؎

ریختہ نے یہ تب شرف پایا ۔ جب کہ حضرت نے اُس کو فرمایا

مرتبہ ریختہ کا اور ہوا ۔ معتبر فارسی کے طور ہوا"

میرزا سودا تنبیہ الغافلین میں حوالۂ قلم کرتے ہیں:۔

"و خدا عالم است ایں چند بیت ریختہ از قبیل قصیدہ و غزل بچہ سبب حسن قبول یافتہ است"

نثر کے علاوہ نظم میں بھی وہ ریختہ ہی لکھتے ہیں۔ چنانچہ بعض امثال:۔

تو نے وہ سودا زبان ریختہ ایجاد کی

پڑھ کے اک عالم اُٹھا تا ہے نرے اشعار فیض (ص ۲۲۷)

دیگر؎

ریختہ اور بھی دنیا میں ہے اے سودا   جینے دیوے جو کبھو کاوشِ دوراں مجھ کو
(ص۲۵۶)

دیگر؎

کہنے لگے ریختہ جو کوئی سودا کی طرح   اس پنہ میں سے ہوتا لوح و قلم واہ واہ

دیگر؎

سخن کو ریختہ کے پوچھے تھا کوئی سودا   پسند خاطرِ دلہا ہوا یہ فن مجھ سے

دیگر؎

شعر ناموزوں سے تو بہتر ہے کہنا ریختہ   کب کہا میں قتل کر مضموں کسی کا ریختہ
بے حیائی ہے یہ کہنا مِن کے میرا ریختہ   خون معنےٰ تا رفیع باد پیما ریختہ
آبروے ریختہ از جوشِ سودا ریختہ   (ص۳۵۶)

دیگر؎

ریختہ کی جو وہ کہے ہے غزل   لفظ و معنےٰ میں کم ہے اُس کے خلل (ص۲۷۵)

یہی حالت میر تقی میر کی ہے میں اُن کے کلیات سے ذیل کی بعض امثال یہاں حوالۂ قلم کرتا ہوں:

؎ "گفتگو ریختہ میں ہم سے نہ کر   یہ ہماری زبان ہے پیارے (ص۱۳۱)

دیگر؎

مضبوط کیسے کیسے کہے ریختے ولے   سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں
(ص۴۲۵)

دیگر؎

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختے کے   بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے
(ص۱۳۹)

قایم فرماتے ہیں؎

قایم میں ریختہ کو دیا خلعتِ قبول   ورنہ یہ پیش اہلِ ہنر کیا کمال تھا

اور جرأت ؎

گہہ غزل اور اس انداز کی جرأت اب تو ریختہ جیسے کہ اگلی تری مشہور ہوئی

سید غلام علی عشرت پدماوت اردو مصنفہ ۱۲۱۱ھ کے دیباچہ میں رقم طراز ہیں :-

"انہوں نے قصہ راجہ رتن سین اور پدماوت کا کہ زبان پوربی میں تصنیف ملّا ملک محمد جائسی کا ہے زبان ریختہ میں تصنیف کرنا شروع کیا۔"

شاہ عبدالقادر دہلویؒ اپنے ترجمۂ قرآن پاک ۱۲۰۵ء میں فرماتے ہیں :-

"اول یہ کہ اس جگہ ترجمہ لفظ بلفظ ضروری نہیں کیونکہ ہندی ترکیب عربی سے بہت بعید ہے۔ اگر بعینہ وہی ترکیب رہے تو معنی مفہوم نہ ہوں دوسرے یہ کہ اس میں زبان ریختہ نہیں بولی بلکہ ہندی متعارف کہ عوام کو بے تکلف دریافت ہو۔"

یہی نہیں بلکہ ریختہ اور ہندی کا استعمال میرامن کے دَور کے بعد تک ہوتا رہا ہے۔ مولوی خرّم علی نصیحت المسلمین تالیف ۱۲۳۸ھ میں لکھتے ہیں :-

"بندۂ خرّم علی کے دل میں آیا کہ اس شرک کی برائی قرآن شریف سے ثابت کیجئے اور ہر آیت کا ترجمہ ہندی زبان میں صاف صاف بیان کریئے تاکہ ہر ایک کو فائدہ عام ہو۔"

ردِ سماع میں ایک رسالہ کا ترجمہ ۱۲۴۶ھ ہجری میں کیا گیا تھا۔ اس میں سے فقرۂ ذیل ملاحظہ ہو :-

"لیکن عام اس کی فہمید سے عاجز تھے اس لئے ریختہ زبان میں اس کے ترجمہ کرنے کا اتفاق ہوا۔"

غالب فرماتے ہیں :-

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا

(دیگر) شیفتہ گلشن بے خار میں لکھتے ہیں :

"تذکرۂ ترتیب یافت مشتملبر اشعار موزونان فصاحت گستر و ریختہ گویان
بلاغت طراز بغایت مختصر"۔

ریختہ کی وجہ تسمیہ میں ہمارے تذکرہ نگاروں نے حسب معمول عجیب عجیب خیال آرائیاں کی ہیں۔ منشی درگا پرشاد صاحب نادر خزینۃ العلوم میں کہتے ہیں :۔

"ریختہ بمعنے گرے ہوئے کے ہیں پس جو زبان اپنی اصلیت سے گر جائے
اس کو زبان ریختہ بولتے ہیں چنانچہ جیسے فارسی زبان میں عربی کے لغت
شامل ہوئے اسے زبان ریختہ فارسی کہتے ہیں۔ اسی طرح حسب تقریر بالا
زبان ریختۂ ہندی کو زبان اُردو سمجھتے ہیں" (خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم
ص۴۹ مفید عام لاہور ۱۸۷۹ء)

حضرت آزاد آبحیات میں فرماتے ہیں :۔

"اس زبان کو ریختہ کہتے ہیں کیونکہ مختلف زبانوں نے اسے ریختہ کیا ہے۔
جیسے دیوار کو اینٹ۔ مٹی۔ چونا سفیدی وغیرہ پختہ کرتے ہیں۔ یا یہ کہ
ریختہ کے معنے ہیں گری پڑی پریشان چیز۔ چونکہ اس میں الفاظ پریشان
جمع ہیں اس لئے اسے ریختہ کہتے ہیں"۔

صاحب جلوۂ خضر کا بیان ہے :۔

"اس زبان کا نام ریختہ شاہجہان کے وقت میں رکھا گیا۔ چونکہ ریختہ گچ
کو کہتے ہیں۔ پختگی کے لحاظ سے اس کو ریختہ کہنے لگے"۔

ہمارے مخدوم حضرت سرخوش اعجاز سخن میں رقم فرما ہیں :۔

"اگرچہ لفظ ریختہ کے فارسی میں کئی معنے ہیں مگر زبان کے تعلق میں فطرتاً
اس سے ٹوٹا پھوٹا یا شکستہ ہی مراد لی جا سکتی ہے"۔

ان بیانات میں ریختہ کے پہلے معنے گرے پڑے اور پریشان کے بتائے ہیں فارسی میں بیشک یہ معنے مستعمل ہیں۔ مثلاً شکست و ریخت یا شکستہ و ریختہ لیکن یہاں یہ معنے قطعاً ناموزوں ہیں۔ دوسرے معنے چونہ سفیدی وغیرہ کے دئے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ریختہ تعمیرات کی ایک اصطلاح ہے جس کا اطلاق عمارت پختہ و سنگین برخلاف عمارت گلیں و چوبیں پر ہوتا ہے اس لئے اس کا استعمال چونہ اور استرکاری پر بھی ہونے لگا جس سے عمارت پختہ و مضبوط ہو جاتی ہے۔

شمس سراج عفیف اپنی تاریخ فیروز شاہی میں حصار فیروزہ کی آبادی کے بیان میں اس کی خندق کی تعمیر کے متعلق کہتے ہیں:-

"بعد از مرتب شدن حصار خندق کاویدند اینچنیں کہ بعد از تہ خندق و با ہر دو بازوی خندق ریختہ برآوردند و بالاے بازوہاے خندق کنگرہ بستند (ص ۱۲۶)

دوسرے مقام پر بھی مورّخ بیان کرتا ہے:-

"دریں پنج کردہ آبادانی از ہر یک کروہ بکروہ کردہ بود۔ خلائق بے علائق خانہا ریختہ و گچ کردہ برآوردہ" (ص ۱۳۵)

تیسرے مقام پر یہ لفظ یوں آیا ہے:-

"در آں عمارت بصنعت کاریگراں اہل مہارت و بصارت از سنگ گہ سنگ (یا کہرسل) با چونہ ریختہ برآوردہ" (ص ۳۱۰)

چوتھے موقعہ پر یہ فقرہ ملتا ہے:-

"الغرض در ہر محلے و مقامے کہ عمارت کردہ ہم از ریختہ برآوردہ واند

جنس چوبینہ برائے نام نے مگر ہمیں تختہائے در" (ص۳۳)

ان چاروں فقروں سے واضح ہوتا ہے کہ ریختہ کے معنے پکی تعمیر کے لئے گئے ہیں۔ برخلاف کچی تعمیر کے جو مٹی یا لکڑی کی ہو۔ یعنے ریختہ ایسی تعمیر ہے۔ جو چونہ پتھر سے طیار ہو۔ سودا ایک مقام پر کہتے ہیں:۔

"ہر بیت رکھے ہے یہ غزل ایسی ہی مضبوط — سودا کوئی جوں ریختہ کے گھر پہ کرے گچ"

دوسرے مقام پر کہتے ہیں:۔

"مظہر کا شعر فارسی اور ریختہ کے بیچ — سودا یقین جان کہ روڑا ہے باٹ کا
آگاہ فارسی تو کہیں اُس کو ریختہ — واقف جو ریختہ کے ذرا ہوئے بھاٹ کا
سُنکر وہ یہ کہے کہ نہیں ریختہ ہے یہ — اور ریختہ بھی ہے تو فیروز شاہ کی لاٹ کا"

لیکن زبان کے سلسلہ میں ریختہ کے یہ معنے بھی نامناسب ہیں۔

مصدر ریختن

ہمیں یاد رہے کہ ریختن فارسی زبان میں متعدد معنوں میں آتا ہے اور معنوں سے قطع نظر وہ (۱) بنانے، ایجاد کرنے (۲) کسی چیز کو قالب میں ڈھالنے، نئی چیز بنانے اور (۳) موزوں کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے۔

مثال اوّل نظیری ؎

وآنکہ از الماس بہر جان ما — تیغ ابرو رمح مژگاں ریختند

(دیگر) باقر کاشی ؎

شاید از عہدۂ غمہائے تو آیم بیروں — تنئے از روے بریزم دلے از خارہ کنم

مثال معنے دوم ؎

برائے ریختن توپ تازہ شد تعیین — بشاہراہ عقیدت ز صدق شد پویاں

(دیگر) نظیری ؎

ہر طرف رنگے بگل بسرشتہ شد — قالب گبر و مسلماں ریختند

اِسی سے ریختہ گر نکلا ہے جو چیزوں کو ڈھالتا اور بناتا ہے سعید اشرف؎

"خود بخود بادۂ عیش از قدحم می ریزد گوئیا جام مرا ریختہ گر ساختہ است"

مثال معنے سوم ؎

"مصرع زلف بتاں چوں بزبان شانہ ریخت موشگافان اکلید گفتگو دندانہ ریخت"

یہی حالت مصرع ریختہ و معنی ریختہ کی ہے اس کا اطلاق ایسے مصرع یا معنی پر ہوتا ہے جو بے تکلف و تامّل ذہن میں آجاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ مصرع موزوں و معنے موزوں کے معنے دیتا ہے۔ ملا طغرا ؎

"داریم چو شانہ صبر تا روے دہد چوں مصرع زلف مصرع ریختۂ"

یہیں سے وہ محاورہ نکلا ہے "فلاں ریختۂ ایں کار است" یعنے اس کام کے لئے موزوں ہے۔ شغف ؎

"مے سوزم و می گدازم شمے گریم چوں شمع شغف ریختۂ ایں کارم"

ریختہ موسیقی کی اصطلاح

آخری معنے کے اثرات میں ریختہ نے ساتویں قرن ہجری میں ہندوستان میں نئے معنے پیدا کر لئے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب امیر خسرو دہلوی نے ایرانی اور ہندی موسیقی کے اتحاد سے ایک نئی چیز طیار کی اس کے لئے انہوں نے بعض نئی اصطلاحات مثلاً قول۔ ترانہ۔ معروفی۔ صوت۔ بسیط۔ دوبحر۔ چہار اصول۔ نقش۔ فارسی۔ اور غزل وغیرہ وغیرہ وضع کیں۔ اسی سلسلہ میں اُنہوں نے ریختہ کی اصطلاح بھی وضع کی۔ اس اصطلاح سے موسیقی میں یہ مقصد قرار پایا کہ جو فارسی، خیال ہندوی کے مطابق ہو اور جس میں دونوں زبانوں کے سرود ایک تال اور ایک اگ میں بندھے ہوں، اس کو ریختہ کہتے ہیں۔ ریختہ کے لئے کسی پردہ کی قید نہیں ہے۔ وہ ہر پردہ میں باندھی جاتی ہے۔ میری اس اطلاع کا ماخذ کتاب چشتیہ ہے جو مخدوم حضرت علاءالدین

ثانی برناوی نے ۱۰۶۵ھ ہجری میں تصنیف کی ہے۔ اس کتاب کا اصل نسخہ بحالت تباہ راقم کو مل گیا ہے۔ مخدوم علاء الدین جانشین ہیں۔ خاتم التارکین حضرت شیخ بہاء الدین برناوی متوفی سنہ ۱۰۳۰ھ کے جو فن موسیقی میں امیر خسرو کے بعد ہندوستان میں بے نظیر مانے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ راگ درپن میں فقیر اللہ نے موسیقی دانوں میں سب سے پیشتر آپ ہی کا ذکر کیا ہے۔ مخدوم علاء الدین اپنے پیر و مرشد مخدوم بہاء الدین کی سند پر امیر خسرو کی خدمات موسیقی کے ذکر میں ریختہ کے متعلق کہتے ہیں :-

"و اصطلاح دیگر آنکہ ہر فارسی کہ با مضمون خیال ہندوی مطابق باشد و الفاظ ہر دو زبان را در یک تال و یک راگ بربست نمودہ باشند و انضمام اتصال دادہ سرا بندآں را ریختہ گو یند و ایں ریختہ را در ہر پردہ می بندند و ذوق و لذتے افزوں می دہد"

اس عبارت میں خیال کسی شرح کا محتاج نہیں کیونکہ اب بھی موسیقی میں اس کا رواج ہے۔ رہی فارسی اس کے لئے مخدوم علاء الدین فرماتے ہیں :-

"فارسی اصطلاحی آں را نام نہند کہ یک بیت را با تا نائی مقرون ساختہ بربست کنند"۔

گویا ریختہ کا اطلاق ایسے سرود پر ہوتا تھا جس میں ہندی اور فارسی اشعار یا مصرعے یا فقرے جو مضمون۔ تال اور راگ کے اعتبار سے متحد ہوتے تھے۔ ترکیب دیدیئے جاتے تھے۔ اس کی مثال میں امیر خسرو کی وہ غزل بتائی جاسکتی ہے جس کا مطلع ہے ؎

زحال مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
چو تاب ہجراں ندارم ایجاں نلیہو گاہے لگائے چھتیاں

شیخ بہاء الدین بن حاجی معز الدین متوفی سنہ ۹۱۲ھ شیخ رحمت اللہ گجراتی کے مرید تھے۔

باجن تخلص تھا۔ اور فارسی و ہندی میں شعر کہتے تھے۔ انہوں نے اپنی ایک تالیف میں جو مریدوں کی ہدایت اور اپنے مرشد کے حالات میں لکھی ہے فقرات ذیل کو ریختہ کے نام سے یاد کیا ہے:۔

"بہ صوفی سرّ الٰہی این مرتبہ دار و شاہی بہ مظہر عین خدائی
در آن مجلس کہ مظہر عین خدا باشد آنجا علین شبین خدا باشد آنجا بارد رحمۃ اللہ
آنجا ساقی رسول اللہ آنجا ہمہ اللہ باشد نہ غیر اللہ"

شیخ باجن اس سرود کو ریختہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ میں انہی کی تصنیف سے ایک اور مثال دیتا ہوں:۔

"باجن یہ رو روپ نہ ہوئے جو کوئی بھانے بھلے نے آپ کو جیوں سب کوئی جانے
آں خروبست کہ من صف جمالش دانم این حدیث از دگراں پرس کہ من حیرانم
باش ناجاں برود در سر آں یار لطیف کہ بکار سے بہ ازیں کار نیاید جانم"

شیخ جمالی عہد ہمایوں و شیر شاہ کے شاعر ہیں ان کے نام پر یہ ریختہ مشہور ہے، بعض تذکروں اور بیاضوں میں امیر خسرو کی طرف منسوب ہے ؎

...... ہر دو نیز الکتا ہے مونیا شد بر در نوستا ہے
خوار شدم زار شدم لٹ گیا در رہ عشق تو کمر تتا ہے
گر چہ بدم گفت رقیب کٹن اس کا کہا مت کرو یہ جھتا ہے
گاہ نگفتہ کہ جمالی تو بیٹھ نہم کر دکیا اپنا کرم بہتا ہے

شیخ سعدی دور اکبری کے ایک بزرگ ہیں جن کو غلطی سے عوام شیخ سعدی شیرازی مانتے ہیں۔ ان کا ریختہ اکثر تذکرہ نویسوں نے نقل کیا ہے میں صرف مقطع پر قناعت کرتا ہوں ؎

سعدی کہ گفتہ ریختہ در ریختہ در ریختہ شیر و شکر آمیختہ ہم ریختہ ہم گیت ہے

گویا اس عہد تک ریختہ کے معنے گیت کے لئے جاتے تھے۔ ہندی موسیقی کی سرپرستی چونکہ اکثر سلاطین و مشائخ نے کی ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ متعدد فارسی اصطلاحات اس میں داخل ہوگئی ہیں چنانچہ ریختہ بھی ہندی موسیقی میں موجود ہے۔ ہندی زبان میں ہم ریختہ کی سرگزشت سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں تاہم اس قدر یقیناً کہا جاسکتا ہے کہ ریختہ وضع ہونے سے عنقریب بعد ہی ہندی موسیقی میں پہنچ گیا ہے حتیٰ کہ بعض ریختہ شاہ کبیر یا کبیر داس کی طرف منسوب ہیں۔ ہندی لغات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندی شعرا نے بحر مضارع مثمن اخرب مفعول فاعلاتن، مفعول فاعلاتن کا نام ریختہ رکھ دیا ہے جس کی مثال ذیل میں عرض ہے:-

"سن لے بشودا رانی، تو لال کی بڑائی — سب لوگ لاج وانے، بُنیا میں دہو بھائی
بھوریں ہی میں گئی جو، جل بھرنے کاج بہنیا — پیچھے سوں آرا چانک، اُن مونڈے میرے نینا
ڈرپی میں ہائے کہہ ہے، تب بولے بیڈ ہے بنیا — ہوں تو رہی اکیلی، وا سنگ گوال سینا
تب سب نے ہا ہو کر کے، ناری مری بچائی — ہنس ہنس کے چھیل موسوں، کہہ وے لگو ٹھٹھولی
یہ چھپ تہارے کہہ کی، اب کا سوں جائے تولی — نرکھے کبھی بدن کو، کبھوں وہ چھوئے چولی
میں تو سنکچ کی ماری، واسوں کچھو نہ بولی — پُن بہیاں میری شکی، گگری دھری گرائی
انگیا کے بند توڑے، چندری شنڈ اک پھاری — ڈلری کے نرکھو بکوں، گل بہیاں بیر ڈاری
یہ سب کچال دیکھیں، انگ ٹھاڈے برسکھ ناری — تاہوں پہ نام میرو، ابکر سنا دے گاری
گرجن میں میری دانے، با دِدہ کری ہنسائی — کبھوں کہے پیاری، تو کیوں اکیلی آئی
کے گھر ہیں تیرے پت کی، توسوں بھئی لرائی — تو جل بھوں ہمارے، کر موسوں مترتائی
یدہنانے موری نوری، جو رہی بھلی بنائی
ناران وا کی باتیں، سن کے ہیں ات لجائی" (ریختہ بہار ص ۲۴۶)

بعض وقت مصرع کے آخری رکن فاعلاتن میں سبب خفیف گرا کر فاعلن لے آتے

ہیں۔ راس رتناولی میں ایسی متعدد مثالیں میری نظر سے گذری ہیں۔ قدیم زمانہ میں ریختہ صرف بحر مضارع ہی میں محدود نہ تھا بلکہ اور بحروں میں بھی لکھا جاتا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد ریختہ نے موسیقی سے نکل کر عمومیت حاصل کرلی اور اس کا اطلاق ایسے کلام منظوم پر ہونے لگا جس میں دو زبانوں کا اتحاد ہو۔ چنانچہ شیخ باجن۔ شیخ جمالی اور شیخ سعدی کے ہاں ریختہ کا یہی مفہوم ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ریختہ ایسی نظم ہوتی تھی جس میں ہندی فارسی کے اشعار یا فقرے متحد ہوتے تھے۔ یہاں ایک مثال بارھویں قرن ہجری کے ریختہ کی دی جاتی ہے۔ جو خواجہ حافظ کی مشہور غزل کی تضمین ہے۔ ریختہ ؎

ریختہ کا دوسرا مفہوم

"سوکھ چین کے منڈل موں ایسے بیاکر و بیکار را — دل می رود ز دستم صاحبدلاں خدا را
اکھیاں نے جھڑ لگایا رسوا کرینگی آخر — دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا
اے مرگ ٹک امن دے، دل کی مرادیوں ہے — باشد کہ باز بینیم، آں یار آشنا را
دو دن کی زندگانی، مت کر جفا کسی پر — نیکی بجائے یاراں، فرصت شمار یارا
تن من کیا ہے لوہو، لوہو کیا ہے پانی — دلبر کہ در کف او، موم است سنگ خارا
اکثر گناہ کرکے، اب ہو رہے ہیں تائب — اے شیخ پاک دامن، معذور دار ما را
اندر سرائے گلشن، بلبل پکارتی ہے — ہات الصبوح ہبوا، یا ایہا السکارا
محتاج یک نظر کا دربار پر کھڑا ہوں — روزے تفقدے کن، درویش بے نوا را
دنیا کا فکر مت کر، کہتا میں خواجہ حافظ — کیں کیمیائے ہستی، قاروں کند گدا را"

ریختہ کی قسمیں

میر تقی میر نے اپنے تذکرے میں ریختہ کی چار قسمیں کی ہیں :-

(۱) یہ ہے کہ ایک مصرع ہندی ہو اور ایک مصرع فارسی، جیسی کہ تضمین بالا

(۲) یہ ہے کہ نصف مصرع ہندی ہو اور نصف فارسی۔

(۳) یہ ہے کہ اس میں فارسی کا عنصر حرف و فعل کی صورت میں ہو۔

(۴) وہ ہے جس میں صرف فارسی کی ترکیبیں پائی جائیں ۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقسیم میر صاحب کی اپنی اپج ہے اور عام طور پر رائج نہیں تھی، ریختہ کی غزلوں میں یہ تقسیمیں مخلوط شکل میں عام طور پر ملتی ہیں۔

گیارھویں صدی میں ریختہ کا اطلاق بالعموم اُردو نظم پر ہونے لگا چنانچہ ذیل کی غزل بھی ریختہ ہے :۔

"جاناں رحم فرماؤناں، یا مجھ بلا یا آؤناں — ایتا بھی کیا ترساؤناں، یا مجھ بُلا یا آؤناں
تیرے فراقوں دن رین، لہو سیں ہیں انجھو نین — کب لگ یہ مہ برساؤناں، یا مجھ بلا یا آؤناں
کیتا کہوں لے نازنیں، ہیک یک گھڑی گذرے نہیں — بیگی خبر کہلاؤناں، یا مجھ بلا یا آؤناں
پیارے شتابی کر دوا، خونِ غریباں نہیں روا — مجھ جیو کوں بچاؤناں، یا مجھ بلا یا آؤناں
ہے دل منیں یہ آرزو، یک روز اپنے روبرو — لے جان من بتلاؤناں، یا مجھ بلا یا آؤناں
یہ حسن ہے دن چار کا، جوں پھول ہے گلزار کا — آخر کو ہے کملاؤناں، یا مجھ بلا یا آؤناں
ساجن کروں کیتا گلہ، اب وصل کا شربت پلا — توں جگر بہوں تپاؤناں، یا مجھ بلا یا آؤناں
ایتا نہ ہو بیباک توں، آخر ہے مشتِ خاک توں — کچھ حق سیتی شرماؤناں، یا مجھ بلا یا آؤناں
بہ دل جلے کا قول ہے، ہر یک سخن بے مول ہے — مطلب حقیقی پاؤناں، یا مجھ بلا یا آؤناں
کہتا ہوں اب جیو کا حرف، رحمت جو کرنی ہے تو کر — پیچھے عبث پچھتاؤناں، یا مجھ بلا یا آؤناں"

یاد رہے کہ اس عہد میں ریختہ نظم کے ساتھ مخصوص ہے اس کو نثر کے ساتھ یا زبان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ استاد ولی کے ہاں اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ ذیل میں بعض امثال حوالۂ قلم ہیں :۔

(۱) "ولی تجھ حسن کی تعریف میں جب ریختہ بولے — سُنے تو اُس کی حالت دل سوں حسّانِ عجم آ کر"
(۲) "اُمید مجکو یو ہے ولی کیا عجب اگر — اس ریختہ کوں سُن کے ہوں معنے نگار بند"
(۳) "یو ریختہ ولی کا جا کر اسے سُنا یو — رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کی مانند"

اورسراج اورنگ آبادی ؎

"اے سراج اس منتخب دیوان کے سب ریختے خامۂ مژگان خوباں سے ہیں لائق صاد کے"

میر تقی میر کے ہاں بھی بعض اوقات اسی مفہوم میں آیا ہے۔ امثال:-

(۱) پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں (ص۵۲)

(۲) سرسبز ہند ہی میں نہیں کچھ یہ ریختہ ہے دھوم میر شعر کی سارے دکن کے بیچ (ص۱۱۹)

(۳) کچھ ہند ہی میں میر نہیں لوگ جیب چاک ہے میرے ریختوں کا دوانا دکن تمام (ص۲۱۱)

(۴) دوانا ہو گیا تو میر آخر ریختہ کہہ کہہ نہ کہتا تھا میں اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں (ص۸۵)

(۵) ترک بچہ سے عشق کیا تھا ریختے کیا کیا میں نے کہے رفتہ رفتہ ہندوستاں سے شعر مرا ایران گیا (ص۱۲۸)

اشعار بالا میں ریختہ کے معنے شعر و سخن (ہندی) یا کلام منظوم کے لئے گئے ہیں۔ ریختہ کہنا مرادف ہے سخن گفتن کا۔ جب دہلی میں ولی کے اثرات میں اُردو شاعری کا رواج ہوا تو ریختہ دکن سے یہی معنے ساتھ لایا ہے۔

اگرچہ شمال میں اُردو گو شعرا گیارھویں صدی ہجری میں موجود تھے مثلاً محمد افضل جھنجھانوی متوفی ۱۰۳۵ھ اور جعفر زٹلی لیکن قدمائے اُردو نے ریختہ گوئی کا سہرا دکنا ہی کے سر باندھ دیا ہے۔ اکثر نے ولی کے تتبع میں شعر گوئی کی ہے۔ چنانچہ شاہ حاتم اپنے لئے کہتے ہیں۔

"در شعر فارسی پیرو میرزا صائب است و در ریختہ ولی را استاد می داند"

میر تقی میر کہتے ہیں ؎

"خوگر نہیں ہم یوں ہی کچھ ریختہ کہنے سے معشوق جو اپنا تھا باشندہ دکن کا تھا" (ص۱۹۴)

قایم کا بیان ہے ؎

"قایم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی"

میر حسن کا قول ہے: "باید دانست کہ ریختہ اوّل از زبان دکن رواج یافتہ"

کلیات سودا کے دیباچہ میں اُن کے ایک شاگرد کا بیان ہے :-

"بعد از انقضاے دورۂ فارسی گویان نوبت پادشاہی ملک سخنوری ریختۂ ہندی بولی دکنی و تاجی و آبرو وغیرہ رسید"

شاہ گلشن نے جو مشورہ ولی کو دیا ہے قدرت نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :-

"شما زبان دکنی را گذاشتہ ریختہ را موافق اردوے معلّٰی شاہجہان آباد موزوں بکنید"۔

ریختہ سے مراد اگرچہ ولی اور سراج کے ہاں نظم اردو ہے لیکن دہلویوں نے بالآخر اس کو زبان اُردو کے معنے دیدیئے اور یہ معنے قدرتاً پیدا ہوگئے اس لئے کہ ان ایام میں اردو زبان کا تمام تر سرمایہ نظم ہی میں تھا۔ جب نثر پیدا ہوگئی تو یہی اصطلاح اُس پر باطلاق آگئی۔ اس طرح ریختہ قدرتاً اردو زبان کا نام ہوگیا۔

زبان دہلوی اردو کا قدیم نام

اُردو کے نام ریختہ کے علاوہ اور بھی ہیں۔ مثلاً شیخ باجن متوفی سنہ ۹۱۲ھ اس کو زبان دہلوی کے نام سے یاد کرتے ہیں وہ کہتے ہیں "صفت دنیا بزبان دہلوی گفتہ" اس سُرخی کے ذیل میں اُنہوں نے اشعار ذیل لکھے ہیں۔ جو اردو اشعار کا قدیم ترین نمونہ مانے جا سکتے ہیں ؎

دُوہرہ ، یہ فتنی کیا کسے یہ ملتی ہے جب ملتی ہے تب چھلتی ہے (بین اول)

اول آن چل بہت چھلاے آن چوہری بہتی کماے آن روکر بہت رُلاے

یہ فتنی کیا کسے یہ ملتی ہے جب ملتی ہے تب چھلتی ہے (بین دوم)

آن بہت کہبرے پارے جا س بلکے وے ان چھاپے جے رہے اس تہے تارے

دے نجانے اس تہے پارے جے اس کا رن تپنہ ترسنہ جے چکہ ملے تو اس ستہ بلسنہ

یہ فتنی انہوں تپاوے چکہ پاس انہوں آوے جے اُس کد ہیں نہ لوریں

جے چکہ ملے تو بہی اس چھوڑنہ جے دیکہہ اس تہے بہاگے باجن ان ستہ لاگے (تخلص)

دیکھ باجن یہ تو جھوتی منہ میتھی چت نیتی یہ اہے ایسی دبیتی

یہ فاتی کیا کسے یہ ملتی ہے جب ملتی ہے تب چلتی ہے

یہ اشعار میں نے ایک ایسے نسخے سے لئے ہیں جو سخت غلط ہے ۔ اور بارھویں صدی کے خاتمہ کے قریب لکھا گیا ہو گا ۔ باجن پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو کو زبان دہلوی کے نام سے یاد کیا ہے ۔

ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ جب اہالی دکن نے اُردو کا نام دکنی رکھا ، اہالی گجرات نے اس کا نام گجراتی یا گوجری رکھ دیا ۔ لطف یہ ہے کہ خود ان ممالک کے باشندے اس کو ان ناموں سے پکارتے رہے ۔ شیخ محمد خوب نے مثنوی خوب ترنگ ۹۸۶ھ میں لکھی ہے ۔ اس تصنیف کی زبان گجراتی کے مقابلہ میں زیادہ تر اُردو کے ذیل میں داخل ہے ۔ لیکن شیخ اس کو گجراتی بولی کہتے ہیں ۔ شعر

جیوں دل عرب عجم کی بات سُن بولی ، بولی گجرات

اسی طرح شاہ علی محمد جیو گام دہنی کی "جواہر اسرار اللہ" کو اس کا مرتب شیخ حبیب اللہ قریشی الاحمدی گوجری کہتا ہے ۔ چنانچہ دیباچہ میں لکھتا ہے :۔

"در بیان توحید و اسرار بالفاظ گوجری بطریق نظم فرمودہ ۔ دریں مختصر آوردہ و جمع کردہ"

محمد امین نے اپنی مثنوی یوسف زلیخا بعہد عالمگیر ۱۱۰۹ سنہ ہجری میں نظم کی ہے ۔ باوجودیکہ وہ صاف دکنی اُردو میں لکھ رہا ہے مگر وہ اس کو گوجری زبان کے نام سے یاد کرتا ہے ۔ چنانچہ ؎

سنو مطلب اہے اب یو امیں کا لکھی گوجری منے یوسف زلیخا

ہر یک جاگے ہے قصہ فارسی میں امیں اس کوں اُتاری گوجری میں

کہ بوجھے ہر کدام اُس کی حقیقت بڑی ہے گوجری جگ بیچ نعمت

اہالی دکن دکنی کہتے رہے اُس کی متعدد امثال بہم پہنچائی جا سکتی ہیں۔ لیکن میں صرف ایک مثال پر قناعت کرتا ہوں مثلاً شاہ ملک بیجاپوری رسالۂ احکام الصلوٰۃ تالیف ۱۰۷۰ھ کے خاتمہ میں کہتے ہیں ؎

"یو مسلیاں کوں دکھنی کیا اس سبب فہم کر کے دل میں کریں یاد سب"

پُرانے مغربی مصنفین کبھی اس کو لینگوئج آف اندوستان یا ہندوستان اور بعد میں ہندوستانی کہنے لگے۔ ہمارے ہاں عام خیال یہ ہے کہ انگریزوں نے یہ نام دیا ہے، لیکن امر واقع یہ ہے کہ خود ہمارے اسلاف اس کو زبان ہندوستان یا بولی ہندوستان کہتے رہے ہیں۔ مولنا وجہی کتاب سبرس میں جو بقول مولوی عبدالحق صاحب ۱۰۴۵ھ کے عنقریب بعد تصنیف ہوئی ہے۔ اُردو کو "زبان ہندوستان" کہتے ہیں :۔

زبانِ ہندوستان

" آغاز داستان ۔ زبان ہندوستان ۔ نقل ۔ ایک شہر تھا ۔ اس کا ناؤں سیستان" (رسالہ اردو اورنگ آباد صفحہ ۲۵ حصہ شانزدہم)

اردو کا سب سے قدیم نام ہندی یا ہندوی ہے۔ اس کی ایک پرانی مثال وہ ہے جو حضرت شاہ میراں جیؒ شمس العشاق متوفی ۹۰۲ھ کے رسالہ خوش نغز میں ملتی ہے، میراں جی فرماتے ہیں :۔

ہندی و ہندوی

ہیں عربی بول کیرے	اور فارسی بہوتیرے	یہ ہندی بولوں سب
اس ارتوں کے سبب	یہ بھاکا بھلسو بولی	پن اس کا بھاوت کھولی
یوں گر مکھ پند پایا	تو ایسے بول چلایا	جے کوئی اچھیں خاصے
اس بیان کیرے پیاسے	وے عربی بول نجانے	نا فارسی پہچانے
یہ ان کو بچن ہیت	سنت وجہیں رہیت	یو دیکھت ہندی بول
پرمعنے ہیں نپٹ نول	✦ (رسالہ اردو صفحہ ۱۸۵ حصہ بست و ششم)	

اُردو کا آغاز

سب سے پیشتر میں وہ آرا نقل کر دیتا ہوں جو ہمارے مصنفین نے ار
کے آغاز اور قدامت کے متعلق دی ہیں۔ میرامن کا بیان ہے ٭

"جب اکبر شاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی
اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سُن کر حضور میں آکر جمع ہوئیں۔ لیکن ہر ایک
کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف
سوال جواب کرتے ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی۔" (باغ و بہار ص۳)

سرسید کہتے ہیں:-

جبکہ شہاب الدین شاہجہان بادشاہ ہوا۔ اور اس نے انتظام سلطنت کا کیا۔ اور سب
ملکوں کے وکلا کے حاضر رہنے کا حکم دیا۔ اور دلی کو نئے سرے سے آباد کیا۔ اور
قلعہ بنایا۔ اور شاہجہان آباد اس کا نام رکھا اس وقت شہر میں تمام ملکوں کے لوگوں
کا مجمع ہوا۔ ہر ایک کی گفتار رفتار جدا تھی۔ ہر ایک کا رنگ ڈھنگ نرالا تھا۔ جب
آپس میں معاملہ کرتے ناچار ایک لفظ اپنی زبان کا دو لفظ اس کی زبان کے تین
لفظ دوسرے کی زبان کے ملا کر بولتے۔ اور سودا سلف لیتے۔ رفتہ رفتہ اس
زبان نے ایسی ترکیب پائی کہ یہ خود بخود ایک نئی زبان ہو گئی ٭

ظہیر الانشا کے مصنف کا قول ہے ٭

"ہرگاہ سریر سلطنت از جہانگیر متجاوز شدہ نوبت شاہجہان بادشاہ رسید۔ اینجا کہ
بسبب مصاحبت و معاشرت علمائے دین فی الجملہ خودداری و تشرع غالب
بود۔ ایں زبان ریختہ معجون مرکب بسبب آمد و رفت تاجران ہر دیار در بازار

بضرورت خرید و فروخت و معاملات داد و ستد ضروری الاستعمال شد تا زبان یکے بفہم دیگرے درآید" (منقول از جلوۂ خضر)

امام بخش صہبائی رسالۂ قواعد اردو میں فرماتے ہیں :۔

شاہجہان آباد تیموریہ خاندان کے شاہجہان نے آباد کیا۔ اس وقت فارسی کے بعض الفاظ اور ہندی کے اکثر لفظوں میں کثرت استعمال کے سبب تبدل تغیر واقع ہوا۔ اور اس خلا ملا سے جو بولی مروّج ہوئی۔ اس کا نام اردو ٹھہرا" (ماخوذ از خزینۃ العلوم)

شمس العلما محمد حسین آزاد کی رائے ہے :۔

"مسلمان بھی اب یہیں کی زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے تھے۔ اور اس زبان کو کس شوق اور محبت سے بولتے تھے۔ شاید بہ نسبت ہندؤں کے فارسی عربی لفظ ان کی زبان پر زیادہ آجاتے ہونگے۔ اور جتنا یہاں رہنا سہنا اور استقلال زیادہ ہوتا گیا۔ اتنا ہی روز بروز فارسی ترکی نے ضعف۔ اور یہاں کی زبان نے زور پکڑا ہوگا۔ رفتہ رفتہ شاہجہان کے زمانہ میں کہ اقبال تیموریہ کا آفتاب عین اوج پر تھا۔ شہر اور شہر پناہ تعمیر ہو کر نئی دلی دارالخلافہ ہوئی۔ بادشاہ اور ارکان دولت زیادہ تر وہاں رہنے لگے۔ اہل سیف۔ اہل قلم۔ اہل حرفہ اور تجار وغیرہ ملک ملک اور شہر شہر کے آدمی ایک جگہ جمع ہوئے۔ ترکی میں اردو بازار لشکر کو کہتے ہیں۔ اردوئے شاہی اور دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولتے تھے۔ وہاں کی بولی کا نام اردو ہوگیا" (آبحیات ص۲ ۱۸۸۷ء)

یہ بیانات جو ہمارے تذکرہ نگار ایک دوسرے سے نقل کرتے آئے ہیں۔ حقیقت سے بہت دور ہیں۔ ہمیں ان کو صرف بزرگوں کے تبرک کے طور پر تسلیم کرنا چاہیئے۔ ورنہ کیا اکبر اور شاہجہان سے پیشتر دلی نہ تھی یا ہندو اور مسلمان

نہ تھے۔ یا لوگ سود اسلف نہیں لیتے تھے۔ یا مختلف قومیں ایک چارہ سہکر کا روبار کرنا نہیں جانتی تھیں۔ پھر اکبر یا شاہجہان کے عہد کے ساتھ کیا خصوصیت ہے کہ اردو کی بنیاد رکھی جائے۔ شاہجہان نئی دلی کا قلعہ ۱۰۵۷ھ میں طیار کرتا ہے۔ محمد افضل پانی پتی متوفی ۱۰۳۵ھ شاہجہان آباد کے آباد ہونے سے بہت پہلے اپنا دوازدہ ماہہ یا بارہ ماسہ اردو میں تصنیف کرتا ہے۔ دکن میں اردو ادبیات کا سلسلہ اکبر بادشاہ کی تخت نشینی سے پچاس سال قبل شروع ہو جاتا ہے۔ اور یہ بزرگ ہیں کہ شاہجہان آباد کے سنگ بنیاد کے ساتھ ساتھ اردو کی بنیاد ڈال رہے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ بابر اپنے ترکی دیوان میں ایک شعر ایسا لکھ جاتا ہے۔ جس کا ڈیڑھ مصرعہ اردو ہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

مج کا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی
فقرا ھلیغہ بس بولغو سیدور پانی و روٹی
(گل رعنا)

اصل یہ ہے کہ اردو کی داغ بیل اسی دن سے پڑنی شروع ہو گئی ہے جس دن سے مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر توطن اختیار کر لیا ہے۔ ہمارے مصنفین کا ایک اور مزعومہ خیال یہ ہے کہ اردو برج بھاشہ سے نکلی ہے۔ کوئی اسے برج کی بیٹی بناتا ہے۔ اور کوئی اس کے دودھ سے اس کی پرورش کرتا ہے۔ میں تمثیلاً بعض کے بیانات یہاں حوالۂ قلم کرتا ہوں +

اردو برج سے نکلی

آزاد فرماتے ہیں :۔

اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشہ سے نکلی ہے۔ اور برج بھاشہ خاص ہندوستانی زبان ہے۔ لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردہ پر ہندوستان کے ساتھ ہی آئی ہو۔ اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے۔ اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے +

حکیم سیّد شمسُ اللہ صاحب قادری رسالۂ تاج اردو سے قدیم میں یوں گویا ہیں:۔

مسلمانوں کے اثر سے برج بھاشہ میں عربی فارسی الفاظ داخل ہونے لگے۔
جس کے باعث اس میں تغیر شروع ہوا۔ جو روز بروز بڑھتا گیا۔ اور ایک عرصہ
کے بعد اُردو زبان کی صُورت اختیار کر لی ✦

اس موقعہ پر ہمارے مورّخ یہ امر فراموش کر جاتے ہیں کہ مسلمانوں کے
تعلقات ہندوستان اور اہل ہند کے ساتھ پرتھی راج کی شکست اور فتح دہلی
کے زمانہ سے شروع نہیں ہوتے۔ بلکہ ان واقعات سے کئی صدی پیشتر سے
ابتدا پاتے ہیں۔ وہ عربوں کی فتح سندھ وملتان اور غزنوی خاندان کی فتح پنجاب کو
مطلق فراموش کر جاتے ہیں۔ سندھ وملتان پر مسلمان پہلی صدی سے قابض تھے
پنجاب پر ان کا قبضہ معزالدین محمد سام کی آمد سے ایک سو ستر سال پہلے سے تھا
سندھ وپنجاب میں ہندو مسلم اقوام سب سے پہلے ملتی جلتی ہیں۔ اس لئے انہیں
اگر ایک عام زبان کی ضرورت ہوئی تو ان ممالک میں پیش آئی ہو گی۔ اور اُردو کو
ان ممالک میں وجود میں آنا چاہیئے ✦

عربوں نے جب ایران فتح کیا۔ تو سیاسی اور سرکاری اغراض کے لئے
ایران کی مختلف زبانوں سے ایک زبان کو چن لیا۔ یہ زبان مشرقی ایران میں بولی
جاتی تھی۔ اگرچہ ہم غلطی سے اس کو خطۂ فارس کی طرف منسوب کیا کرتے ہیں۔
اسی طرح جب مسلمان سندھ وپنجاب پر قابض ہو گئے۔ تو یہاں بھی یہی ضرورت
محسوس ہوئی ہو گی۔ اگر سندھ میں نہیں تو پنجاب میں یقیناً انہیں کوئی نہ کوئی زبان
اختیار کرنی پڑی ہے ✦

جب ہم اُردو کے ڈول اُس کی ساخت اور وضع قطع کو دیکھتے ہیں۔ تو
صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ڈھنگ اور ہے۔ اور برج بھاشہ کا رنگ اور ہے

دونوں کے قواعد و ضوابط و اصول مختلف ہیں۔ اردو و برج بھاشہ کے مقابلہ میں پنجابی بالخصوص ملتانی سے مماثلت قریبہ رکھتی ہے۔ برج سے چند ترمیمیں قبول کر لینا یا الفاظ کا مستعار لینا دوسری بات ہے۔ لیکن جہاں برج سے اُس نے الفاظ مستعار لیے ہیں۔ وہاں برج پر بھی اپنا اثر ڈالا ہے۔ اور برج پر کیا موقوف ہے۔ ہندوستان کی دوسری زبانیں بھی اردو کے پرتو سے خالی نہیں +

ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اگرچہ اردو زبان بین الاقوامی ضروریات کی بنا پر وجود میں آئی لیکن بہت جلد بعد وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی عام زبان بن گئی۔ اس نے ستلج پار ہو کر مسلمانوں کا دامن پکڑ لیا۔ مسلمان سپاہی۔ اہل بہیر دعملہ دستکار و پیشہ ور۔ مزدور و فقیر۔ درویش و مسافر کا ساتھ دیا۔ دکن۔ گجرات بنگال و بہار۔ جہاں کہیں وہ گئے یہ ان کے ساتھ رہی اور ساتھ ہی بسی۔ ابتدا میں وہ عوام و غیر تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان تھی۔ آخر میں اس کی ہر دلعزیزی دیکھ کر تعلیم یافتہ طبقہ نے بھی اس کی طرف توجہ کی +

پیشتر اس کے کہ ہم اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً مسلمانی عہد کے تاریخی واقعات پر بالخصوص جو دہلی اور پنجاب کے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہیں، ایک نظر ڈال لیں +

دہلی اور پنجاب کے تعلقات

پہلی صدی ہجری کے اواخر میں محمدؐ بن قاسم کی فتوحات سندھ اور ملتان کو اسلامی قلمرو میں شامل کر دیتی ہیں۔ اور اسلامی تہذیب و تمدن ان ممالک میں شائع ہو جاتے ہیں۔ لیکن تیسری صدی سے صفاریوں کی فتوحات کی بنا پر ایرانی اثرات بھی پھیل جاتے ہیں۔ اس عہد کے سیاحوں کا بیان ہے کہ یہاں کے باشندے ہندو اور مسلمان عراقی لباس پہنتے تھے۔ ہندو بھی شلوار کا استعمال کرتے تھے اور ڈاڑھیاں رکھتے تھے۔ چوتھی صدی کے سیاح اصطخری کے بیان سے

عرب سیاحوں کا بیان

معلوم ہوتا ہے کہ ملتان اور منصورہ کے باشندے فارسی اور سندھی دونوں زبانیں بولتے تھے۔ موجودہ بلوچستان کے ایک حصہ کا نام ایرانیوں نے توران رکھ دیا تھا۔ اُس کے حاکم نشین شہر کا نام قصدار یا قزدار تھا۔ یہی شہر فارسی کی مشہور شاعرہ رابعہ بنت کعب القصداری کا جس نے استاد رودکی متوفی ۳۲۹ھ سے مشاعرات کئے ہیں، وطن تھا۔ ایرانیوں نے درۂ قرم کے پاس ایک شہر کا نام کرمان اور گندھارا کا نام قندھار رکھ دیا تھا۔ ملتان کے ریگستان کو دشت قبچاق۔ دریائے سندھ کو جیحوں۔ مہران اور سندرود۔ اور دریائے چناب کو چندرود یا چمدرود کہتے تھے۔ مسعودی منصورہ کے قریب ایک شہر کا نام دوشاب بتاتا ہے جو ظاہر ہے کہ فارسی الاصل ہے۔ بلکہ انہوں نے اپنے وطن کے پانچ دریاؤں کی یاد میں پانچ دریاؤں کے درمیانی علاقہ کا نام بھی پنجاب رکھ دیا تھا۔

فارسی پر ہندی اثر

اس کے برخلاف خود فارسی زبان میں ہمیں ایسے الفاظ ملتے ہیں جو اسی عہد میں فارسی پر ہندی اثرات کی گواہی دیتے ہیں مثلاً لفظ بت جو بودہ کی بگڑی شکل ہے۔ یا کوتوال جو ٹھیٹ ہندی یعنی کوٹ والا بمعنی مالک قلعہ تھا۔ یہ لفظ شاہنامۂ فردوسی میں بھی موجود ہے چنانچہ

چو آگاہ شد کوتوالِ حصار　　　برآویخت بارستم نامدار

صاحب شرف نامہ کہتے ہیں:۔

"از شیخ واحدی محقق است کہ لفظ ہندی است کہ بخراساں وفارس مشہور شدہ"

ہیلاج کی بابت بھی صاحب شرف نامہ کی یہی رائے ہے وہ کہتے ہیں:۔

"ایں لفظ ہندی است کہ مستعمل درفارسی شدہ است"

اور لفظ بیلک کی تشریح میں کہتے ہیں:۔

تیر شکاری دو شاخہ این لغت ہندی است کہ مستعمل در پارسی شدہ"
لکھن یعنی لنگھن در روزۂ ہندواں (منوچہری کے ہاں ملتا ہے شل یعنی سیل ہندی ہے۔ اور فرخی کے ہاں ملتا ہے ؎

بگونۂ شل افغانیاں دو پرہ و تیز
چو دستہ دستہ بہم تیرہائے بے سوفار

چندن فرخی اور منوچہری کے ہاں آتا ہے۔ جسے آج کل ہم صندل کہتے ہیں
برشکال (ورس کال) یعنی برسات کا موسم۔ ہندی لفظ ہے۔ مسعود سعد سلمان کے ہاں موجود ہے ؎

برشکال اے بہار ہندوستاں	اے نجات از بلائے تابستاں

ان چند امور سے جو میں نے اوپر درج کئے ہیں۔ واضح ہوتا ہے کہ ہندی اور ایرانی تمدن کا سنگم سندھ و ملتان میں غزنوی عہد سے پیشتر ہو چکا تھا۔

غزنوی عہد

غزنوی دور میں سلطان محمود غزنوی ۳۸۸ھ و ۴۲۱ھ نے ۴۱۳ھ میں لاہور پر قبضہ کر کے پنجاب کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ اس شہر کو جس کا جدید نام محمود پور رکھا گیا۔ اپنے والی کا صدر مقام بنا دیا۔ جس کے ماتحت فوج کی بڑی تعداد رہتی تھی۔ مفتوحہ علاقہ مختلف ضلعوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ مثلاً جالندھر جہلم۔ ملتان۔ سندھ وغیرہ۔ سپاہ میں زیادہ تر ترک۔ افغان۔ خلج اور ہندی تھے فوج کی تعداد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ابوالنجم زیر شیبانی کے پاس جو سلطان ابراہیم غزنوی ۴۵۱ھ و ۴۹۲ھ کے عہد کا سپہ سالار ہند تھا۔ چالیس ہزار فوج تھی۔ اس کے ماتحتوں کی فوجیں اس کے علاوہ ہیں۔ الغرض مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد محمود کے وقت ہی سے پنجاب میں آباد ہو گئی تھی۔ غزنوی سلطنت اگرچہ ایران و خراسان میں سلجوقیوں کے بڑھتے عروج کے سامنے

اپنے مقبوضات یکے بعد دیگرے کھو رہی تھی۔ لیکن ہندوستان میں اُن کی طاقت ترقی پر تھی۔ ہانسی سلطان مسعود شہید نے فتح کی۔ غزنوی عہد کے والیان ہند کے حالات اور کارناموں پر اگرچہ پردہ پڑا ہوا ہے۔ لیکن ابوالفرج رونی کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالنجم زر برشیبانی کے کارناموں نے سلطان محمود کے دَور کا احیا کر دیا تھا۔ وہ ایک طرف بانرسی (بنارس) دوسری طرف سومنات پر چھاپہ مارتا ہے۔ تانیسر (تھانیسر) والوں کو مغلوب اور قنوج کو زیر کر چکا ہے۔ میرٹ پر اس کا قبضہ ہے اور چونکہ اسکی والی دہلی نے میرٹ کو تباہ کر دیا ہے۔ وہ اتفاقاً دہلی پر حملہ کی تیاریاں کر رہا ہے۔ یکایک سلطان ابراہیم غزنوی کی ہندوستان میں آمد نے اُس کے ارادہ کو معرض التوا میں ڈال دیا ہے۔ زریر جس کی تقصیرات کا ہمیں کوئی علم نہیں باغی اور غدار قرار دیا جاتا ہے۔ اور ایک جنگ کے بعد گرفتار ہو کر قتل کر دیا جاتا ہے۔ ابوالنجم کا جانشین شاہزادہ سیف الدولہ محمود آگرہ فتح کرتا ہے۔ سلطان مسعود ثالث ۴۹۲ھ و ۵۰۸ھ کے زمانہ میں ہنسی غزنویوں کے مقبوضات میں داخل ہو جاتا ہے۔ ان امور سے ظاہر ہے کہ آلِ غزنہ کے مقبوضات ہندوستان میں برابر وسیع ہوتے رہے۔

لاہور مسلمانوں کا مرکز

مسلمانوں کی یہ کثیر تعداد جو تجارت۔ فوجی و سرکاری خدمت کی غرض سے پنجاب میں ان ایام میں آباد تھی۔ پنجاب ہی کو اپنا وطن تصوّر کرنے لگی تھی۔ لاہور اس عہد کے مسلم ہندوستان کا مرکز بن گیا تھا۔ پنجاب ان کی نگاہ میں ایک فتح کردہ ملک نہیں تھا بلکہ وہ اُس پر وطن کی حیثیت سے نظر ڈالنے لگے تھے۔ خواجہ سعد سلمان شہزادۂ مجدود کے خزانچی بن کر بعہد سلطان مسعود شہید ہندوستان آئے۔ اُن کے فرزند خواجہ مسعود شاعر مشہور ہیں۔ یہ لاہور میں پیدا ہوئے۔ یہیں نشو و نما اور تعلیم و تربیت پائی۔ وہ اپنے حبسیات میں لاہور کو مادر وطن کے نام

سے پکارتے ہیں۔ چنانچہ ؎

اے لاہور ویحک بے من چگونۂ | بے آفتاب تاباں روشن چگونۂ
تا ایں عزیز فرزند از تو جدا شدہ است | با درد او بنوحہ و شیون چگونۂ
تو مرغزار بودی و من شیر مرغزار | با من چگونہ بودی بے من چگونۂ

دوسرے مقام پر کہتے ہیں ؎

رسید عید و من از روے حور دلبر دور | چگونہ باشم بے بیر دی آں بہشتی حور
چو یاد شہر لہا وور و یار خویش کنم | مباد کس کہ شد از یار و شہر خویش نفور

ایک اور جگہ جب کہ حبس سے رہائی کی امید منقطع ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں ؎

کار اطلاق من چو بستہ بماند | کہ ہمیں ایزدش بنگشاید
مر مرا حاجتے ہمی باشد | وز دلم خار رشتے ہمی زاید
مخلے باید از خداوندم | کہ از و بوے لوہور آید
کہ ہمی ز آرزوے لوہاور | جان و دل در تنم ہمی نابد

لاہور کے سب سے پہلے شاعر ابو عبد اللہ روزبہ بن عبد اللہ النکتی اللہوری ہیں۔ جو مسعود شہید کے مداح ہیں۔ مسعود رازی سلطان محمود اور سلطان مسعود شہید کے عہد کا شاعر ہے۔ ذوالحجہ ۴۳۰ھ کے جشن مہرگان کے موقعہ پر اس نے سلطان مسعود کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا۔ جس میں سلجوقیوں کے بڑھتے اقتدار کی روک تھام کے لئے سلطان کو نصیحت کی تھی۔ یہ نصیحت[1] سلطان پر

مسعود رازی

---

[1] مسعود رازی کے اشعار یہ ہیں ؎

مخالفان تو موراں بدند مار شدند | برآر زود ز موران مار گشتہ دمار
مدہ زمان شاں زیں بیش و روزگار مبر | کہ اژدہا شود ار روزگار یابد مار

(بیہقی ص ۶۴۴)

گراں گذری۔ شاعر سے ناراض ہوا۔ اور سزا دہی کے لئے اسے ہندوستان بھجوا دیا
۱۸ جمادی الآخر ۴۳۱ھ کو جشن نوروز مناتے وقت شاعر کے دوستوں نے
اس کی شفاعت کی۔ سلطان نے شاعر کا قصور معاف کر دیا۔ اُس کے قصیدہ پر
تین سو دینار صلہ دیے۔ اور ہزار دینار مشاہرہ بھی معاملات جلیلہ پر مقرر کر دیا۔ لیکن
حکم دیا کہ ہندوستان ہی میں رہے[1]۔ استاد ابوالفرج رونی اسی شاعر کا فرزند ہے۔
رونی منسوب ہے۔ رونہ کی طرف جو لاہور کا ایک موضع بیان کیا جاتا ہے۔ معلوم
ہوتا ہے کہ ابوالفرج نے اپنی تمام عمر لاہور ہی میں گذاری۔ ضرورتاً ایک آدھ
مرتبہ اس نے غزنین کا سفر کیا۔ حتیٰ کہ جو قصائد اُس نے سلطان ابراہیم اور
اُس کے فرزند سلطان مسعود ثالث کی مدح میں لکھے ہیں۔ ایسے موقع پر لکھے ہیں
جب یہ سلاطین ہندوستان آئے ہیں۔

ابوالفرج رونی

علما میں سب سے مقدم شیخ اسمٰعیل لاہوری متوفی ۴۴۸ھ ہیں۔ جو جامع
علوم ظاہری و باطنی تھے۔ آپ سادات بخارا سے ہیں۔ اور لاہور کے پہلے واعظ
۳۹۵ھ میں بخارا سے لاہور تشریف لائے۔ اور یہیں آباد ہو گئے آپ کی مجالس
وعظ میں مخلوق کثرت سے جمع ہوتی تھی۔ ہندو ہزاروں کی تعداد میں آپ کے
وعظ سُن سُن کر حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے پہلے جمعہ میں
ڈھائی سو۔ دوسرے میں پانچ سو پچاس۔ اور تیسرے میں ایک ہزار ہندو مشرف
بہ اسلام کیے۔

شیخ اسمٰعیل

---

[1] مسعود جس کا تخلص مسعودی ہے۔ ہندوستان میں بزمانہ امارت سیف الدولہ محمود ۴۷۰ھ
کے قریب وفات پاتا ہے۔ ابوالفرج اس کا فرزند ایک قصیدہ میں سیف الدولہ محمود سے اپنے
باپ کی تنخواہ پر تقرری کا ملتمس ہے ؎

کز وجوہے کہ داشت مسعودی کند آنرا الملک بدان تعیین

مشائخ کے سلسلہ میں ابی الحسن بن ابو عثمان الجلابی صاحب کشف المحجوب ہیں۔ جو ۴۶۵ھ میں انتقال فرماتے ہیں۔ اور لاہور ہی میں مدفون ہیں۔ فی زمانہ داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہیں۔ شاہ یوسف ایک بلند پایہ بزرگ ہیں اور ۵۵۵ھ میں وفات پاتے ہیں۔ ان کے علاوہ شیخ فخر الدین حسین زنجانی، سید احمد توختہ ترمذی لاہوری، سید یعقوب صدر دیوان زنجانی لاہوری کو ہم فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ یہ بزرگ قرن ششم ہجری سے تعلق رکھتے ہیں۔ خاندان غزنہ کے دو بادشاہ خسرو شاہ متوفی ۵۵۵ھ اور خسرو ملک متوفی ۵۸۳ھ لاہور ہی کو اپنا دارالسلطنت بنا لیتے ہیں۔

باوجودیکہ اس عہد کی تاریخ مفقود ہے۔ ان چند ناموں سے جو اوپر ہیں یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لاہور ان ایام میں ایک بارونق اسلامی اور مرجع علم و فضل و ادب بن گیا تھا۔

آل غزنہ کی حکومت ہندوستان میں کم و بیش ایک سو ستر سال تک رہی اس عرصہ میں مسلمان اور ہندو اقوام کی یکجائی سے ایک نئی زبان کا پیدا ہونا لازمی بات ہے۔ سرکاری ضروریات کی بنا پر بھی شاہی عہدہ داروں اور ملازمین کو اس ملک کی زبان سے واقف ہونا ضروری تھا۔ آخر غزنویوں کے قبضہ میں پنجاب، سندھ اور ملتان تھا۔ ہانسی، سرستی اور میرٹھ تک اُن کے قبضہ میں تھے بلکہ یوں کہیے۔ دہلی کے قریب تک پھیلے ہوئے تھے۔ اتنے بڑے علاقہ کے مالی و ملکی انتظام کے لئے عمّال کو اس ملک کی زبان سیکھنی ضروری تھی۔ چونکہ لاہور ہند کا دارالسلطنت تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس خطہ کی زبان کو اس کی حکومت اور مسلمانوں نے ترجیح دی ہوگی۔ یہ خیال کرنا کہ جب تک مسلمان میں آباد رہے۔ انہوں نے کسی ہندی زبان سے سروکار نہ رکھا۔ اور جب

دہلی گئے۔ تب برج بھاشا اختیار کی۔ ایک نا قابل قبول خیال ہے جو عقل و درایت کے منافی ہے۔ اس لئے کہ ان کو نہ صرف سرکاری ضروریات کی بنا پر ایسی زبان کی ضرورت تھی۔ بلکہ خود مسلمانوں کی اقوام کو بھی ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات کیلئے اس کی ضرورت تھی۔ تعلیم یافتہ گروہ کیلئے یہ مشکل فارسی نے حل کر دی تھی۔ لیکن ان کا غیر تعلیم یافتہ طبقہ جو ان کی آبادی کا جزو اعظم تھا۔ فارسی سے قطعاً نابلد تھا۔ یہ مسلمان چونکہ تازہ ولایت تھے۔ انہوں نے اس کا نام ہندی رکھ دیا۔ خود غزنویوں نے شروع ہی سے ہندی زبان کی طرف توجہ دی تھی

ابوریحان البیرونی

ان میں ابوریحان محمد بن احمد البیرونی قابل ذکر ہے۔ جو ابتدا میں ابوالعباس ماموں خوارزمشاہ کے دربار سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن ماموں کے قتل کے بعد ۴۰۸ھ میں سلطان محمود کے ہمراہ غزنیں میں چلا آیا۔ البیرونی محمود کی غزوات میں شریک رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک عرصہ تک اس کا قیام لاہور اور ملتان میں رہا ہے۔ اس نے ہندی اور سنسکرت زبان سیکھی۔ اور ہندوؤں کے مذاہب اور علوم مثلاً ہیئت نجوم و ریاضی جغرافیہ و طبعیات پر کما حقہ عبور حاصل کیا۔ عربی سے سنسکرت میں اور سنسکرت سے عربی میں متعدد کتابیں ترجمہ کیں۔ عربی میں جو ترجمہ کیں۔ ان کے نام شنکیا اور پتنجلی ہیں۔ لیکن البیرونی کی سب سے ضروری کتاب تاریخ الہند ہے۔ جو اہل ہند کے اس عہد کے علوم کی قاموس ہے۔

غزنین میں ہندی ترجمان

محمود کے زمانہ میں ہندی زبان کے ترجمانوں کی ایک جماعت غزنین میں مقیم تھی۔ اُن میں تلک ہندی اور بہرام کے نام ہم تک پہنچے ہیں۔ تلک دراصل ایک حجام تھا۔ ہندی اور فارسی زبانوں سے بخوبی ماہر تھا۔ کشمیر میں تربیت پائی تھی۔ خط ہندی و فارسی نہایت اعلےٰ لکھتا تھا۔ ترجمانی سے ترقی کر کے ہندو افواج کے سپہ سالار (غزنین میں ہندوؤں کی فوج بھی رہا کرتی تھی) سُندر

کی وفات پر سلطان مسعود شہید نے اسے سپہ سالار بنا دیا۔ تلک نے بالآخر اس قدر عروج پایا کہ سلطان نے نیال تگین سپہ سالار ہند کی سرکوبی کے لیے جو باغی ہو گیا تھا تلک ہی کو مقرر کیا۔ اور تلک نے ہندوستان آ کر اور کئی شکستیں دے کر نیال تگین کو قتل کر دیا۔

کوئی تعجب نہیں اگر خود سلطان محمود ہندی زبان سے کسی قدر آشنا ہو کیونکہ جب ۴۱۳ھ کی مہم میں سلطان کالنجر پہنچتا ہے۔ نندا کالنجر کا راجہ سلطان کی مدح میں ہندی شعر لکھ کر بھیجتا ہے۔ سلطان فضلائے ہند و عرب کو یہ اشعار دکھاتا ہے اور سب ان اشعار کی توصیف میں رطب اللسان ہوتے ہیں۔ سلطان ان اشعار سے اس قدر خوش ہوتا ہے کہ صلہ میں نندا کو پندرہ قلعوں کی حکومت کا پٹہ لکھ دیتا ہے۔ جن میں کالنجر بھی شامل تھا۔

بد قسمتی سے اس عہد کی تاریخ پر ایسا پردہ پڑا ہوا ہے کہ ہم ان ایام کے سیاسی حالات سے بھی بخوبی واقف نہیں۔ چہ جائیکہ معاشی۔ اقتصادی اور ادبی پہلو کے حالات ملیں۔ لیکن ہمیں یقین رکھنا چاہئے کہ پنجاب کے میدانوں میں مسلمان حملہ آور بہت جلد سیاسی منافرت کے باوجود ہندوؤں کے ساتھ مل جل کر رہنے بسنے اور اُن کے ساتھ اختلاط و ارتباط قائم کرنے لگے ہیں۔

حکیم سنائی متوفی ۵۴۷ھ کے متعلق ہم اسی قدر جانتے ہیں کہ وہ صوفی شاعر ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان بھی آئے ہیں۔ اور کسی قدر ہندی زبان سے بھی واقف ہیں۔ ایک شعر میں پانی کے لفظ کو اس طرح

[illegible]

عثمان مختاری غزنوی

عثمان مختاری غزنوی بھی ہندوستان آئے ہیں۔ انہوں نے والی سندھ اور محمود رو ہاہی والی ہند کی مدح میں قصائد لکھے ہیں۔ ایک موقعہ پر بازار سے ایک غلام خریدتے ہیں۔ اس کے ذکر میں ایک شعر میں دو ہندی لفظ باندھ گئے ہیں۔ اس قصیدہ کا مطلع ہے ؎

یکے غلامکے ہندی خریدم از بازار بداں بہا کہ زگفتار آنم آید عار

اور وہ شعر یہ ہے ؎

زمن بہ بیلے بادے بجستہ گفتے چوں مگس بدیلے بر من نشستہ گفتے مار

اس شعر میں چوں اور مار دونوں ہندی لفظ ہیں۔

خواجہ مسعود سعد سلمان

لیکن یہ خواجہ مسعود سعد سلمان ہیں۔ جن کے متعلق متقدمین و متاخرین متفقاً کہتے ہیں کہ وہ ہندی میں بھی صاحب دیوان تھے۔ مجھ کو ان کی ہندی شعر گوئی کے متعلق شبہ تھا۔ کیونکہ جہاں وہ اپنی فارسی و عربی زبان دانی پر اپنے قصائد میں فخر کرتے ہیں۔ وہاں ہندی کا ذکر نہیں کرتے مثلاً ؎

مرا بداں تو کہ در پارسی و در تازی بنظم و نثر ندارد چو من کس استقلال

دوسرے موقعہ پر گویا ہیں ؎

کس ار بپارسی و تازی امتحان دمے مرا بہ رزمیدان امتحاں شدے

تیسرے موقعہ پر کہا ہے ؎

بریں ہنر دو زبان و رہبر دو میدان بگردونم رسیدہ کامرانی

سجود آرد بہ پیش خاطر من رواں رودکی و ام ہانی

لیکن جہاں محمد عوفی کہتا ہے :-

"داورا سہ دیوان ست یکے بتازی و یکے بپارسی و یکے بہندوی (لباب

عوفی کے ساتھ امیر خسرو بھی فرماتے ہیں :۔

"پیش ازیں از شاہان سخن کسے راسہ دیوان نبود مگر مرا کہ خسرو ممالک کلامم مسعود سعد سلمان را اگرچہ ہست اما آں سہ دیوان در عبارت عربی و فارسی ہندی است۔ در پارسی مجرد کسے سخن را سہ قسم نکردہ جز من کہ دریں کار قسام و عادلم۔

(دیباچہ غرۃ الکمال صـ۶۶ــ)

اِس لئے ہمیں تسلیم کرنا چاہیئے کہ خواجہ ہندی میں بھی اشعار کہتے تھے۔ مگر بد قسمتی سے ان کا ہندی کلام دستبرد زمانہ کے ہاتھوں شاید ہمیشہ کیلئے برباد ہو گیا۔ خواجہ سعد سلمان برابر ساٹھ سال تک ہندوستان میں رہے۔ خواجہ مسعود یہیں پیدا ہوئے اور یہیں رہے ۔۔۔ مسعود ثالث کے عہد میں منقطع جالندھر تھے۔ قصدار میں بھی رہے ہیں۔ لاہور ان کا وطن ہے۔ اور جس محبت کے ساتھ وہ اس وطن کا ذکر کرتے ہیں۔ ان اشعار سے ظاہر ہے جو اس سے پیشتر نقل ہو چکے ہیں۔ اس لئے اگر انھوں نے اپنے وطن کی زبان میں اشعار لکھے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ خواجہ کے دیوان فارسی میں بعض باتیں ایسی موجود ہیں۔ جن کو ہندوستان کا پرتو مانا جا سکتا ہے:۔

(۱) فارسی زبان میں بارہ ماسہ کی صنف کی نظموں کا رواج نہیں ہے۔ اور نہ سنسکرت میں ایسی نظمیں موجود ہیں۔ اِدھر اُردو، پنجابی، اور ہندی میں اب سے بیس سال قبل تک بارہ ماسوں کا بکثرت رواج تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ خواجہ نے دوازدہ ماہہ لکھنے میں جسے غزلیات شہوریہ کے نام سے یاد کرتے ہیں پنجابی کی تقلید کی ہے۔ یا بارہ ماسے خود انہی کی ایجاد ہیں۔ ہندی میں سب سے قدیم بارہ ماسہ وہ ہے۔ جو کبیر کی طرف منسوب ہے۔ ہندی کے بارہ ماسوں میں ایک ہجران دیدہ عورت کی کہانی بالعموم دی جاتی ہے۔ جو خود اپنے فراق کی داستان الم

حسرت ناک الفاظ میں سناتی ہے۔ خواجہ مسعود کے ہاں دوازدہ ماہہ صرف مدحیہ ہے۔ اور مہینہ کی خوشگواری کا ذکر کرکے شراب کی دعوت دی جاتی ہے۔ اِس شہریہ میں ان کا ممدوح شاہ ارسلان بن مسعود متوفی ۵۱۲ھ ہے۔ اور ہر مہینہ کی غزل کی بحر مختلف ہے۔

(۲) دوازدہ ماہہ کے ساتھ غزلیات ایامیہ اور غزلیات اسبوعیہ کا ذکر بھی مناسب ہے۔ غزلیات ایامیہ میں ہر غزل فارسی ماہ کے دنوں کے نام پر لکھی گئی ہے اور بدستور ارسلان بن مسعود کی مدح میں ہے۔ غزلیات اسبوعیہ ہفتہ کے دنوں کے نام پر ہیں۔ اور حسبِ معمول ارسلان کی مدح میں ہیں۔

(۳) انہوں نے قطعات شہر آشوب بھی لکھے ہیں۔ جن میں پیشہ وروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ امیر خسرو نے بھی شہر آشوب لکھا ہے۔ سنا جاتا ہے کہ سنسکرت میں بھی اس قسم کی نظمیں ہوتی ہیں۔

اس قسم کی نظمیں فارسی ادبیات میں موجود نہیں ہیں۔ اور خواجہ مسعود اِن امور میں تمام شعرائے ایران سے منفرد ہیں۔ کیا اس کو ہندوستان کا اثر تسلیم کیا جائے یا خواجہ کی ایجاد مانا جائے۔ خواجہ نے ایک شعر میں ایک ہندی محاورہ بھی استعمال کیا ہے ؎

چو رعد ز ابر بغرید کوس محمودی — بر آمد از پس دیوار حصن مارا مار

سلطان معز الدین محمد بن سام ۵۸۲ھ میں لاہور فتح کرتا ہے۔ اور آل ناصر کا آخری تاجدار خسرو ملک قید ہوکر سلطان غیاث الدین کے پاس غور پہنچا دیا جاتا ہے۔ فاتح دہلی کی سمت بغرض تسخیر نگاہ ڈالتا ہے۔ ترائن کی جنگ میں رائے پتھورا کی شکست کے بعد مسلمانوں کا قبضہ اجمیر پر ہو جاتا ہے۔ قطب الدین ایبک ۵۸۹ھ میں دہلی اور میرٹھ پر قابض ہو جاتا ہے۔ دہلی کے قبضہ کے بعد پایۂ تخت لاہور و کہرام سے تبدیل ہوکر دہلی آجاتا ہے جس طرح ہماری یادداشت میں انگریزی حکومت نے اپنا دار السّلطنت

کلکتہ سے دہلی تبدیل کر لیا۔ یہی صورت اس وقت بھی پیش آئی۔ لیکن اس تبدیلی اور
اُس تبدیلی میں بے حد فرق ہے۔ آج صرف اسی قدر ہوا ہے کہ وائسرائے ہند
کلکتہ کے بجائے دہلی رہنے لگے۔ اور نئی عمارات ان کے دفتروں کے لئے بنا
دی گئیں۔ لیکن ان ایام میں اس تبدیلی کا مطلب یہ تھا کہ لاکھوں انسان پنجاب
سے ہجرت کرکے دہلی اور اس کے نواح میں آباد ہو گئے۔ تمام فوج اور اہل دیوان
معہ ان کے متعلقین اور قبائل کے ہجرت کرکے چلے آئے ہمیں اس عہد کی معاشرت
کا یہ پہلو یاد رکھنا چاہئے کہ انسان مختلف قبائل میں منقسم تھے۔ حکومت کا تعلق
براہ راست قبیلہ سے نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ قبیلہ کے رئیس کے ساتھ۔ رئیس قبیلہ کی
حرمت و وقعت قبیلہ کے ارکان کی تعداد اور وجاہت پر منحصر ہوتی تھی۔ ایک قبیلہ جس
قدر طاقتور ہے اُس کے مطابق اس کے سردار کی عزت ہے۔ حکومت اپنی فوجیں انہی
قبیلوں سے بھرتی کرتی تھی۔ اور قبیلہ کا سردار ہی اکثر ان کا افسر ہوا کرتا تھا۔
سلطنت غزنین کی فوجوں میں زیادہ عنصر ترکوں۔ خلجیوں۔ افغانوں اور ہندوؤں کا
تھا۔ ملتان کی وادیوں میں جیپال کی شکست کے بعد خلج اور افغان قومیں جو
افغانستان کے پہاڑوں میں آباد تھیں۔ ناصر الدین سبکتگین کی مطیع ہوئیں۔ اور کثیر
تعداد میں اس کی فوج میں بھرتی ہو گئیں۔ خلج ان ایام میں افغانوں سے زیادہ
طاقتور تھے اور افغانوں کی ہمسائیگی میں آباد تھے۔ ان کی اصل ترک سے غلاموں
کے عہد میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم ساری کی ساری ہندوستان کی طرف ہجرت
کر آتی ہے اور مختلف مقامات میں آباد ہو جاتی ہے۔ پرانے زمانے میں خلجی پور نام کے
بیسیوں قصبے اور موضعے نظر آتے ہیں۔ قیاس میں آتا ہے کہ اسی قوم کے آباد
کردہ ہوں گے۔ یہی لوگ بہار و بنگال فتح کرتے ہیں۔ جہاں ایک علیحدہ سلطنت کی
بنیاد ڈالتے ہیں۔ بنگالہ میں ان کی سلطنت اگرچہ دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ لیکن

سیاسی لحاظ سے وہ اس قدر طاقتور تھے کہ غلاموں کے بعد تخت ہندوستان کے یہی وارث بنتے ہیں۔ اور مالوہ میں علیحدہ سلطنت قائم کرتے ہیں۔ اس کے بعد اُن کے اصلی وطن افغانستان میں خلجیوں کا نام نہیں سُنا جاتا۔ خلجی کس زمانہ میں اسلام لائے تاریخ اس بارہ میں خاموش ہے +

افغان ہندوستان کے مغربی پہاڑوں میں دریائے سندھ تک آباد تھے البیرونی ایک مقام پر ان کو افغا نو ن کے نام سے یاد کرتا ہے۔ دوسرے مقام پر ہندو لکھتا ہے۔ ابوالفرج رُونی افغانوں اور جاٹوں کو مشرک کہہ رہا ہے۔ اِس سے ظاہر ہے افغان ان ایام میں تابع اسلام نہیں تھے۔ سیاسی اعتبار سے افغان ہر زمانہ میں اہمیّت رکھتے تھے۔ سلطان محمود نے دو مرتبہ ان کی گوشمالی کی ہے۔ مسعود شہید نے اُن کے خلاف فوج بھیجی ہے۔ مسعود ثالث نے بھی ان کو سزا دی ہے۔ لیکن ہندوستان میں اگرچہ فوجوں میں ہمیشہ بھرتی ہوتے تھے تغلقوں کے عہد میں قوت حاصل کرتے ہیں۔ اگرچہ خلجیوں کی طرح افغان بڑی تعداد میں ہندوستان کی طرف ہجرت نہیں کرتے تاہم ایک معتدبہ تعداد ان کی ہر زمانہ میں یہاں موجود رہتی ہے دہلی سے چار کوس کے فاصلہ پر افغان پور ایک قصبہ تھا۔ جو غلاموں کے زمانہ میں آباد ہُوا تھا۔ اور اس میں افغان ہی آباد تھے +

خطۂ پنجاب کے باشندے اپنے قد وقامت اور طبعی جرأت کی بنا پر فوجی خدمات کے لئے بہت موزوں اور مناسب ہیں۔ اس لئے سلطان محمُود نے جو فوج ہندوؤں سے انتخاب کی وہ تمام پنجابی تھی۔ اس کے جانشین بھی پنجابی فوجیں رکھتے تھے جب دہلی کی طرف مہاجرت ہوئی ہے۔ تو ایک بڑی تعداد ان پنجابیوں کی بھی تھی۔ انہی ایام میں ملتانی لوگ بھی جوق جوق جاکر دہلی میں آباد ہو گئے ہیں۔ ان میں سے بعض تجارت کرتے ہیں۔ ممالک غیر سے براہ راست اُن کے تعلقات تھے تاریخ

میں سب سے پہلے ان ملتانیوں کا ذکر غیاث الدین بلبن کے عہد میں ملتا ہے وہ ساہوکارہ کا کام بھی کرتے تھے۔ امرا اور ڈو ساکو روپیہ قرض دیا کرتے تھے۔ اور اپنی دولتمندی کے لئے ضرب المثل تھے۔ علاء الدین خلجی کے عہد میں وہ سلطنت کے معاملات میں بھی دخیل ہیں۔ بعض ان میں سے بڑے بڑے عہدوں کے مالک ہیں مثلاً الپ خاں امیر ملتانی۔ ملک عین الملک ملتانی اور خواجہ حبیب الدین ملک التجار ملتانی جو بعد میں قاضی شہر دہلی بنا دیئے گئے! ور ملک فضل اللہ ملتانی۔ بعض مشاہیر علما اسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے جن کے فضل و شہرت کی بنا پر تاریخ میں اُن کے نام مذکور ہیں مثلاً مولانا محب ملتانی قدیم اور مولانا شہاب الدین ملتانی۔ سرائے عدل علاء الدین کے کپڑے کی منڈی تمامتر ملتانی تاجروں کے قبضہ میں تھی۔ سلطنت نے بیس لاکھ روپیہ کپڑے کا نرخ ارزاں کرنے کے لئے بابت مساعدت ان کو عطا کیا تھا۔

جب معز الدین اور اُس کے والی قطب الدین ایبک نے چند سال کے عرصہ میں اجمیر۔ ہانسی۔ سرستی۔ کہرام۔ میرٹھ۔ دہلی۔ بدایوں۔ قنوج۔ بنارس۔ نہروالہ تھنکیر گوالیر۔ کالنجر۔ اودہ اور مالوہ فتح کر لئے تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس نئے علاقہ کے انتظام کے لئے ان کو کس قدر آدمی درکار ہوئے ہونگے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اُن میں سے ہر شہر میں ان کو اپنی چھاونی رکھنی پڑی ہوگی۔ چاروں طرف طاقتور ہندو راجہ موجود تھے جن کو قدرتاً مسلمانوں سے عداوت تھی۔ اس لئے ہمیں ماننا پڑیگا کہ ان ایام میں شمال سے لوگ بڑی تعداد میں ہجرت کر کے ہندوستان کی طرف چلے گئے ہیں۔ اور ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ لاہور چونکہ پُرانا دارالسلطنت تھا۔ اس لئے ضروری ہوا کہ یہاں کے لوگ تبدیل دارالسلطنت کے وقت بتقریب ملازمت و تجارت و دیگر خدمات زیادہ تعداد میں جائیں۔

قطب الدین ایبک کے ساتھ جو لوگ ہجرت کرکے دہلی آگئے ہیں۔ اگرچہ یوں تو اُن میں مختلف اقوام شامل تھیں مثلاً ترک (جو بڑے عہدوں پر ممتاز تھے) خراسانی (جو منصب دیوانی پر سرافراز تھے) خلج۔ افغان۔ اور پنجابی۔ لیکن ان میں زیادہ تعداد مؤخر الذکر کی تھی۔ جو فوجی اور دیوانی خدمات کے علاوہ زندگی کے اور پیشوں اور شعبوں پر بھی متصرف تھے۔ اس سے قبل اشارہ کیا جاچکا ہے کہ سندھ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلاط سے اگر کوئی نئی زبان نہیں بنی تھی۔ تو غزنوی دَور میں جو ایک سو ستر سال پر حاوی ہے ایسی مخلوط یا بین الاقوامی زبان ظہور پذیر ہو سکتی ہے اور چونکہ پنجاب میں بنی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ یا تو موجودہ پنجابی کے مماثل ہو یا اس کی قریبی رشتہ دار ہو۔ بہرحال قطب الدین کے فوجی اور دیگر متوسلین پنجاب سے کوئی ایسی زبان اپنے ہمراہ لے کر روانہ ہوتے ہیں۔ جس میں خود مسلمان قومیں ایک دوسرے سے تکلم کرسکیں۔ اور ساتھ ہی ہندو اقوام بھی اس کو سمجھ سکیں۔ اور جس کو قیام پنجاب کے زمانہ میں وہ بولتے رہے ہیں ؛

دہلی میں آباد ہونے کے بہت جلد بعد ان نو آبادکاروں میں ہندی زبان اہل کمال پیدا ہونے لگتے ہیں۔ تاج الدین سنگ ریزہ جو التمش (۶۳۳ھ) اور اس کے اسباط کا مداح ہے دہلی کا پہلا نمونہ رس ہے۔ جو ہمیں معلوم ہے وہ اپنے کمال اور ہندوستانی اُئی کے متعلق ایک شعر میں گویا ہے ؎

مولد و منشا ہمیں در خاک ہندوستاں مرا نظم و نثرم بیں کہ با آب خراساں آمد است

ایک شعر میں دو ہندی لفظ سیر اور من باندھ گیا ہے۔ وہو ہذا ؎

خیز از مئے ندیم مرا سیر کن بر طل یگذرا زیں حدیث کہ یک سیر و یک من است

غلاموں اور اُن کے جانشین خلجیوں کے دور میں پنجاب کو اس عہد کی سیاسی وجوہ کی بنا پر زبردست اہمیت مل گئی تھی۔ یعنی چنگیزی مغلوں کے حملے بار بار ہند پر

ہوتے تھے۔ ان حملوں کی روک تھام کے لیئے سلاطین دہلی حکومت ملتان و دیپال پور کے لیئے اکثر تجربہ کار و بہادر سپہ سالار یا ولیعہد سلطنت کو نامزد کرتے تھے۔ جو ایک بڑی فوج کے ساتھ ہر وقت اُن کے مقابلہ کے لئے طیار رہتا تھا۔ چنانچہ شمس الدین التمش نے اپنے فرزند رکن الدین فیروز شاہ کو ریاست لاہور دی۔ ناصر الدین محمود نے شیر خاں کو جو ایک مشہور جنگ آزما تھا پنجاب کا حاکم بنایا۔ غیاث الدین بلبن نے اپنے ولیعہد سلطان محمد شہید کو ایالت ملتان ہو للاہور دی۔ چنانچہ مغلوں کے ہاتھ سے یہ شہزادہ جنگ میں مارا گیا۔ اس کا فرزند شہزادہ کیخسرو اس کا جانشین بنایا جاتا ہے۔ جلال الدین فیروز شاہ خلجی نے اپنے ولیعہد ارکلی خاں کو حاکم لاہور و ملتان و سندھ مقرر کیا تھا۔ علاءالدین کے عہد میں ملک ہزبر الدین ظفر خاں اور بعد میں غازی ملک تغلق والیئے پنجاب ہوئے۔ اوّل الذکر مغلوں کے ہاتھ سے ہی شہید ہوتا ہے۔ غازی ملک تغلق کو پنجاب کے ساتھ گہرے تعلقات ہیں۔ بقول ابن بطوطہ وہ اتراک قرونہ سے تھا۔ بقول فرشتہ اس کا باپ ملک تغلق غیاث الدین بلبن کا غلام تھا۔ اور پنجاب کے جاٹوں میں اُس نے شادی کی تھی جس سے غازی ملک تغلق پیدا ہؤا۔ اس طرح غازی ملک پنجابی ہے۔ ان ایام میں ہندو اپنی بیٹیاں مسلمانوں کو دے دیا کرتے تھے۔ اس خاندان نے اکثر شادیاں ہندوؤں میں کی ہیں۔ فیروز شاہ تغلق کی ماں بھی رانامل بھٹی والی ابوہر کی دختر تھی۔ غازی ملک کا تمام وقت پنجاب میں گذرا۔ اور قطب الدین مبارک شاہ کے آخر عہد تک والی دیپال پور رہا اس عرصہ میں مغل حملہ آوروں سے بیس مرتبہ اس نے جنگیں کیں۔ اور ہر جنگ میں ان کو ہزیمت دی۔ جب خسرو نمک حرام نے غداری کر کے خلجی خاندان کے تمام افراد کو قتل کر دیا اور خود تخت دہلی پر قابض ہو گیا۔ غازی ملک کی رگ حمیت حرکت میں آئی وہ ایک بڑی فوج کے ساتھ دہلی کی طرف بڑھا۔ اور خسرو نمکحرام سے اپنے آقاؤں کے خون کا بدلہ لے کر عام خواہش کے مطابق سنہ ۷۲۰ھ میں بادشاہ ہندوستان بن گیا۔ اور غیاث الدین

غازی ملک تغلق

تغلق کے نام سے تاریخ میں مشہور ہؤا۔ یہ اُس کے افعال شریفیہ کا انعام تھا۔ کہ غازی کو تخت ہندوستان مل گیا۔ لیکن ہمارے لئے سب سے زیادہ دلچسپی کا امر یہ ہے کہ غیاث الدین پنجابیوں کے لشکر کے ساتھ دہلی میں داخل ہوتا ہے جس نے وہاں آباد ہوکر دہلی کی زبان پر بے حد اثر ڈالا ہوگا۔ اور دہلی کے کوچہ و بازار میں ہر طرف پنجابی اور پنجابی بولنے والے نظر آتے ہونگے۔ جب نارمنوں کی فتح نے انگریزی زبان پر ایک نہ مٹنے والا اثر ڈالا اور ہمیشہ کے لئے اس کی رفتار کو بدل دیا تو ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دہلی پر ان پنجابیوں نے کس قدر اثر ڈالا ہوگا۔ جو دیپال پور سے اٹھ کر دہلی آباد ہونے کے لئے آ گئے تھے۔ اگرچہ دہلی کے مسلمان اس سے پیشتر بھی کوئی ایسی ہی زبان بول رہے تھے جو ان دیپال پوریوں کی زبان کے بہت قریب تھی۔

تغلقوں کے عہد میں دہلی میں جس قسم کی زبان بولی جاتی تھی۔ اگر ہم کو اُس کے نمونے دیکھنا ہیں۔ تو قدیم دکنی اردو کے ادبیات دیکھنے چاہئیں۔ جو اس زبان کے بہت قریب ہیں۔ دکنی زبان میں شعر و شاعری کا آغاز اواخر قرن نہم سے شروع ہوجاتا ہے۔ یا یوں کہنا چاہیئے کہ اس عہد تک کی بعض تصنیفات ہم کو مل جاتی ہیں۔ ان میں سب سے قدیم میرانجی شمس العشاق کی تصنیفات ہیں۔

خلجیوں نے دکن سب سے پہلے آباد کیا۔ اور اردو مسلمانی فتوحات کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ لیکن یہ غیاث الدین کا فرزند محمد تغلق ۷۵۲ھ ہے۔ جو دہلی کی زبان کو دولت آباد پہنچاتا ہے۔ محمد تغلق کو عالمگیر کی طرح دکن سے بے حد شغف تھا شہزادگی کے زمانہ میں بچشم خود دیکھ آیا تھا۔ ورنگل اس نے دوبارہ فتح کیا ہے۔ دولت آباد کے قدرتی استحکام نے اُس کے دل پر بے حد اثر ڈالا۔ یہ شہر اُس کے نزدیک دارالسلطنت ہند کے لئے زیادہ مناسب اور مرکزی تھا۔ وہاں سے دہلی۔ گجرات۔ لکھنوتی۔ سینگانو۔ ستارگانوں۔ تلنگانہ۔ معبر۔ دہورسمندر۔ اور کنپلہ وغیرہ ایک ہی مسافت پر آجاتے تھے۔

اِس لئے سنہ ۷۲۸ھ میں ایک صبح اس نے یہ اعلان کر دیا کہ رعایا سے دہلی معہ ان قصبات کے لوگوں کے جو دہلی سے چار چار کوس کے اندر واقع تھے۔ تمام و کمال امیر و غریب پیر و جوان مع زن و بچہ کنیز و غلام دولت آباد کی طرف کوچ کریں۔ شہر و نواحی کو یہ ہوشربا حکم ملا۔ اور حکم کے سنتے ہی اس کی تعمیل شروع ہوگئی۔ شاہی فرمان اس قدر سخت تھا کہ شہر و قصبہ کے انسان تو انسان۔ بلی کتے تک فراموش نہیں ہوئے تھے۔ اِن ایّام میں دہلی کے گرد و اطراف میں بے حد قریات و قصبات آباد تھے۔ لوگ اپنی زمینیں۔ جائداد اور آباد گھر چھوڑ کر تعمیل فرمان میں روانہ دکن ہوئے۔ سلطنت نے مسافروں کی سہولت کے لئے کسی قدر انتظام بھی کیا اور زاد راہ بھی محتاجوں اور بے استطاعتوں کو ملا لیکن دہلی کی آرام طلب اور خانہ دوست رعیت کو یہ سفر راس نہ آیا۔ اور بہت سے راستہ میں تلف ہوگئے۔ چند سال کے بعد سلطان نے فرمان عام جاری کر دیا کہ جس کا جی چاہے دہلی چلا جائے اور جس کا جی چاہے دولت آباد میں رہے۔ اس حکم پر بعض صاحب استطاعت واپس چلے گئے۔ لیکن ایک بڑا حصہ مرہٹواڑی میں ہی رہ پڑا۔ اور آباد ہوگیا اس طرح دہلی کی زبان دکن پہنچ گئی۔ محمد تغلق کے آخر زمانۂ سلطنت میں امیران صدہ نے دکن میں بغاوت کر دی۔ موت نے بادشاہ کو اتنی مہلت نہ دی کہ باغیوں کی سرکوبی کرتا۔ سنہ ۷۴۸ھ میں حسن گنگوہ علاء الدین شاہ کے نام سے بادشاہ دکن بنگیا۔ اور تقریبًا دوسو سال تک بہمنی خاندان دکن میں حکومت کرتا رہا۔ اور سنہ ۹۳۲ھ میں ختم ہوا۔ یہ پہلا افغان خاندان ہے جو ممالک ہند میں سریر آرا ہوتا ہے۔ بہمنیوں کی میراث پانچ سلطنتوں میں منقسم ہوجاتی ہے۔ (۱) عماد شاہی جسے سنہ ۹۸۰ھ میں نظام شاہی برباد کرتے ہیں۔ (۲) نظام شاہی جنہیں اکبر کی فوجیں سنہ ۱۰۰۴ھ میں فتح کر لیتی ہیں (۳) برید شاہی جو سنہ ۱۰۱۸ھ تک حکمرانی کرتا ہے (۴) عادل شاہی۔ ان کو سنہ ۱۰۹۷ھ میں عالمگیر فتح کر لیتا ہے۔ (۵) قطب شاہی سنہ ۱۰۹۹ھ میں عالمگیر ان کا علاقہ اپنی قلمرو میں شامل کر لیتا ہے۔ جو سلطنتیں اُن میں پائندہ اور ممتاز

قطب اور تین کے زمانہ میں اُردو ادبیات کو فروغ ہوتا ہے۔ قطب شاہی اور عادل شاہی ہیں۔ تین سو پچاس سال کے بعد ان علاقوں کا دہلی کے ساتھ الحاق ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں دہلی سے دکنیوں کا براہ راست کوئی تعلق نہیں رہا۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ دکنی اردو متعدد امور میں جو بعض صرف و نحو سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور بعض محاورہ سے مختلف ہو گئی۔ اسی امتیاز کے ظاہر کرنے کے لئے اہل علم نے ایک کا دکنی اور دوسری کا نام اُردوئے معلّٰی رکھ دیا۔ لیکن یہ فرق ان زبانوں میں کیوں آگیا۔ اس کا جواب یہی ہے کہ دکنی تغلقوں کے عہد کی زبان کی جو دہلی میں بولی جاتی تھی تقلید کر رہے ہیں۔ ادھر اُردو زبان دہلی میں آنے والے سیاسی واقعات اور ماحول سے برابر متاثر ہوتی رہی۔ اس لئے ایک یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ تغلقوں کے زمانہ سے پیشتر ہی اردو ایک علیحدہ اور مستقل زبان بن چکی تھی۔ اور اُس نے اپنی صرف و نحو کے قواعد علیحدہ مقرر کر لئے تھے۔ ممالک گجرات اور دکن دوسرے الفاظ میں بمبئی پریسیڈنسی (علاوہ سندھ) اور مدراس۔ پریسیڈنسی کے اہل اسلام میں جو زبان رائج ہے۔ وہ یہی دکنی ہے۔ اور دونوں پریسیڈنسیوں کی زبان میں بہت کم فرق ہے۔ اور جو فرق ہے اس قابل نہیں کہ بیان کیا جائے۔ اس کی وجہ بھی تاریخی ہے۔ خلجی گجرات کو دوبارہ فتح کرتے ہیں۔ لیکن محمد تغلق کے جانشین سلطان فیروز شاہ متوفی سنہ ۷۹۰ھ کے بعد گجرات نے دکن کی تقلید کر کے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اور تقریباً دو سو سال تک گجرات دہلی سے علیحدہ رہا۔ سنہ ۹۸۰ھ میں جلال الدین اکبر نے دوبارہ اس کو فتح کیا۔ جس قسم کی اُردو گجراتیوں نے تغلقوں سے سیکھی تھی وہ اسی پر قائم رہے۔ اس کے علاوہ دکن اور گجرات ہمسایہ ممالک ہیں۔ اور ان میں تعلقات بھی قائم تھے۔ قصہ مختصر یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر گجرات اور دکن میں ایک ہی زبان رائج ہے گجراتی اُردو میں بھی دسویں صدی سے تصنیفات شروع ہونے لگی تھیں ✦

سید خضر خاں

پنجاب ایک مرتبہ اور خضر خاں کی صورت میں دہلی پر حملہ کرتا ہے خضر خاں ملک

سلیمان کا فرزند ہے جس کو ملک مردان دولت نے اپنا پسر خوانده بنایا تھا۔ ملک مردان دولت ملتان کا حاکم تھا۔ اس کی وفات پر اس کا فرزند صلبی ملک شیخ جانشین ہوا جس کی وفات پر ملک سلیمان حاکم ملتان بن گیا۔ اس کے بعد اُس کا فرزند خضر خاں فیروز شاہ تغلق کے حکم سے حاکم ملتان بنا دیا گیا۔ جب سارنگ خاں نے اِس سے ملتان چھین لیا خضر خاں تیمور کے حملہ ۸۰۱ھ کے ایام میں امیر سے دہلی میں جا ملا۔ امیر نے اس کی خدمات پسند کر کے ملتان و پنجاب کی حکومت پھر اُس کے حوالہ کر دی۔ خضر خاں اپنے آخری حملہ میں جو ۸۱۶ھ میں کیا تھا۔ دہلی پر قابض ہو گیا۔ اس حملہ کے تفصیلی حالات معلوم نہیں۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ خضر خاں کے ساتھ اس وقت ساٹھ ہزار سوار تھے۔ ذوالحجہ سنہ مذکور میں حملہ ہوا اور ۱۵ ربیع الاوّل ۸۱۷ھ میں دولت خاں لودھی نے جو دہلی پر قابض تھا ہتھیار ڈال دئے۔ خضر خاں کی تمام فوج پنجاب سے تعلق رکھتی تھی جس طرح کہ وہ خود پنجابی تھا۔ اور جب وہ بادشاہ بن گیا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ دہلی کی زبان پر پنجاب کا اثر مجدداً ہو گیا ہو گا۔

لودھی پٹھان بسلسلۂ تجارت ہندوستان آتے رہتے تھے۔ ان میں ملک بہرام اپنے بھائی سے ناخوش ہو کر ملتان چلا آیا۔ اور بعہد فیروز شاہ تغلق ملک مردان دولت حاکم ملتان کے ہاں ملازم ہو گیا۔ اس کے پانچ فرزند ہوئے۔ ملک سلطان شاہ۔ ملک کالا ملک فیروز۔ ملک محمد اور ملک خواجہ۔ باپ کی وفات پر پانچوں بھائی ملتان ہی میں آباد رہے۔ جب خضر خاں حاکم ملتان بن گیا۔ ملک سلطان شاہ اس کے ہاں ملازم ہو گیا۔ اور کچھ عرصہ میں افغانوں کی ایک جماعت کی افسری حاصل کر لی۔ خضر خاں کی ملو اقبال خاں کے ساتھ جو جنگ ہوئی۔ اُس میں سلطان شاہ نے غیر معمولی بہادری دکھائی۔ وہ دشمن کی صفیں چیرتا ہوا ملو اقبال خاں تک پہنچ گیا۔ اور اس کا سر کاٹ لایا۔ اس خدمت کے صلہ میں خضر خاں نے اس کی قدر دانی کی۔ اور اسلام خاں کا خطاب دے کر

سرہند کی حکومت عنایت کر دی۔ اسلام خاں کے بھائی اس کے ہمراہ رہتے اور ملک کالا جو بہلول کے باپ کا نام ہے۔ پرگنہ دورالہ کا حاکم بن گیا۔ ملک کالا کی بیوی پورے دنوں سے تھی۔ عین اس وقت مکان کی چھت گری جس کے نیچے دب کر وہ فوت ہو گئی۔ اس شبہ میں کہ کہیں بچہ زندہ ہو مرحومہ کا پیٹ چاک کیا گیا۔ دیکھا تو بچہ زندہ وسلامت ہے۔ اس کا نام بہلول رکھا۔ ویسے ملّو کہا کرتے تھے۔ ملک کالا نیازی افغانوں کی جنگ میں مارا گیا۔ اور یتیم بہلول اس کے چچا اسلام خاں کے پاس پہنچا دیا گیا۔ سن رشد کے قریب بہلول نے ایک جنگ میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے اس پر اسلام خاں نے اپنی بیٹی اسے بیاہ دی۔ اب اسلام خاں اس قدر طاقتور ہو گیا تھا کہ بارہ ہزار افغان جن میں اکثر اس کے خویش اور ہم قوم تھے۔ اس کے لازم تھے۔ اپنی وفات پر اسلام خاں نے فرزندان نرینہ چھوڑنے کے باوجود ملک بہلول کو بڑے وصیت اپنا جانشین بنا دیا۔ اب اسلام خاں کی فوج کی تین ٹولیاں بن گئیں۔ ایک ٹولی بہلول کے تابع تھی۔ دوسری ملک فیروز برادر اسلام خاں کی اور تیسری قطب خاں خلف اسلام خاں کی لیکن بہلول اپنی حسن تدبیر سے رفتہ رفتہ دوسری جماعتوں کو توڑ کر طاقتور بن گیا۔ اور سلطنت دہلی کا کبھی باغی اور کبھی مطیع رہ کر ۸۵۵ھ میں بادشاہ دہلی بن گیا۔ اگرچہ اس کے لشکر میں زیادہ تعداد افغانوں کی تھی۔ لیکن یہ افغان ایسے تھے جو زیادہ تر پنجاب میں آباد تھے۔

ان چند مختصر بیانات سے جو میں نے اوپر عرض کئے ہیں۔ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ سیاسی نقطۂ نظر سے پنجاب کا اثر دہلی پر ہر عہد میں نمایاں رہا ہے۔

یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ سیاسی واقعات کا اثر زبان پر بہت گہرا ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ہم اردو اور پنجابی زبانوں کی صرف ونحو ان کے قواعد اور عام ہیئت کا مقابلہ کرتے ہیں تو یہ اثر قدم قدم پر محسوس ہوتا ہے۔ اور دونوں زبانو

کی مماثلت کا راز صریح طور پر آشکارا ہو جاتا ہے۔ آیندہ باب میں اسی مسئلہ پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

پنجاب

پنجاب اگرچہ مدھیا ندایش کا ہمسایہ ملک ہے لیکن رسم و رواج اور اوضاع و اطوار میں اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہندو اقتدار کے دَور میں میان داہیوں اور پنجابیوں میں چشمک ہی رہی اور مدھیا ندایش جو اپنے سنسکرت کے تمدن پر نازاں تھا، پنجاب کو ایک وحشی ملک تصور کرتا رہا ہے۔ مہا بھارت اور پنی کے بعض اشاروں سے مفہوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے لوگ کسی باقاعدہ نظام کے ماتحت نہ تھے نہ ان کا کوئی بادشاہ تھا وہ ہمیشہ جنگ و فساد میں مبتلا تھے۔ اُن کے ہاں برہمن نہیں تھے۔ تمام پنجاب چھوٹے چھوٹے رئیسوں میں منقسم تھا جو ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے۔ باشندے ویدوں کا احترام نہیں کرتے تھے۔ اور نہ دیوتاؤں پر قربانیاں چڑھاتے تھے وہ بالکل وحشی اور غیر مہذب تھے۔ شراب پیتے تھے۔ اور ہر قسم کا گوشت کھانے کے عادی تھے۔ ان کی عورتیں قد و قامت کی بڑی رنگ کی پیلی اور اخلاقاً گندی ہوتی تھیں کئی کئی شوہر رکھتی تھیں۔ ایک شخص کا وارث اس کا فرزند نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اس کی بہن کا لڑکا۔ یہ بیانات دشمنوں کی قلم سے ہیں۔ اور بہت ممکن ہے کہ ان میں صداقت کا عنصر بہت کم ہو۔

بہرکیف اسلام کی آمد پر پنجاب کی حالت میں ایک انقلاب رونما ہوتا ہے اور اہلِ پنجاب حلقہ بگوشِ اسلام ہو کر دینی و دنیاوی ترقی کرتے ہیں۔ ابھی مسلمانوں کو

دہلی میں آباد ہوئے ایک صدی بھی نہیں گذرنے پائی ہے کہ ہم دہلی کے دربار میں پنجاب کے بعض مشاہیر امرا و فضلا دیکھتے ہیں۔ اگرچہ اس عہد کی تاریخ کے فقدان نے ہمارے لیئے یہ امر ناممکن کر دیا ہے کہ کوئی مکمل بیان اس عہد کے مشاہیر پنجاب پر دیا جائے لیکن یہاں میں بعض ایسے اسما درج کرتا ہوں۔ جو خاک پنجاب سے ہیں۔ اور اتفاقیہ اس زمانہ کی تاریخ میں ان کے نام مل جاتے ہیں۔ ساتویں صدی میں اگرچہ پنجاب دارالسّلطنت ہند نہیں رہا تھا۔ تاہم دیکھتے ہیں کہ پنجاب کے شہروں میں مقتدر ہستیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ مثلاً ملک عین الدین علیشہ کوہ جودی۔ یہ بلبن اور کیقباد کے عہد میں امیر تھے۔ ملک تاج الدین کہرامی اور ملک نصیر الدین کہرامی اسی زمانہ کے امرا میں داخل ہیں۔ سامانہ سے سیّد عز یزاد رسیّد معین الدین بہت ممتاز اور زہد و اتقا و علو نسب میں شہرۂ آفاق تھے۔ قاضی رکن الدین بھی سامانہ کے باشندے ہیں۔ اور جیّد علما وقت میں شمار ہوتے ہیں۔ مولانا رکن الدین سنّامی اور مولانا ضیاء الدین سنّامی خلجیوں کے عہد کے علما سے ہیں۔ مؤخر الذکر محکمۂ احتساب کے افسر تھے۔ اور صوفیہ کے خلاف تھے۔ انھوں نے اپنی تصنیف یادگار چھوڑی ہے۔ مولانا علاء الدین لاہور کے باشندے اور اپنے زمانہ کے ممتاز علما میں محسوب تھے۔ قصور سے مولانا سراج الدین پیدا ہوتے ہیں۔ جو فضل و کمال سے متصف تھے۔ ملتان میں شیخ بہاء الدین زکریا اور اجودھن میں شیخ فرید الدین مشہور تر از آفتاب ہستیاں ہیں۔ ان کا خاندان علم و فضل تصوف و عرفان کے لیئے صدیوں مشہور رہا ہے۔ اگرچہ مغلوں کے حملوں نے پنجاب کو عرصہ تک دم نہیں لینے دیا۔ اور اس کی ترقی کی رفتار کو روک دیا۔ لیکن اسی نقصان سے پنجاب کو یہ فائدہ پہنچا کہ اس نے تین خاندان ہندوستان کو ایسے دیئے جنھوں نے تخت دہلی پر بیٹھ کر پورے دو سو برس تک ہندوستان پر حکومت کی۔ اس معاملہ میں ہندوستان کا کوئی صوبہ پنجاب کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

مشاہیر پنجاب

ملک پنجاب کی زبان آج کل پنجابی کے نام سے موسوم ہے۔ امیر خسرو اس کو لاہوری کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اور ابوالفضل ملتانی کہتا ہے۔ مغربی مورخین نے شمالاً وجنوباً ایک خط کھینچ کر مشرقی ومغربی پنجابی میں اسے تقسیم کر دیا ہے۔ مشرقی حصہ کی زبان کا نام پنجابی رکھا ہے۔ اور مغربی حصہ کی زبان کا نام لہندا۔ پنجابی کو وہ مغربی ہندی میں شامل کرتے ہیں۔ اور لہندا کو بیرونی دائرہ میں داخل کر کے سندھی اور کشمیری کا رشتہ دار مانتے ہیں۔ اہل پنجاب یہ فرق تسلیم نہیں کرتے ان کا بیان ہے کہ پنجابی اور لہندا ایک ہی چیز ہے۔ مغربی اور مشرقی زبان میں جو فرق ہے۔ وہ اصولی نہیں ہے بلکہ تدریجی اور ضلع ضلع کی مقامی خصوصیات کی بنا پر پیدا ہوتا چلا گیا ہے۔ اور یہ تقسیم ہر حال میں ناجائز ہے۔

پنجابی اور لہندا

پنجاب اگرچہ پانچ دریاؤں کا ملک ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ صوبہ کی زبان انہی دریاؤں کے مابین محصور ہے بلکہ وہ ان دریاؤں سے چھلک کر دونوں طرف پھیل گئی ہے۔ اِدھر دریائے گھگر تک آگئی ہے۔ اُدھر دریائے سندھ پار کر گئی ہے ایک اہم مغربی عقیدہ یہ ہے کہ پنجابی زبان کی ہمسایہ ہندوستانی زبان جو مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے۔ ایک زمانہ میں تمام مشرقی پنجاب پر پھیل گئی ہے۔ اور اس صوبہ کی اصلی زبان لہندا کو ہٹاتی ہوئی یا اس پر چھاتی ہوئی دریائے چناب تک پہنچ گئی۔ بلکہ بعض اوقات اس کا اثر اٹک تک محسوس ہوتا ہے۔ ہند میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سیاسی واقعات کا بہاؤ شمال سے زیادہ تر جنوب کی طرف رہا ہے سیاسی واقعات نیز مغلوں کے دباؤ کے زیر اثر آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں بڑے بڑے گروہ پنجاب سے ہجرت کر کے دہلی اور اس کے نواح میں آباد ہوتے رہے ہیں۔ بارہویں صدی میں سکھ پنجاب سے نکل کر اُردو بانگڑ دادر بیکانیری علاقوں میں گھس جاتے ہیں۔ ان واقعات کے سامنے ہندوستانی زبان کے شمال کی طرف

پڑھنے اور لہندا کو پیچھے دھکیلنے کا کوئی مناسب موقعہ نظر نہیں آتا۔

پنجابی کے مصنفین

پنجابی میں شعر و ادب ایک معتدبہ مقدار میں موجود ہے۔ جس کا اکثر حصہ مسلمان دماغوں کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ خواجہ مسعود سعد سلمان کے بعد پنجابی کے پہلے شاعر شیخ فریدالدین مسعود متوفی ۶۶۴ھ ہیں۔ سکھوں کا بیان ہے کہ وہ فریدالدین ابراہیم ہیں جو گورو نانک کے معاصر ہیں۔ ان کے کلام کا کسی قدر حصہ اتفاق سے سکھوں کی مقدس کتاب گرنتھ صاحب میں محفوظ ہے۔ دوسرے شاعر گرو نانک صاحب ہیں۔ جن کا جپ جی سکھوں میں بہت مقبول ہے۔ شاہ حسین متوفی ۱۰۰۸ھ نے ایک کافی اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ پنجاب کے علما نے بیشمار کتابیں اور رسالے اس نظر سے تصنیف کئے ہیں کہ مسلمان جماعت کا غیر تعلیم یافتہ طبقہ احکام دین روزے، نماز اور مسائل شرعیہ سے ضروری واقفیت حاصل کر سکے۔ ایسی کتابیں اکثر اوقات مختصر نظم کی شکل میں ہوتی تھیں۔ تاکہ لوگ آسانی سے یاد کر سکیں جاہل طبقہ کیلئے یہ طریقہ تعلیم مسلمانوں نے ہندوستان کی باقی زبانوں میں بھی اختیار کیا ہے پنجابی میں ایسی تالیفات کا سلسلہ بہت وسیع ہے اگرچہ تحقیق معلوم نہیں کہ یہ سلسلہ کس زمانہ سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن اس کے قدیم ہونے میں کوئی شک نہیں۔ کیونکہ اکبری عہد کی ایسی تالیفات اب بھی موجود ہیں۔ ان میں مولانا عبدی ابن محمد ساکن ماتو کا رسالۂ ہندی سب سے مقدم ہے جو ۹۹۷ھ کی تصنیف ہے ؎

نوسے تے ستانویں جاں گذرے وچ شمار　　پچھے ہجرت مصطفیٰ تد ان نہیا طیار

مولوی عبداللہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ جو جہانگیر کے عہد سے شروع کر کے شاہجہان کے آخر ایام تک برابر چالیس سال تک تصنیف و تالیف میں مصروف ہیں شرعیات ان کا میدان ہے۔ اور اسی میں تمام عمر گذار دی۔ ان کی پہلی تصنیف تحفہ ۱۰۲۵ھ میں اور آخری کتاب خیر العاشقین ۱۰۶۵ھ میں ختم ہوتی ہے۔ خلاصہ

سنہ ۱۰۳۰ھ میں انواع العلوم سنہ ۱۰۴۴ھ میں۔ خیر العاشقین کلاں سنہ ۱۰۵۴ھ میں اور سراجی سنہ ۱۰۵۸ھ میں نظم ہوئیں۔ مولانا عبداللہ کے حالات زندگی سے ہم ناواقف ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ انہوں نے علوم دین اور فقہ کی زبردست خدمت کی ہے مولوی عبداللہ کے مقلدین میں علاماں ناجی (غلاماں ناجی کذا) اور درویش محمد ہیں فقہی رسائل دونوں نے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ علاول بن درویش محمد نے "مسائل فقہ" لکھے۔ مولانا عبدالکریم نے سنہ ۱۰۸۶ھ میں نجات المومنین تصنیف کی۔ سنہ ۱۰۵۴ھ میں فقیر شاعر نے نور نامہ کو نظم کیا۔

عالمگیر کے عہد سے بچوں کی تعلیم کیلئے متعدد کتب نصاب کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جن میں ذریعہ تعلیم پنجابی زبان ہے۔ کھرل رائے سنامی نے سنہ ۱۱۰۵ھ میں ایزد باری اور امید نے سنہ ۱۱۰۶ھ میں اللہ باری تالیف کیں۔ فارسی نامہ عبدالرحمن بن محمد قاسم قصوری کی یادگار ہے۔ رازق باری اور واحد باری کا ذکر وارث شاہ علیہ الرحمۃ اپنی مثنوی ہیر ورانجھا میں کرتے ہیں۔ نصاب ضروری کے مالک خدا بخش ہیں سنہ ۱۲۲۰ھ میں گنپش داس صنعت باری پر قلم اٹھاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب نے بچوں اور غیر تعلیم یافتہ گروہ کی تعلیم کا انتظام اور مقامات سے بہتر کیا تھا۔

نیم مذہبی تصنیفات میں احوال الآخرت معراج نامے۔ نور نامے۔ وفات نامے۔ جنگ نامے وغیرہ قسم کی کتابوں کا بہت وسیع سلسلہ موجود ہے۔ طب میں بھی بعض کتابیں تصنیف اور بعض ترجمہ ہوئی ہیں۔ مثلاً دار الشفا۔ ترجمہ شفا نو نسخہ و مجربات اکبری وغیرہ۔

قصص و افسانہ کے سلسلہ میں ہیر ورانجھا کا قصہ بہت مشہور ہے مقبل نے محمد شاہی عہد میں اور وارث شاہ علیہ الرحمۃ نے سنہ ۱۱۸۰ھ میں اس فسانہ کو نظم کر کے ایک غیر فانی شہرت حاصل کر لی ہے۔ ان کے مقلدین میں فضل شاہ نے زیادہ نام پیدا کیا۔ سوہنی مہینوال کے قصہ پر سید فضل شاہ۔ مشتاق ہنا۔ اور غمناک نے طبع آزمائی کی

ہیر سسّی و پنوں کو ہاشم، سیّد فضل شاہ، مولوی غلام رسول، احمد یار اور بوٹا نے علیحدہ علیحدہ نظم کیا ہے۔ فضل شاہ نے لیلیٰ و مجنوں کی نظم لکھ کر اپنا نام کیا ہے یوسف زلیخا کا قصہ پنجاب میں بہت مقبول رہا ہے۔ متعدد شعراء نے اس کو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ مثلاً پیر اندتہ۔ محمد سعید اور مولوی غلام رسول۔ لیکن سب سے قدیم عبدالحکیم کی یوسف زلیخا ہے جو ۱۲۱۸ھ میں حلیۂ نظم پہنتی ہے۔ اور راقم سطور نے آئندہ اوراق میں اس سے بہت امداد لی ہے۔ عبدالحکیم اوچہ تحصیل احمد پور کے باشندے ہیں۔ جو بہاول پور کے علاقہ میں واقع ہے عبدالحکیم نے یہ مثنوی اپنے علاقہ کی زبان میں جو ملتانی کے نام سے مشہور ہے لکھی ہے۔ اور نواب بہاول خاں کے نام پر معنون کی ہے۔

صوفی شعرا میں حضرت بلہے شاہ متوفی ۱۱۷۱ھ اور علی حیدر متوفی ۱۱۹۱ھ شہرت خاص رکھتے ہیں۔ بلہے شاہ کی کافیاں صوفی حلقوں میں بیحد مقبول ہیں۔ پنجابی میں قصص الانبیا۔ اور شاہنامہ جیسی کتابیں بھی ترجمہ ہو چکی ہیں۔ جنگ نامے پنجابی ادبیات کی ایک اور صنف ہیں۔ جن میں شہید کربلا اور ان کی جنگوں کا ذکر ہے۔ ان میں مقبل کا جنگ نامہ سب سے قدیم ہے جو ۲۹ھ جلوس محمد شاہی مطابق ۱۱۶۰-۵۹ھ میں لباس نظم پہنتا ہے۔ اس کے علاوہ بارہ ماسے اور سی حرفیاں پنجابی ادب کی خصوصی شاخ ہیں۔ جواب بالکل متروک ہیں۔ سی حرفی گجراتی اُردو میں بھی ملتی ہے۔ اور شاہ علیجیو گام دھنی کے جواہر اسرار اللہ میں موجود ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظمیں بھی بارہ ماسوں کی طرح قدیم ہیں۔

پنجابی اور اُردو

گزشتہ صفحات میں اشارہ کیا جاچکا ہے کہ پنجابی اور اُردو اپنی صرف ونحو میں ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ یہاں اس بحث پر کسی قدر تفصیل کیساتھ روشنی ڈالی جاتی ہے:-

(۱) مصدر کا قاعدہ دونوں زبانوں میں ایک ہے یعنی علامت "نا" امر کے آخر میں اضافہ کردی جاتی ہے۔ قدیم زمانہ میں اس کا رسم الخط دونوں زبانوں میں "ناں" تھا بارہویں صدی کے اختتام کے قریب ایسے نون غنہ کو ترک کردیا جاتا ہے اور دیگر الفاظ سے بھی خارج کردیا جاتا ہے مثلاً سیں۔ کوں ستیں وغیرہ جو بعد میں سے کو اور سیتی بنجاتے ہیں۔

(۲) تذکیر وتانیث کے قواعد دونوں زبانوں میں ایک ہیں۔ یعنی:-

(۱) اکثر ایسے الفاظ جو "الف" پر ختم ہوتے ہیں: تانیث کی حالت میں "ی" پر ختم ہوتے ہیں مثلاً بکرا۔ بکری۔ گھوڑا گھوڑی۔ چنگا۔ چنگی۔ کالا کالی۔ بوٹا۔ بوٹی۔

(۱) جب اسم مذکر حروفِ علت کے سوا حرف صحیح پر ختم ہو تو دونوں زبانوں میں تانیث کے لئے "نی" یا "انی" اضافہ کردیتے ہیں۔

مذکر	مونث پنجابی	مونث اُردو
مغل	مغلانی	مغلانی
لوہار	لُہارن۔ لُوہاری۔ لُوہارنی	لُوہاری۔ لوہارن
دیور	دیرانی	دِورانی
اونٹ	اونٹنی	اونٹنی

مذکّر	مونث پنجابی	مؤنث اُردو
نٹ	نٹنی	نٹنی
فقیر	فقیرنی	فقیرنی
زمیندار	زمیندارنی	زمیندارنی
ڈوم	ڈومنی	ڈومنی
سیّد	سیّدزادی	سیّدانی

(ب) اگر مذکر "ی" پر ختم ہو تو مؤنث میں "ی" نون سے بدل جاتی ہے:۔

مذکر	مونث پنجابی	مونث اُردو
میراثی	میراثن	میراثن
تیلی	تیلن	تیلن
قریشی	قریشن	
موچی	موچن۔ موچیانی	موچن
بھائی	بھَین	بہن
قصائی	قصائن	قصائنی
جوگی	جوگن	جوگن
درزی	درزیانی۔ درزن	درزن
نائی	نائین	نائن
قاضی	قضیانی	قضیانی
دھوبی	دھوبن	دھوبن
کھتری	کھترانی	

"نی" لاحقۂ تانیث جو ہم زمیندارنی۔ فقیرنی۔ ڈومنی وغیرہ میں دیکھتے ہیں۔

درحقیقت پنجابی میں عام علامت تانیث ہے جو عورت کو خطاب کے لئے ابتدا میں بھی لائی جا سکتی ہے مثلاً "نی کڑیے" (اے لڑکی) "نی شیر محمد دی ماں" (اے شیر محمد کی ماں) +

(۳) اعلام و اسما اور اسمائے صفات دونوں زبانوں میں الف پر ختم ہوتے ہیں جبکہ برج بھاشہ میں واو مجہول پر ختم ہوتے ہیں۔ جیسے :-

پنجابی	اُردو	
منڈا	لڑکا	
گھوڑا	گھوڑا	
کتا	کتا	
نیولا	نیولا	خالق باری میں نیول ملتا ہے مصرع "کتر دم مچھو
چنگا	اچھا	را سو نیول" لیکن اُردو نے اپنا قاعدہ مستمرہ جاری
نکا	چھوٹا	کرکے نیولا بنا دیا +
وڈا	بڑا	
کھبا	الٹا	
سجا	سیدھا	
اُچا	اونچا	

(۴) اسما صفات تذکیر و تانیث اور جمع و واحد میں اپنے موصوف کی حالت کے مطابق ہوتے ہیں مثلاً

اُردو (۱) اونچا گھوڑا (۲) میرا لڑکا (۳) چھوٹی لڑکی (۴) بڑے لڑکے (۵) دوڑتے گھوڑے سے (۶) چھوٹی لڑکیاں +

پنجابی (۱) اُچا گھوڑا (۲) میرا منڈا (۳) نکی کڑی (۴) وڈے منڈے (۶)

دوڑدے گھوڑے توں (۶) نکیاں کڑیاں +

برج میں اس موقعہ پر اونچو گھوڑا اور میرو چھورا لائیں گے۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اردو اور پنجابی فقروں میں اسماے صفات اُن کے موصوفوں کے مطابق ہیں۔ یعنی جب موصوف غیر منصرف ہے۔ تو اس کا اسم صفت بھی غیر منصرف رہا جیسے پہلے تین جملوں میں دیکھا جاتا ہے۔ چوتھے اور پانچویں جملہ میں چونکہ موصوف منصرف ہو گئے ہیں یعنی اپنی اصلی علمی حالت لڑکا اور گھوڑا کو چھوڑ کر لڑکے اور گھوڑے بن گئے ہیں اس لئے اُن کے اسماء صفات بھی منصرف ہو کر اپنے موصوفوں کی حالت قبول کر کے بڑے اور دوڑتے بن گئے۔ اہل برج اس موقعہ پر "بڑے لڑکا" اور "دوڑتے گھوڑا سے" لائیں گے۔ جو اردو اور پنجابی کے خلاف ہے۔ یہ فرق اگرچہ بظاہر خفیف ہے۔ لیکن نہایت اہم ہے۔ چھٹے فقرے میں دیکھا جاتا ہے کہ پنجابی میں جبکہ صفت و موصوف باہم متحد ہیں اردو میں باہم مطابق نہیں۔ چھوٹی واحد ہے اور لڑکیاں جمع میں ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو میں یہ بے ضابطگی میر و سودا کے عہد سے شروع ہوتی ہے اردوی قدیم میں "چھوٹیاں لڑکیاں" ہی بولتے تھے۔ جو پنجابی کے عین مطابق ہے احمد دکنی سے

سوچادوں سے پاپیاں سو بالیاں نکھیاں وفا شرم انو تھے سکیاں سب سکیاں

(۵) خبر تذکیر و تانیث، واحد و جمع میں اپنے مبتدا کے موافق آتی ہے:۔

اردو (۱) یہ بات بھلی نہیں (۲) یہ باتیں بھلی نہیں +

پنجابی (۱) ایہ گل چنگی نہیں۔ (۲) ایہ گلاں چنگیاں نہیں +

اردو کے دوسرے جملہ میں دیکھا جاتا ہے کہ خبر اپنے مبتدا کے مطابق نہیں باتیں جمع ہے اور بھلی واحد۔ جب کہ پنجابی میں مبتدا اور خبر دونوں جمع میں ہیں۔ یہ جدت طرازی اسی زمانہ اصلاح سے تعلق رکھتی ہے جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ پرانی

اُردو میں یہ جملہ یُوں لکھا جاتا "یہ باتیں بھلیاں نہیں"۔ بلکہ "یہ باتاں بھلیاں نہیں" جو پنجابی سے بالکل موافق ہے۔ سودا کہتے ہیں ؎

دوانہ ہوگیا سودا تو آخر ریختہ پڑھ پڑھ
نئیں کہتا تھا اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

(۶) فعل تذکیر و تانیث و واحد و جمع میں اپنے فاعل کے مطابق ہے:۔

اُردو:۔ (۱) گھوڑا آیا (۲) گھوڑے آئے (۳) عورت آئی (۴) عورتیں آئیں۔

پنجابی:۔ (۱) گھوڑا آیا (۲) گھوڑے آئے (۳) بڈھی آئی (۴) بڈھیاں آئیاں۔

چوتھے جملہ میں بڈھیاں غیر منصرف ہے۔ جو بالکل درست ہے۔ اُردو کے جملہ میں اسے عورتاں سے منصرف کرکے عورتیں بنالیا گیا ہے۔ پرانی اُردو میں بھی جُملہ یوں لکھنے "عورتاں آئیاں" ایک مثال سودا کے کلام میں موجود ہے ؎

کھنی نکلیں ہیں لخت دل سے تار اشک کی لڑیاں
یہ انکھیاں کیوں مرے جیکے گلے کی ہار ہو پڑیاں

(۷) اضافت اپنے فاعل کی تذکیر و تانیث اور واحد و جمع کے مطابق ہوتی ہے:۔

اُردو:۔ اِس میں کوٹھیاں رنگ برنگی ہیں بعض چاندی کی بعض یاقوت سُرخ کی۔ اور بعض زمرد کی۔ اور بعض زبرجد کی۔ اور بعض جواہراتِ سفید کی ۔

پنجابی:۔ اوہ دے وچ کوٹھریاں رنگ برنگیاں ہین۔ بعضیاں چاندی دیاں بعضیاں یاقوت سُرخ دیاں تے بعضیاں زمرد دیاں تے بعضیاں زبرجد دیاں تے بعضیاں چٹے جواہرات دیاں نے ۔

یہاں اعتراض وارد ہوتا ہے کہ کوٹھریاں جمع میں ہیں۔ اور اضافت "کی" واحد میں لیکن یہاں پھر اُردو نے اپنے پُرانے قواعد کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ بارھویں صدی ہجری میں بھی جملہ یوں لکھا جاتا تھا:۔

اُور اس میں کوٹھریاں رنگ رنگی ہیں بعض چاندی کیاں بعض یاقوت سُرخ کیاں۔ اُور بعض زمرد کیاں اور بعض زبرجد کیاں اور بعض جواہرات سفید کیاں" (منقول از کتاب ہزار مسائل)۔

مثال دیگر:-

اُردو:- یوں نو دہزار باتاں اللہ کیاں ہور محمدؐ کیا ہیچ یاں (از معراج العاشقین حضرت گیسودرازؒ)

پنجابی: ایہہ نوے ہزار باتاں اللہ دیاں ہور محمدؐ دیاں ہویاں۔

مثال دیگر:-

اُردو:- قیامت کی نشانیاں کتنی ہیں اور کیسی ہیں یا رسول اللہؐ"

پنجابی:- قیامت دیاں نشانیاں کتیاں نے کیہیاں نے یا رسول اللہؐ"

قدما کی زبان میں یہ جملہ یوں ہے :-

قیامت کیاں نشانیاں کتنیاں ہیں اور کیسیاں ہیں یا رسول اللہ (از ہزار مسائل)۔

محمد امین دکنی ؎

گگن کی گردشاں ہیں کیتیں طرح کیاں

کدہیں غم کیاں ہیں اور کدہیں فرح کیاں (یوسف زلیخا)

(۸) ماضی مطلق دونوں زبانوں میں ایک سا ہے :-

اُردو :- وہ آیا۔ وہ آئے۔ تو آیا۔ تم آئے۔ میں آیا۔ ہم آئے۔ وہ آئی۔ وہ آئیں تو آئی۔ تم آئیں۔ میں آئی۔ ہم آئیں۔

پنجابی:- اوہ آیا۔ اوہ آئے۔ توں آیا۔ تسی آئے۔ میں آیا۔ اسی آئے۔ اوہ آئی۔ اوہ آئیاں۔ توں آئی۔ تسی آئیاں۔ میں آئی۔ اسی آئیاں۔

جمع مؤنث کے صیغوں میں جو فرق پنجابی اور اُردو میں ملاحظہ ہوتا ہے۔ وہ متاخرین کی اصلاحی کوشش کا نتیجہ ہے جس نے قدما کے قاعدوں کو بالکل درہم و برہم کر دیا۔

وہ ان صیغوں کو یوں بولتے تھے:-

وہ آئیاں۔ تم آئیاں۔ ہم آئیاں +

محمد امین دکنی ؎

مصر میں خوب صورت بیبیاں تھیاں انوں سنیاں زلیخا کی سو باتاں ؎

(۹) ماضی قریب فعل امدادی کی تصریف سے بنتی ہے۔ یہاں پنجابی اور اُردو میں کسی قدر اختلاف ہے:-

صیغہ مذکر:
اُردو:- وہ آیا ہے۔ وہ آئے ہیں۔ تو آیا ہے۔ تم آئے ہو۔ مَیں آیا ہُوں۔ ہم آئے ہیں
پنجابی:- اوہ آیا اے۔ اوہ آئے نے۔ توں آیا ایں۔ تُسی آئے او۔ مَیں آیا آں۔ اسی آئے آں

صیغہ مؤنث:
اُردو:- وہ آئی ہے۔ وہ آئی ہیں۔ تو آئی ہے۔ تم آئی ہو۔ مَیں آئی ہُوں۔ ہم آئی ہیں +
پنجابی:- اوہ آئی اے۔ اوہ آئیاں نے۔ تو آئی ایں۔ تُسیں آئیاں او۔ مَیں آئی آں۔ اسی آئیاں آں +

(۱۰) ماضی بعید بھی توابع کی تصریف سے بنتی ہے۔

مذکر:
اُردو:- وہ آیا تھا۔ وہ آئے تھے۔ تو آیا تھا۔ تم آئے تھے۔ مَیں آیا تھا۔ ہم آئے تھے
پنجابی:- اوہ آیا سی۔ اوہ آئے سن۔ توں آیا سیں۔ تُسی آئے سو۔ مَیں آیا ساں۔ اسی آئے ساں

مؤنث:
اُردو:- وہ آئی تھی۔ وہ آئی تھیں۔ تو آئی تھی۔ تم آئی تھیں۔ مَیں آئی تھی۔ ہم آئی تھیں +
پنجابی:- اوہ آئی سی۔ اوہ آئیاں سن۔ تو آئی سیں۔ تُسی آئیاں سو۔ مَیں آئی ساں۔ اسی آئیاں ساں +

قدیم اُردو میں اس ماضی کی تصریف یُوں تھی:-

وے آئیں تھیاں یا آئیاں تھیاں +

محمد امین دکنی:-

نشانیاں دیکھیاں تھا سو تیا یاں   دے سب دائی کے آگے کہہ سنایاں

دیگر محمد امین دکنی:-

بھی جنت کی حلوں کیاں چوٹیاں تھیاں   لٹاں موتیاں کی اُس میں گونتھیاں تھیاں

(۱۱) ماضی ناتمام میں بڑا فرق یہ ہے کہ پنجابی میں جہاں دال ہے۔ اردو میں تے بن گئی ہے۔

مذکر:

اُردو:- وہ مارتا تھا۔ وہ مارتے تھے۔ تو مارتا تھا۔ تم مارتے تھے۔ میں مارتا تھا ہم مارتے تھے +

پنجابی:- اوہ ماردا سی۔ اوہ مار دے سن۔ توں ماردا سیں تسی مار دے سو۔ میں ماردا ساں۔ اسی مار دے ساں +

مؤنث:

اُردو:- وہ مارتی تھی۔ وہ مارتی تھیں۔ تو مارتی تھی۔ تم مارتی تھیں۔ میں مارتی تھی ہم مارتی تھیں +

پنجابی:- اوہ ماردی سی۔ اوہ ماردیاں سن۔ تو ماردی سیں تسی ماردیاں سو۔ میں ماردی ساں۔ اسی ماردیاں ساں +

(۱۲) ماضی احتمالی دونوں زبانوں میں بالکل ایک ہے۔

مذکر:

اُردو:- وہ کھاتا ہو۔ وہ کھاتے ہوں۔ تو کھاتا ہو۔ تم کھاتے ہوؤ۔ میں کھاتا ہووں ہم کھاتے ہوں +

پنجابی:- اوہ کھاندا ہووے۔ اوہ کھاندے ہوں۔ تو کھاندا ہوویں تسی کھاندے ہوؤ۔ میں کھاندا ہوواں۔ اسی کھاندے ہوئیے +

مؤنث:

اُردو:- وہ کھاتی ہو۔ وہ کھاتی ہوں۔ تو کھاتی ہو۔ تم کھاتی ہوؤ۔ میں کھاتی ہوؤں۔ ہم کھاتی ہوں +

مؤنث { پنجابی:۔ اوہ کھاندی ہووے۔ اوہ کھاندیاں ہوون۔ توں کھاندی ہووین تیسی کھاندیا ہوؤ۔ مَیں کھاندی ہوواں۔ اسی کھاندیاں ہوویئے +

(۱۳) مضارع دونوں زبانوں میں ایک ہے ۔

مذکر { اُردو:۔ وہ آئے۔ وہ آئیں۔ تو آئے۔ تم آؤ۔ مَیں آؤں۔ ہم آئیں +
پنجابی:۔ اوہ آوے۔ اوہ آون۔ توں آویں تیسی آؤ۔ مَیں آواں۔ اسی آیئے +

اُردو:۔ وہ آئے۔ وہ آئیں۔ تو آئے۔ تم آؤ۔ مَیں آؤں۔ ہم آئیں +

پُرانی اُردو میں بھی آوے اور آویں ہی مستعمل تھا۔ آنا دراصل آونا تھا۔ اِس سے مضارع آوے اور آویں تھیں +

(۱۴) فعل حال کی تصریف۔ دونوں زبانوں میں ایک ہی اصول پر ہے۔ ماضی ناتمام کی طرح یہاں بھی دال اَور تے آپس میں بدلتی ہیں +

مذکر { اُردو:۔ وہ کرتا ہے۔ وہ کرتے ہیں۔ تو کرتا ہے۔ تم کرتے ہو۔ مَیں کرتا ہوں ہم کرتے ہیں +
پنجابی:۔ اوہ کردا اے۔ اوہ کردے نے۔ توں کردا ایں تیسی کردے او۔ مَیں کردا آں۔ اسی کردے آں +

مؤنث { اُردو:۔ وہ کرتی ہے۔ وہ کرتی ہیں۔ تو کرتی ہے۔ تم کرتی ہو۔ مَیں کرتی ہوں ہم کرتی ہیں +
پنجابی:۔ اوہ کردی اے۔ اوہ کردیاں نے۔ توں کردی ایں تیسی کردیاں او۔ مَیں کردی آں۔ اسی کردیاں آں +

پرانی اُردو میں مونث کی گردان زیادہ قریب تھی +

اُردوئے قدیم:۔

وہ کرتی ہے۔ وہ کرتیاں ہیں۔ تو کرتی ہے۔ تم کرتیاں ہو۔ مَیں کرتی ہوں۔ ہم کرتیاں ہیں

مثال:۔

"واسطے مردوں کے ہے حصہ اُس چیز سے کہ کماتے ہیں اور واسطے عورتوں کے حصہ ہے اُس چیز سے کہ کمائیاں ہیں" (ترجمہ قرآن از شاہ رفیع الدین صاحب)۔

مثال:۔

ایسی ایسی ادھڑیں باہم چلاتیاں ہیں کہ دیکھنے والوں کی مارے ہیبت کے جانیں نکلتیاں ہیں (آرائش محفل تالیف سنہ ۱۲۲۰ھ صفحہ ۲۶)

(۱۵) مستقبل کا اصول دونوں زبانوں میں ایک ہے یعنی واحد و جمع میں گا اور گے کے اضافہ سے بنتا ہے۔

اُردو:۔ وہ آئیگا۔ وہ آئینگے۔ تو آئیگا۔ تم آؤگے۔ میں آؤنگا۔ ہم آئینگے۔

پنجابی:۔ اوہ آویگا۔ اوہ آونگے۔ توں آوینگا تسی آؤگے۔ میں آوانگا۔ اسی آوانگے۔

قدیم اُردو میں آویگا اور آوینگے ہی بولتے تھے لیکن فصحائے متاخرین جن کی اصلاحات کا کسی قدر تماشہ ہم گذشتہ سطور میں دیکھ چکے ہیں۔ آئیگا اور آئینگے کہنا پسند کرتے ہیں۔ جمع مخاطب کی واؤ شاید انہیں نظر نہیں آئی۔ ورنہ وہ بھی اصلاح کی قربانگاہ پر چڑھا دیجاتی۔ اور ہم آج "تم آئیگے" بولتے ہوتے۔ کم از کم اس صورت میں یکسانیت تو ہاتھ سے نہ جاتی۔

اُردو:۔ وہ آئیگی۔ وہ آئینگی۔ تو آئیگی۔ تم آؤگی۔ میں آؤنگی۔ ہم آئینگی۔

پنجابی:۔ اوہ آویگی۔ اوہ آونگیاں۔ توں آوینگی۔ تسی آؤگیاں۔ میں آوانگی۔ اسی آواں گیاں۔

قدیم اُردو میں یُوں گردان ہوتی تھی:۔

وہ آویگی۔ وہ آوینگیاں۔ تو آئیگی۔ تم آؤگیاں۔ میں آؤنگی۔ ہم آوینگیاں۔

مثال:۔

اور جنّت والے لوگ جس چیز پر نظر کرینگے پیالیاں اس چیز کیاں بھر کر اوپر منہ اون کیے بخت بند کیے لگیں گیاں۔ اور آپ سے ہٹ جائیں گیاں +

دیگر:۔
بعد اُس کے حوریں بہشت کیاں اپنے ہاتھ سیں مالش کر کر نظا وینگیاں وعجز و انکسار سے دعا مانگینگیاں۔ (ہزار مسائل) +

محمد امین دکنی:۔ ؎
یقی معلوم تقدیر اُس کے تئیں ہاں کر کیا کیا مشکلیں آگل پڑینگیاں

(۱۶) امر کا قاعدہ اُردو پنجابی میں بالکل ایک ہے۔
اُردو:۔ دیکھ۔ کھا۔ لا۔ دے۔ پی۔ نکل۔ جا۔
پنجابی:۔ دیکھ۔ کھا۔ لا۔ دے۔ پی۔ نکل۔ جا۔
جمع مخاطب میں تعظیماً دونوں زبانوں میں ایک واو اضافہ کر دیا جاتا ہے
اُردو:۔ جاؤ۔ کھاؤ۔ آؤ۔ اٹھو۔ چلو۔
پنجابی:۔ جاؤ۔ کھاؤ۔ آؤ۔ اٹھو۔ چلو۔
(و) مصدر بمعنی امر دونوں زبانوں میں مستعمل ہے۔
اُردو:۔ پرکھنا۔ سر کرنا۔ آنا۔ جانا۔ یاد رکھنا۔ بھول نہ جانا۔ سلام کہنا وغیرہ۔
پنجابی:۔ پرکھناں۔ سر کرناں۔ آوناں۔ جاوناں۔ یاد رکھناں۔

عبد الحکیم:۔ ؎
کو یک طور میں تفوں یاد رکھناں کیمنے تے اسیداں نوں پرکھناں

(ب) اُردو میں امر کے بعد "لیے" بڑھا کر مضارع اور امر کا مفہوم ادا کرتے ہیں
یہ دستور پنجابی میں بھی موجود ہے +
اُردو مصرع:۔

سنتا ہی نہیں میری دیوانہ کو کیا کہئے

غالب ؎

رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو   ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار   اور جو مرجائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

میر صاحب ؎

داد و فریاد جا بجا کریئے +   شاید اُس کے بھی دل میں جا کریئے

پنجابی وارث شاہ ؎

جد دن عشق دے کم نوں ہتھ لائیے پہلاں بدا نام دھائیے جی
پھر نبی رسول پیغمبراں نوں دم دم درود پہنچائیے جی ؛

(ج) اس صورت میں بعض اوقات "ی" "جیم" سے بدل بھی جاتی ہے۔ اور "جے"
بنالیا جاتا ہے۔ یہ شکل بھی دونوں زبانوں میں موجود ہے +

اُردو۔ میر تقی میر ؎

ملا یا رب کہیں اس صید افگن سربسر کین کو   کہ افشاں کیجے خوں اپنے سے اسکے دامن زین کو

پنجابی۔ عبد الحکیم ؎

اکھن یار دکائی تدبیر کیجے   کدی باہر مرتیجے یار دیجے   (یوسف زلیخا صفحہ ۳)

دکنی اُردو میں یہی "جے" نون غنہ کے ساتھ بھی ملتی ہے :-

محمد امین ؎

اپن گردن اوپر نا خون لیجیں   ہے یہ مطلب پدر سول دُور کیجیں

ایضاً ؎

پچھیں سونگا اپن اس کر کہ لیجیں   سمجھ کر دل بہتر یو کام کیجیں ؛

مغربی مصنفین کہتے ہیں کہ "یے" پنجابی میں اُردو سے آئی ہے۔ لیکن ہمیں یاد

رکھنا چاہیئے کہ پنجابی کی مضارع اور ماضی احتمالی میں یہ شکل پہلے سے موجود ہے۔ اور صیغۂ جمع متکلم میں ملتی ہے۔ پھر اسے اُردو سے لینے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابتدا میں یہ صرف جمع متکلم کا صیغہ تھا۔ بعد میں اس کا استعمال جمع مخاطب اور واحد مخاطب پر بھی تعظیماً ہونے لگا +

(۷ا) "گا" پنجابی میں حال کے معنی بھی دیتا ہے۔ اُردو میں اگرچہ اب تحریر میں متروک ہے لیکن عوام بولتے ہیں۔ پُرانے کلام میں موجود ہے +

اُردو:- وہ ہیگا۔ وہ ہینگے۔ تو ہیگا۔ تم ہوگے۔ میں ہونگا۔ ہم ہینگے۔
پنجابی:- اوہ ہیگا۔ اوہ ہینگے۔ (ہنگے) توں ہینگا تسی ہوگے۔ میں ہانگا۔ ہم ہینگے۔ (ہانگے)

اُردو:- وہ ہیگی۔ وہ ہینگی۔ تو ہیگی۔ تم ہوگی۔ میں ہونگی۔ ہم ہینگی۔
پنجابی:- اوہ ہیگی۔ اوہ ہینگیاں۔ توں ہینگی۔ تم ہوگیاں۔ میں ہانگی۔ ہم ہانگیاں

میر تقی میر ؎

ابر اٹھا تھا کعبے سے اور جھوم پڑا میخانہ پر
بادہ کشوں کا جھرمٹ ہیگا شیشہ اور پیمانہ پر

(۸) دعائیہ اُردو اور پنجابی میں ایک ہی طریق پر ہے۔

اُردو:- تجھے سانپ ڈسے۔
پنجابی:- تینوں سپ لڑے۔

(۹ ا) لازمی و متعدی کا دونوں زبانوں میں وہی اصول ہے اور متعدی بالواسطہ کا بھی وہی قاعدہ ہے۔

اُردو:- سیکھنا۔ سکھانا۔ سکھلانا + اٹھنا۔ اٹھانا۔ اٹھوانا + جگنا۔ جگانا۔ جگوانا
گلنا۔ گلانا۔ گلوانا +

پنجابی:۔ سکھنا۔ سکھاونا۔ سکھلاونا۔ (سکھالنا) اُٹھنا۔ اٹھاونا۔ اٹھواونا۔ جگنا۔ جگاؤنا۔ جگواونا۔ گلنا۔ گالنا۔ گلواونا۔

اُردو:۔ ٹوٹنا۔ توڑنا۔ تڑوانا۔ جلنا۔ جلانا۔ جلوانا۔ پگھلنا۔ پگھلانا۔ پگھلوانا۔

پنجابی:۔ ٹٹنا۔ ٹوڑنا۔ تڑواونا۔ جلنا۔ جالنا۔ جلاونا۔ پگھلنا۔ پگھالنا۔ پگھلواونا۔

اُردو میں بھی "جالنا، بالنا" وغیرہ کا رواج تھا۔ جواب متروک ہے۔ احمد دکنی:۔

کتیاں جلے ہو رجالے منجے تیاکیا گلے ہو رگالے منجے

(۲۰) معروف و مجہول کا وہی طریقہ ہے۔ پنجابی میں بھی "جانے" کی تصریف سے مجہول بنایا جاتا ہے۔

اردو:۔ لڑکی ماری گئی۔ لڑکا مارا گیا۔

پنجابی:۔ کڑی ماری گئی۔ منڈا مارا گیا۔

(۲۱) ندائیہ میں دونوں زبانیں متفق ہیں۔

اُردو:۔ اے لڑکو۔ او لڑکیو۔ اے لڑکے۔ اے بھائیو۔ او بیرحم۔ او گدھے۔

پنجابی:۔ اے یا او منڈیو۔ اے یا نی کڑیو۔ او منڈیا۔ اے بھراؤ۔ او بیرحم۔ او کھوتیا۔

(۲۲) نفی کے وہی معمولی کلمے۔ مثلاً نہ۔ نا۔ ناں۔ نہیں۔ نیں۔ ناہی۔ ناہیں۔ پنجابی میں بھی آتے ہیں۔ جو ایک زمانہ میں اُردو میں بھی مستعمل تھے۔

جس موقعہ پر اُردو میں نہ کرو اور نہ جاؤ کہینگے۔ ایسی جگہ اہل پنجاب ناکرو اور ناجاؤ کہینگے۔ مثلاً عبدالحکیم کہتے ہیں ؎

ولیکن ایہ خیانت نا کریساں ایہو نکتا متھے لینے نہ لیساں

دیگر ؎

اسی گل تے مرادل ناکہڑ دسی جو مینھوں ایہ سخن مولی نہ ہوسی

گویا "نا" زیادہ تر تاکید کے لئے آتا ہے۔ دکنی میں بھی یہی "نا" موجود ہے۔

احمد دکنی قطب شاہی ؎

جو بندیاں تھے ناہوے گنہ کا ظہور ٭ توکس دا ہ ہوے نام تیرا غفور

دیگر ؎

رہیوں سکی ساۃ موحیط ہوے ٭ جو نا دُودھ پیوے خوشی سوں نسوے

پنجابی میں اس کی ایک شکل "ناں" بھی ہے۔ جو دکنی اُردو میں بھی ملتی ہے۔

محمد امین دکنی ؎

یوسف کی جگہ میں کیوں موا ناں ٭ اے قائل باگہ میرا کیوں ہوا ناں

دیگر ؎

اکیلی ایک ساعت چھوڑتی ناں ٭ شفقت دل ستی دسے توڑتی ناں

(۳۳) امدادی افعال کے ذریعہ سے مختلف مقاصد کے اظہار کے لئے افعال مرکب بنا لینے کا طریقہ دونوں زبانوں میں رائج ہے۔ اردو میں اس کے لئے افعال آنا ہونا۔ چکنا۔ رہنا۔ لگنا۔ سکنا۔ بیٹھنا۔ پڑنا۔ دینا۔ لینا۔ ڈالنا۔ جانا۔ کرنا۔ چلنا۔ کھانا۔ وغیرہ زیادہ مستعمل ہیں۔ ان میں سے اکثر افعال پنجابی میں بھی یہی مطلب دیتے ہیں میں بعض کی مثالیں دیتا ہوں :۔

(۱) سکنا۔ وارث شاہ ؎

کی صفت ہزارے دی کر سکاں گویا بہشت زمین تے آ بیکے

(۲) عبدالحکیم ؎

بہشتاں نوں بنا بیٹھے مکانہ ٭

(۳) بھج جانا۔ (۴) میں کم کر چکیا ہاں۔ (۵) ٹک رون لگیا۔ (۶) اوہ ہسدا رہندا اے۔ (۷) منڈا چلا گیا ٭

عربی وفارسی الفاظ کی ترکیب سے جس طرح اُردو میں بیشمار مصادر بنالئے گئے ہیں۔ پنجابی میں بھی اسی طرح بنلئے جاتے ہیں۔مثلاً روشن کرنا۔قربان کرنا۔خاموش کرنا۔ہوش آنا۔مقصود پانا۔داغ پانا۔گرفتار ہونا۔حیران ہونا۔سیر کرنا۔آرام پانا۔شور کرنا۔فرمان دینا۔وغیرہ +

گذشتہ سطور کے مطالعہ سے ہم پر یہ امر واضح ہوگیا ہے کہ اُردو اور پنجابی کی صرف کا ڈول تمام تر ایک ہی منصوبہ کے زیر اثر طیار ہوا ہے۔ان کی تذکیر و تانیث اور جمع اور افعال کی تصریف کا اتحاد اسی ایک نتیجہ کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ اُردو اور پنجابی زبانوں کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے۔دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی ہے۔اورجب سیانی ہوگئی ہیں۔تب ان میں جُدائی واقع ہوئی ہے۔ان زبانوں میں جو اختلاف دیکھا جاتا ہے۔وہ اکثر اس وقت واقع ہوا ہے۔جب اُردو کی پرورش شعرا اور تعلیمیافتہ طبقہ نے دہلی اور لکھنؤ میں شروع کی ہے۔انہوں نے اپنی دانست میں اُردو کی اصلاح کی۔مگر اکثر موقعوں پر دیکھا جاتا ہے کہ ان کی اصلاح اور ترمیم کے اصول نے ایک صرفی کے نقطۂ نظر سے زبان کے قواعد میں ابتری اور برہمی پیدا کر دی ہے۔قدیمی اصول جن پر زبان کی تعمیر ہوئی تھی۔جامع مفید اور کارآمد تھے۔پرانی جمع کے قاعدہ کو انہوں نے بالکل بیکار اور باطل کر دیا۔اقلیم زبان سے حروف علت و نون غنہ کے اخراج میں ہم اُن سے متفق ہو سکتے ہیں۔لیکن افعال و اسما سے جمع مونث کے ترک کرنے میں ہرگز ہرگز حق بجانب نہیں۔اس نے زبان سے موسیقیت اور خوش آہنگی کے ایک بڑے عنصر کو برباد کر دیا ہے۔کیا کوئی شخص میرزا سودا کے ان اشعار کی خوشنوائی سے انکار کر سکتا ہے۔جو پُرانی طرز میں لکھے گئے ہیں ؎

خاک و خوں میں صورتیں کیا کیا نہ رلیاں دیکھیاں ۔ اے فلک باتیں تیری کوئی نہ بھلیاں دیکھیاں

وہ رہا دستِ تاسف کے تئیں ملتا ہوا۔ جن نے وہ انکھیاں خمار آلودہ ملیاں نکھیاں

اردو میں قدیم زمانہ میں مرفوعی، منصوبی اور مجروری حالتوں کے لحاظ سے تین شکلیں رائج ہوئیں یعنی غماں۔ غموں۔ غمیں؛ پاساں۔ پاسوں۔ پاسیں؛ فکراں۔ فکروں۔ فکریں؛ پچھاں۔ پچھوں۔ پچھیں؛ راتاں۔ راتوں۔ راتیں؛ کدہاں۔ کدہوں۔ کدہیں؛ جدہاں۔ جدہوں۔ جدہیں۔ وغیرہ +

لیکن بعد میں ان کے استعمال میں بےقاعدگی ہونے لگی۔ اور حالت نصبی و مرفوعی و جارہ میں لوگ خلط ملط کرنے لگے۔ حتیٰ کہ قاعدہ بالکل ٹوٹ گیا۔ آج مونث کے علاوہ مذکر اسما کے ساتھ کبھی یہ تینوں حالتیں نہیں ملتیں۔ جیسے لڑکیاں۔ لڑکیوں۔ لڑکیں۔ اسی طرح ہم کی شکل ہماں۔ ہموں اور ہمیں ہونی چاہیے۔ لیکن ہماں نہ آج ملتا ہے۔ نہ پرانے شعرا میں۔ ہموں متاخرین نے متروک کر دیا۔ لیکن پرانے شعرا میں ملتا ہے محمد امین کہتے ہیں ؎

تو ہم اک باگ کو ماریں سگے دس پل ہموں کو کیا تمہیں بوجے ہو کاہل

دیگر ؎

ہموں نے دیکھ اس کو گھا دکھائی بدن اوپر چھریاں ہتھوں لگائی۔

ہمیں خدا کے فضل سے آج بھی زندہ و سلامت ہے۔ علیٰ ہذا۔ غماں۔ غموں اور غمیں میں متاخرین نے غماں اور غمیں دونوں کو مہجور الاستعمال کر دیا۔ غموں آج تک جیتا ہے۔ غماں گذشتہ صدی میں ترک ہوا۔ جس کی مثال کی کوئی ضرورت نہیں۔ رہا غمیں اس کی مثال سنیئے محمد امین ؎

تو اول پی پچھوں شے دے امین کو ابیں پی کر بھلا دے سب غمیں کو

غمیں جا دے نکل کر خرمی آئے تیری امداد سیتی مرتبہ پائے

راتاں کچھ عرصہ قبل ترک ہوا ہے۔ راتوں اور راتیں آج بھی حی و قائم ہیں

گر پاساں۔ پاسوں۔ پاسیں آج بالکل مردود ہیں۔ ان کی یادگار پاس باقی رہ گیا ہے
اسی طرح کدہاں۔ کدہوں کدہیں۔ جدہاں۔ جدہوں۔ جدہیں اُردو سے ہمیشہ کے لئے
رُخصت ہوگئے۔ ان امور سے یہ امر منکشف ہوتا ہے کہ زبان کا دائرہ روز بروز تنگ
اور محدود ہوتا جارہا ہے۔

آمدم برسرِ مطلب۔ ابھی تک ہم نے صرفیانہ طریق پر دونوں زبانوں کا مطالعہ کیا
ہے۔ ذیل میں ہم ایسے مواد پر نظر ڈالینگے جو دوسری زبانوں کے مقابلہ میں اُردو اور
پنجابی میں عام ہو۔ ہم نے اس غرض سے مروجہ اُردو سے اعراض کرکے ایسے نمونوں کو
لیا ہے جو قدیم اُردو سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور جن کا اکثر حصہ آج متروک الاستعمال
قرار دیا گیا ہے۔ دوسری طرف وہی مواد پنجابی زبان میں بجنسہ یا کسی قدر تغیر کے
ساتھ آج بھی موجود ہے۔ اس مطلب کیلئے مَیں نے دکنی اردو کو لیا ہے جس کے
ادبیات کی قدامت اردو میں مسلّم ہے +

(۱) سب سے پیشتر ان زبانوں کی وحدت وجمعیت کے قواعد کے متعلق ہمیں
کسی قدر اَور جاننے کی ضرورت ہے۔ ان زبانوں کی جمع کا اثر تمام جملہ پر محیط ہے۔ وہ
نہ صرف جملہ کے فاعل بلکہ اُس کے متعلقات یعنی اسماے صفات۔ اضافات۔ حالیہ
ضمائر۔ افعال اور اُن کے توابعات تک پر آمر ہوتا ہے۔ اُس کی طاقت کے اندازہ
کے لئے ہم ذیل کا جملہ ناظرین کے پیش کرتے ہیں +

مرنے والی لڑکیوں کی مائیں روتی روتی کہتی تھیں +

پنجابی میں یہی فقرہ آج یوں لکھا جائیگا +

مرن والیاں کڑیاں دیاں ماواں روندیاں روندیاں کیہندیاں سن +

اُردوے قدیم میں اس طرح لکھا جاتا:۔

مرنے والیاں لڑکیاں کیاں مائیاں رونیاں رونیاں کہنیاں تھیاں +

گویا پورا جملہ جمع کا گلدستہ بن گیا ہے۔ مَیں بعض مثالیں اور یہاں درج کرتا ہُوں:۔

عبدالحکیم پنجابی ؎

کیتو سو قید نے زخمی ہزاراں ٹا تے قیدیاں زخمیاں لایاں قطاراں

دیگر ؎

بی بی سے دیاں غلاماں سی ہزاراں جو کھڑیاں ہر طرف لایاں قطاراں

احمد دکنی قطب شاہی ؎

جو ہو ڈال کو نئی سو کو نلا نہال سو کونلیاں کلیاں لک کھلیاں اتے نیکال

محمد امین دکنی ؎

گیاں تھیاں آسماں اوپرے ڈالیاں انوں پھرتے فرشتے مثل چڑیاں

ایضاً ؎

تری اور بوت جہا نجہاں باجنیاں تھیاں نفیراں کی آوازاں گئی جتنیاں تھیاں

اس قاعدہ کی دکن اور پنجاب کے ساتھ خصوصیت نہ تھی۔ بلکہ دہلی کے فصحا بھی اسی رنگ میں لکھتے تھے۔ مَیں یہاں سودا کا ایک اور شعر نقل کرتا ہوں:۔

جب لبوں پہ یار کے مسی کی دھڑیاں دیکھیاں
جوں زحل کی ساعتیں اس دل پہ کڑیاں دیکھیاں

(۲) پنجابی میں آ۔ جا۔ کھا وغیرہ امر کے علاوہ ایک اور امر ہے۔ جو معمولی امر کے آخر میں "ئیں" یا "ویں" کے لانے سے بنتا ہے۔ جیسے۔ آویں۔ جاویں۔ لاویں۔ کھاویں۔ ڈالیں وغیرہ پنجابی شاعر عبدالحکیم کہتے ہیں ؎

الٰہی معرفت اپنی دسائیں شفیع ساڈا رسول اللہ کرائیں

دیگر ؎

جدوں کنعان شہر اندر سدھاویں پھر یک رات دے نا ہیں نہ جاویں

جہاں تک معلوم ہے۔امر کی یہ شکل خاص پنجاب کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور دوسری زبانوں میں نہیں ملتی۔لیکن بہت کم لوگ اس امر سے واقف ہیں کہ قدیم اردو میں بھی یہ شکل موجود تھی۔چنانچہ محمد امین دکنی ؎

امیں دل میں خدا کا عشق راکھیں مجازی عشق کوں سب کاڑ ناکھیں

دیگر ؎

مرے محبوب کو عزت سوں لائیں برانِ جنتی اوپر بھٹائیں ۂ (یوسف زلیخا)

محمد خوب اپنی مثنوی خوب ترنگ تالیف ۹۸۶ھ میں لکھتے ہیں:۔

جوں مجنوں تھا پہلی شاں دوں مجنوں مت کریں گماں

دیگر ؎

یہ پہلی کا پہلا چال خوبیں سمجھیں نہیں اتال

شاہ میرانجی شمس العشاق متوفی ۹۰۲ھ:۔

ایسا کیرا کر ب نرا کہیں جے توں ہوسی سورا
ماں راکھ مرشد لاوے جس ہے گیاں سپورا (اُردو حصّہ نثر ششم ۳۵)

(۳) "گا" قسم کے مستقبل کے علاوہ جو پنجابی اور اُردو میں عام ہے پنجابی میں ایک اور مستقبل ہے جو "سی" کی تصریف سے بنتا ہے! اس کا تعلق زیادہ تر لہندا یا ملتانی سے ہے۔اس مستقبل کا صیغۂ واحد غائب دکنی میں بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔چنانچہ احمد دکنی قطب شاہی ؎

کدہیں سیج سُکھ سنگ ملسی نہ منجہ کدہیں من کمل پھول کھل سی نہ منجہ (لیلیٰ مجنوں)

ولی دکنی ؎

کہا ہے زہر کا تا ثیر اس میں
نہ چل سی کچھ مرا تدبیر اس میں (روضۃ الشہدا صد ۴۹)

بقول مولوی عبدالحق صاحب کتاب سبرس مولانا وجہی نے ۱۰۴۰ھ کے لگ بھگ طیار کی ہے۔ اس میں فقرۂ ذیل ملتا ہے :-

جس میں عشق کا کچھ درد اس کتاب کو سینے پرتے ہلاسی نا۔ اس کتاب بغیر اپنا وقت بہلاسی نا۔

مولوی عبدالحق صاحب نے رسالۂ اردو حصہ بست وششم میں میرانجی شمس العشاق کی تصنیفات پر ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں شعر ذیل ملتا ہے :-

توں جس کو بھاوے جوڑ   ناجاسی یہ گن چھوڑ   (صفحہ ۱۸۶)

"سی" کی جس قدر مثالیں ملتی ہیں سب صیغۂ واحد غائب میں ہیں۔ یہ مستقبل ہندوستان کی کئی زبانوں میں ملتا ہے۔ مثلاً گجراتی۔ مارواڑی جیپوری۔ نیماڑی اور ملتانی جس کی تصریف حسب ذیل ہے :-

گجراتی :-

ہوں مارس۔ تو مارشے۔ تے مارشے۔ ہم ماریسوں۔ تمے مارسو۔ تیو مارسے۔

مارواڑی جیسلمیری :-

ہوں مارس۔ تو مارس۔ او مارسے۔ مھے مارساں۔ تھے مارسو۔ او مارسے۔

جے پوری :-

ہوں مارشوں۔ تو مارشی۔ او مارشی۔ مھے مارشاں تھے مارشو۔ او مارشی۔

(بعض علاقوں میں سین مہملہ کے ساتھ بولا جاتا ہے)

نیماڑی :-

ہوں مارس۔ تو مارس۔ دو مارسے۔ ہم مارساں۔ تم مارسو۔ دو مارسے۔

ملتانی :-

مَیں مرسیاں۔ تو مرسیں۔ او مرسی۔ اساں مرسیوں۔ تو ساں مرسیو۔ او مرسن (مریسن)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سی قسم کا مستقبل دکنی زبان میں کہاں سے لیا گیا ہے۔ ہماری نظر میں قدرتاً گجراتی زبان پر پڑتی ہیں۔ جو ہمسایہ زبان ہے۔ لیکن گجراتی میں یہ صیغہ با یائے مجہول ہے۔ (یا "شے" یا یائے مجہول جیسا کہ سورت میں بولتے ہیں) اور دکنی میں با یائے معروف ہے۔ اس لئے گجراتی سے ماخوذ نہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راجپوتانہ سے آیا ہو۔ کیونکہ مولوی عبدالحق صاحب نے اس کی جو اور شکلیں دی ہیں یہ ہیں:۔

ہمیں ناکرسیں۔ نادیکھ سوں، اکرسوں، کہہ سوں (صفحہ ۴۲۳۔ رسالۂ اُردو حصہ بست و ہفتم)

اور جواہر اسرار اللہ شاہ علیجیو گام دہنی میں یہ شکلیں ہیں:۔

واحد غائب:۔

کریسو = کریگا رکھو لے گھونگٹ گل لادے تھندرا کریسو تپتا سیناں) کریسو باتاں = باتیں کریگا۔ جاسی = جائیگا۔ ملاسی = ملائیگا۔

واحد حاضر:۔

دیکھ سی توں = تو دیکھیگا۔ تو کرسی = تو کریگا۔

واحد متکلم:۔

جان نہ دیسوں۔ جانے نہ دونگا۔ دھرسوں = دھرونگا۔ ملے سوں = ملونگا۔ ملوں سو = ملونگا۔ کروں سو = کرونگا۔ میں سو = میں ہوں۔

احمد دکنی:۔

تجھے نت من رت سوں شادی شراب　　برہ کی خماری سے میں سو خراب

(۴) "کھڑا" اُردو میں عام طور پر آتا ہے۔ اس سے کھڑا ہونا اور کھڑا رہنا وغیرہ مصادر بنا لئے گئے ہیں۔ اور محاورے بھی بنائے ہیں۔ اہل لغات اس کا ماخذ پراکرت

کا "کھڈ واد" بتاتے ہیں۔ اِس توجیہ کے بجائے مَیں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کو پنجابی مصدر "کھڑنا" کی ماضی یا اسم مفعول مان لیا جائے۔ "کھڑنا" کے معنے پنجابی میں چلنا اور ٹھرنا ہیں۔ پچھلے معنے کے اشعار ملاحظہ ہوں +

عبدالحکیم :۔

کہیا یک سن اساڈی گال کھڑکے — کہیا کوئی نہیں مَیں نال کھڑکے

دیگر ؂

بی بی سدیاں غلاماں سبھی ہزاراں — جو کھڑیاں ہر طرف لایاں قطاراں

دکنی میں اکبری عہد کے شعرا میں یہ مصدر موجود ہے۔ احمد دکنی ؂

کہاں تیں سوں تجھ نسبت کھڑے — جو ستی ہماری شرم ہیں پرے

دیگر ؂

اگر اپنی حد سے پرکٹ پڑے — پچھانے جدہاں کام آکر کھڑے

افسوس ہے کہ ایسا مفید اور کار آمد مصدر ہماری زبان سے متروک ہو گیا +

(۵) "تھا" اس غریب کو لغات نگاروں نے مصدر "ہونا" کا بسر خوانده بنا دیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ یہ "ہونا" کی ماضی ہے۔ جب یہ کہا جائے کہ ہونا کی ماضی "ہوا" ہے۔ تو وہ کہتے ہیں کہ ہاں وہ بھی ہے اور یہ بھی۔ سنسکرت اور پراکرت کی ٹٹی کی آڑ میں خدا جانے ہم سے کیا کیا قبولوایا جا رہا ہے۔ لیکن ایک موٹی سی بات یہ ہے کہ کیا یہ ضروری ہے کہ ہر لفظ سنسکرت کے ماخذ سے نکالا جائے۔ اب مَیں بجائے اس کے کہ "تھا" کو "ہونا" کے گلے باندھوں اور پھر ہونا کو سنسکرت کے "بھو" سے استخراج کروں۔ یہ زیادہ موزون سمجھتا ہوں کہ اس کو ملتانی زبان کے مصدر "تھیونا" (بمعنی ہونا) کی ماضی مان لوں۔ تھیونا کی ماضی تھیا آتی ہے۔ اردو والوں نے اسے یائے اشمام سمجھ کر اڑا دیا۔ اور تھا بنا لیا۔ تھیا اتنا قدیم ہے کہ ہندی کا سب سے قدیم جملہ جو ہمیں تاریخ میں ملتا ہے۔ اس میں موجود ہے۔

جملہ یہ ہے :-

"برکت شیخ تھیا اک مواک نھا" (تاریخ فیروز شاہی من شمس سراج عفیف ص۲۳۲) +

اس جملہ میں ایک خوبی یہ ہے کہ اسے سندھی بھی کہا جاسکتا ہے۔ پنجابی بھی اور اُردو بھی۔ سندھ پر محمد تغلق سنہ ۷۵۲ھ ابھی حملہ کر ہی رہا تھا کہ فوت ہوگیا۔ فیروز شاہ نے اپنی تخت نشینی کے بعد پھر سندھ پر حملہ کیا۔ لیکن فوج میں قحط اور جانوروں میں وبا پھیل گئی جس بنا پر وہ سندھ کا محاصرہ چھوڑ کر براہِ ریگستان گجرات روانہ ہوگیا۔ اس وقت ہمارا مورخ لکھتا ہے کہ سندھیوں نے یہ جملہ کہا۔ اس جملہ کا مطلب ہے کہ شیخ کی برکت سے ہمارا ایک دشمن مرگیا اور ایک بھاگ گیا +

پنجابی سے دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں :-

مولوی عبداللہ سے

اوّل صفت ثنا ربہنوں رب قدیر بعد رسول
پڑھو صلوٰتاں حضرت بھیجو دائم تھیو قبول (نص فرائض ص۵)

دیگر سے

حضرت سایہ زمیں نہ ہوندا حکمت بجھ کیہا ہے
مت سایہ نئے کو پیر دھرے سایہ منع تھیا (نص فرائض ص۶)

(۶) پنجابی میں بعض مصادر کی ماضی خلاف قاعدہ آیا کرتی ہے مثلاً کرنے۔ لینے دینے اور ہونے کی ماضی کیتا۔ دیتا۔ لیتا اور ہیتا بھی آتی ہے۔ جو واحد جمع اور تانیث کی صورت میں ملتی ہے۔ برج بھاشہ، راجستانی اور اودھی میں بالکل غیر مستعمل ہے لیکن قدیم اُردو میں کثرت کے ساتھ ملتی ہے۔ پنجابی کی مثالیں دینا فضول ہے اس لئے کہ آج بھی اس ماضی کا رواج عام ہے۔ لیکن میں اُردو کی مثالیں دیتا ہوں :-

احمد دکنی سے

اگیا نی دے گیان سینتیں جواب   دنیا ہور کیتا ادب سوں خطاب

دیگر؎

فرشتے جو آدم کوں سجدہ کیتے   سو یہ مان آدم بکن تھے لیتے   (لیلیٰ مجنوں)

محمد امین؎

نبی جا گے انہوں نے عرض کیتی   بڑائی رب نے تم کوں آج دینی

دیگر؎

جو کچھ تم نے لیا سو ہم نے لینا   جو کچھ تم نے کیا سو ہم نے کیتا   (یوسف زلیخا)

برج بھاشہ و دیگر زبانوں میں اس کے مقابلہ میں کینا۔ دینا اور کینو۔ دینو وغیرہ ملتا ہے

مثلاً سورداس؎

ڈھینی موڑ کت آپس میں شیام کھلونا کینو ری

سورداس پربھو برہم سانتن مت بنکاری دی ولینو ری

اور محمد جائسی؎

سوہنکے راج رجا بس دینھاں   تیں درسن کارن تپ کینھاں

لطف یہ ہے کہ یہ شکل بھی اردو میں رائج ہے۔ اگرچہ دکنی میں نہیں ملتی۔ محمد افضل جھنجھانوی[۵]

بہت مدت ہوئی آدن کینا   نہ کاگت ہی کسی کوں لکھ دینا   (بکٹ کہانی)

(۷) پنجابی میں قاعدہ ہے کہ غیر زبان کے الفاظ کے آخر میں اکثر ایک یائے زائدہ اضافہ کر دیا کرتے ہیں جس کے بظاہر کوئی معنے نہیں ہوتے۔ جیسے نظر سے نظری اور حیات سے حیاتی۔ چنانچہ عبدالحکیم؎

ہیں تیرے دامن اندر دست پایا   تیرے جیہا کوئی نظری نہ آیا

دیگر؎

آہی کھسانت خوش تہ انگوں حیاتی   پیا دنی زندگی عالم سہاتی

دکنی میں بھی یہ دستور موجود ہے۔ محمد قلی قطب شاہ سنہ ۹۸۹ھ سے

کھورات کن سات کہتی ہیں باتاں کہ چوتا ہے تم میں تیرے رنگ تماری

احمد دکنی قطب شاہی شاعر دربار محمد قلی قطب شاہ سے

تجھے نت من مت سوں شادی شراب برہ کی خماری نچے ہیں سو خواب (لیلیٰ مجنوں)

محمد امین سے

غمی دیکر خوشی کوں مار کاڑے زمانہ یوں مپیٹ عالم کوں پاڑے

ایضاً سے ہماری موت اوران کی حیاتی اگر ہوتی تو مجھ کوں لے خوش آتی

ایضاً سے غروری کا پیالہ جن پیا ہے انے اپنے سراوپر دکھ دیا ہے

ایضاً سے اگر یہ موت مجھ دیتا الٰہی انے یوسف کے تئیں دیتا پناہی

(یوسف زلیخا)

ولی دکنی سے

یہ خاک کربلا کی ہے نشانی توں سرخ ہوئیگا جس میں خانی (روضۃ الشہادتین)

یہ قاعدہ اُردو میں بہت دیر تک رہا ہے حتیٰ کہ خواجہ آتش کے ہاں بھی ملتا ہے چنانچہ

بہار گلستاں کی ہے آمد آمد خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

اور اب بالکل متروک ہے مجھے معلوم نہیں کہ اہل اُردو اس "ی" کی کیا توجیہ بیان کرتے ہیں ؞

(۸) مانگا تانگا اور مانگے تانگے ایک محاورہ ہے۔ اور اردو میں بالعموم مستعمل ہے اس کے لئے اہل لغات کہتے ہیں کہ:-

"مانگا تانگا - ۷ - صفت :- اول بمعنی مانگا ہوا۔ دوم تابع مہمل۔ قرض لیا ہوا۔ اُدھار لیا ہوا مستعار لیا ہوا۔ عاریتاً لیا ہوا" (فرہنگ آصفیہ)

اور مانگے تانگے کے لئے کہا ہے:-

"مانگے تانگے - ۷ - تابع فعل - مانگے ہوئے - مانگ تانگ کر - مستعار لے لواکر - اُدھار

لے لو اگر۔ جیسے مانگے تانگے کام چلے تو بیاہ کرے بلا۔ یعنی کام جب ہی چلتا ہے
جب اپنی گرہ سے صرف کیا جائے" (فرہنگ آصفیہ)

ہمارے لغت نگار تانگا اور تانگے کو تابع مہمل کہتے ہیں۔ اور مجھے نہیں معلوم اُن کے پاس اس کے کیا وجوہ ہیں۔ میں نے کئی دوستوں سے جنکا پایہ اردو میں بلند ہے دریافت کیا۔ بعض نے کہا کہ تانگا مہمل ہے۔ اور بعض نے کہا کہ عبارت میں موسیقیت پیدا کرنے کے لئے ایک ہموزن مصنوعی لفظ گھڑ لیا گیا ہے۔ قصہ مختصر اُردو میں ایسے بیسیوں الفاظ ہیں جن کو ہمارے اہل لغات نے بے معنے سمجھ کر تابع مہمل کی ذیل میں داخل کر دیا ہے +

جب ہم پنجابی زبان پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ با معنیٰ ہے۔ اور مصدر تانگنا سے مشتق ہے۔ اور مانگنا کا مرادف ہے۔ عبدالحکیم ؎

نہیں لیکن کسے دی تانگ اوسنوں ‏ ‏ عزیز مصر لائی سانگ اوسنوں

دیگر ؎ سنائی عشق تیری بانگ اوسنوں ‏ ‏ رہے ہر دم تساڈی تانگ اوسنوں

اور فعل کی مثال میں یہ شعر:-

زلیخا جے زلف دی تار تانگے ‏ ‏ کہے یوسف چھری لے کال تانگے (یوسف زلیخا)

(۹) اسی طرح چُپ چپاتے اور چُپ چپاتا ہے جس میں چپاتے کو اہل اُردو تابع مہمل مانتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ چپاتا محض حسن کلام کیلئے بڑھا دیا گیا ہے۔ اور بے معنی ہے لیکن جب پنجابی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بامعنی لفظ ہے کیونکہ اس زبان میں برخلاف اُردو کے وہ علیحدہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ عبدالحکیم ؎

جدن یعقوب اس گل نوں کھپایا ‏ ‏ عذر کہن کنوں ہویا چپاتا

چپاتا چپ کا مترادف ہے +

(۱۰) دن دہاڑے ایک اور محاورہ ہے۔ اہل اُردو دہاڑے کو بھی تابع مہمل مانتے ہیں اور حسب معمول غلط ہیں۔ دہاڑا درحقیقت پنجابی لفظ ہے۔ اور دن کے معنے دیتا ہے۔ اور

اُردو کے برخلاف تنہا مستعمل ہوتا ہے۔ عبدالحکیم سے

آیا چوتھے دہاڑے قافلہ گھیر ۔ شہر بِن کنول اس کھوہ دے پھیر

(۱۱) اسی طرح ہلنا۔ جُلنا اور ہِل جُل وغیرہ ہیں۔ اس میں اُردو خوان جُلنے کو ہلنے کا تابع مانتے ہیں جس کے کوئی معنے نہیں بتاتے۔ حالانکہ پنجابی میں جُلنا چلنے کے معنے میں آتا ہے اور آج بھی مستعمل ہے۔ قدمائے اُردو اس لفظ سے واقف تھے۔ امیر خسرو فرماتے ہیں سے

من کہ بر سر نمی نہادم گل ۔ یار بر سر نہاد و گفتا جُل

یہ محاورے ہمیں ان ایام کی یاد دلاتے ہیں جب کہ مسلمان لاہور سے کوچ کر کے دہلی جا کر آباد ہو گئے ہیں۔ اور اپنی زبان میں دہلی کی زبان کا پیوند لگا رہے ہیں۔ کیونکہ یہ محاورے ہندی الفاظ اور اُن کے مرادف پنجابی الفاظ سے مل کر بنتے ہیں۔ اسی قسم کے اور محاورے بھی ہیں۔ جیسے برتن بھانڈا یا باسن بھانڈا۔ گورا چٹا۔ بھلا چنگا۔ موٹا جھوٹا سنڈا مسٹنڈا ۔

(۱۲) یائے مخلوط قدیم زمانوں میں اُردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں ملتی ہے چنانچہ اُردو میں متروک ہے اور پنجابی میں اب بھی بدستور موجود ہے۔ اردو میں اب وہ صرف چار الفاظ میں ملتی ہے۔ جیسے کیا اور کیوں وغیرہ۔ یائے مخلوط افعال والفاظ میں اکثر آتی تھی۔ اور حرف ماقبل کے ساتھ مخلوط ہو کر تلفظ میں آتی تھی۔ مثلاً گکیا۔ منگیا۔ ہویا۔ پڑیا۔ رہیا۔ جلیا۔ چڑیا (چڑھا) کہیا۔ لیائی۔ چلیا۔ بڑیاں کا (بڑوں کا) جانیا۔ چھوٹیا۔ لکھیا۔ مانیا۔ سنگیار یا (سنگھارا) دیکھیا وغیرہ ۔

اِس قاعدہ کا دونوں زبانوں میں اس قدر زور رہا کہ غیر زبانوں کے الفاظ پر بھی اس کا اجرا ہونے لگا۔ مثلاً دنیا۔ دریا۔ اور خیال کی "ی" حرف سابق کے ساتھ ضم ہو کر بولی جاتی تھی۔ عبدالحکیم پنجابی سے

دسنے راہیں گذاریں اس طرح نال ۔ نہ ہووس ذور دلسوں بایہ داخیال

احمد دکنی سے

جو لیلیٰ دیکھی مائی تجھے یو غضب ۔۔۔ ادتھی دکھ دریا آگ کی موج تب

دیگر سے یہی ہے میرا حال اب سرد کال ۔۔۔ میرے حال کا خیال سٹ دیا نال

اور محمد امین دکنی سے

دیتے دیتے جب اس کا مال کھوٹا ۔۔۔ خلق سیتی تب اس کا خیال چھوٹا

بلکہ خیال کا لفظ خود میر نے اسی تلفظ کے ساتھ استعمال کیا ہے سے

عشق بجے ہی خیال پڑا ہے چین گیا آرام گیا
دل کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

میر صاحب نے حسب روایت مولانا آزاد خیال کی "ی" کے متعلق یہ عذر پیش کیا ہے :۔

"آپ لوجب اپنی کتابوں کے کہیں گے کہ خیال کی "ی" کو ظاہر کرو۔ پھر کہیں گے کہ "ی" تقطیع میں گرتی ہے۔ مگر یہاں اس کے سوا جواب نہیں کہ محاورہ یہی ہے" (آبحیات)

(۱۳) پنجابی زبان کی ایک عالمگیر خصوصیت یہ ہے کہ تمام ایسے الفاظ کہ جن میں ثانی حرف علت ہو۔ بہ تخفیف حرف علت تلفظ کیا جاتا ہے۔ مثلاً کان۔ ناک۔ ہاتھ اور لات پنجابی لہجہ میں کن۔ نک۔ ہتھ اور لت بن جاتے ہیں۔ یا یوں کہنا چاہیئے کہ ایسے الفاظ میں برج بھاشہ میں پہلے حرف کے بعد حرف علت اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً لگ پنجابی بھاشہ میں جاکر لاگ بن گئی اردو میں جو پنجابی اور بھاشہ کے بین بین ہے۔ اس قاعدہ کا اثر بہت نمایاں ہے۔ اور دونوں زبانوں کی مقلد ہے کبھی برج کی تقلید کرتی ہے اور کبھی پنجابی کی۔ اور کبھی دونوں کی۔ مثلاً اردو میں جگنا بھی بولتے ہیں۔ اور جاگنا بھی۔ لیکن اکثر موقعوں پر دیکھا جاتا ہے کہ اردو کا میلان زیادہ تر پنجابی قاعدہ کی طرف ہے

بھاشہ	پنجابی	اردو	بھاشہ	پنجابی	اردو
بیاکل	بیکل	بکل	کھیال	کھیڈ کھیل	کھیل

بھاشہ	پنجابی	اردو	بھاشہ	پنجابی	اردو
چاچا	چچا۔چاچا	چچا	ہاسا۔ہانسی	ہاسا	ہنسی
کاپوت	کپوتر	کپوت	چاکھنا	چکھنا	چکھنا
راسہے	رہو	رسہے	ماکھی	مکھی	مکھی
باندر	باندر	بندر	سانپ۔سرپ	سپ	سانپ
باجنا	بجنا	سجنا	دہاتورہ	دھتورا	دہتورہ
باٹی	بٹی		کاچا	کچا	کچا
بھانگ	بھنگ	بھنگ	ناہر	نہر	متروک ہے
ماچھر	مچھر	مچھر	پاتھر	پتھر	پتھر
پاکا	پکا	پکا	کاندھا	کندھا	کندھا
چھاڈو	چھڈو	چھوڑو	آگ	اگ	آگ
کھاٹا	کھٹا	کھٹا	جھوٹ	جھوٹھہ	جھوٹ
سانچ۔سانچ	سچ	سچ	تاکڑی	تکڑی	تکڑی
گاندھی	گندھی	گندھی	پاگ	پگ	پگڑی
گھانٹی	گھنٹی	گھنٹی	کانچلی	x	کینچلی
بادل	بدل	بادل بدل	بلائی	بلی	بلی
ہاڈی	ہڈی	ہڈی	آگے	اگے	آگے
پاچھے	پچھے	پیچھے	ماٹی	مٹی	مٹی
لادنا	لدنا	لادنا۔لدنا	کھاٹ	x	کھٹ۔کھاٹ
کھانڈ	کھنڈ	کھانڈ	بھانڈ	بھنڈ	بھانڈ
مانگن	منگن	مانگن	مونگ	منگ	مونگ

بھاشہ	پنجابی	اردو
ٹوٹنا	ٹٹنا	ٹوٹنا
جانواسہ	جوانسہ	جوانسہ
ساجی	سجّی	سجّی
کھیچڑی	کھچڑی	کھچڑی
آنڈا	آنڈا	انڈا
ماٹ	مٹ	ماٹ
چاکی	چکّی	چکّی
تانا	تنّا	تنّا
پانسلی	پسلی	پسلی
چھاج	چھج	چھاج
جاموں	جمّوں	جامون
پھول	پھُل	پھول
چولھا	چلھا	چولھا
گاڈی	گڈی	گاڑی
ماسہ	مسّا	مسّا
ہاٹ	ہٹ	ہاٹ
اوکھلی	اُکھلی	اوکھلی
ریچھ	رچھ	ریچھ
اون	اُن	اون
بوڑھا	بڈھا	بڈھا

بھاشہ	پنجابی	اردو
پاکنا	پکنا	پکنا
کڑی	لکڑی	لکڑی
آچھا	اچھا	اچھا
کانکر	کنکر	کنکر
چاول	چول	چاول
چالنی	×	چھلنی
کال	کل	کل
ڈھانکنی	ڈھکنی	ڈھکنی
پوتلی	پتلی	پتلی
آنب۔آم	انب	آم
ٹھیکری	ٹھکری	ٹھکری
ٹیکا	ٹکا	ٹیکا
تال	تل۔تلا	تال۔تالاب
جاٹ	جٹ	جاٹ
موکی	مکّی	مکّی
مول	مُل	مول
جھانگ	جھگ	جھاگ
کانگھی	کنگھی	کنگھی
آنگن	×	آنگن
کام	کم	کام

(۱۴) اُے۔ ایہ اَور اوہ اسماے اشارۂ قریب و بعید کے لئے پنجابی کے ساتھ مخصوص ہَیں۔ اَور آج بھی رات دن بولے جاتے ہیں۔ دکنی اُردو میں دونوں موجود ہیں۔ اَور وہی مقصد ادا کرتے ہَیں۔ پنجابی کی مثالیں دینے کی ضرورت نہیں۔ دکنی کی ذیل میں عرض ہَیں:-

محمد امین ؎

کدہیں روتی کدہیں ہستی رتی اُو　　کدہیں چپ اور کدہیں با تاں کتی او

دیگر ؎

کدہیں ہستے کے تئیں غمگیں کرے او　　کدہیں غمگیں کے دل شادی بھرے او

دیگر ؎ نہیں پھرتے اُسے کچھ لاگتی بار　　کدہوں اُے یار ہے کدہوں اُے اغیار

دیگر ؎ کہے اک گال میرے دیکھ تازہ　　نہیں اُے گال کچھ محتاج غازہ

(۱۵) حالتِ مجروری میں پنجابی میں کسی لفظ کے آخر "ؤں" بڑھا دیتے ہَیں مثلاً پچھوں ہاتھوں یعنی پیچھے سے اَور ہاتھ سے۔ عبدالحکیم ؎

پچھوں اس قیس کرڈی بیہوش ہوکے　　سوتی نازو نوڑے روئے دہوکے

دکنی میں بھی یہ قاعدہ موجود ہَے۔ مثلاً محمد امین ؎

بیٹی کا حال دیکھا آ کے نظروں　　مگر گئی ٹوٹ اس دہشت کی فکر دں

حالتِ ظرفیہ میں "ین" لفظ کے آخر میں پنجابی میں لگا دیا جاتا ہے۔ مثلاً عبدالحکیم ؎

رہا ہر فرد پیغمبر دا حیاپا　　دلے یوسف رہا بختیں سوایا

دکنی اردو میں بھی یہی دستور تھا۔ محمد امین ؎

بہت آرام تھا ساری خلق کوں　　نہ ماری کوئی اس راتیں ملک کوں

(۱۶) بعض خلاف قیاس جمع دکنی میں ملتی ہے۔ جو پنجابی کے بہت مطابق ہے مثلاً سات کی جمع سنیں۔ دو کی جمع دوہوں۔ اَور برس کی جمع براں۔ پنجاب میں یہ جمع یوں آتی ہَے

سٹے ۔ دوہوں آور دریاں۔ احمد دکنی جو محمد قلی قطب شاہ کے دربار کے شاعر ہیں لکھتے ہیں

جو احمد کرے آس دہر بن سنگار — سو اب شہ تھے پائے ستیں سنگار

دیگر ؎ رتن شعر کے ہیں دوہوں جگ امول — دوہوں جگ چھپاؤں رتن رول رول

اور محمد امین دکنی ؎

دو دو زخ کی اگن کوں رب نے دہوئی — کئیں لاکھوں دراں جل میں ڈبوئی

(۱۷) جب ہم مصدر کو منصرف کرنا چاہتے ہیں تو اُردو میں قاعدہ ہے کہ مصدر کے آخری حرف الف کو "ی" سے بدل دیتے ہیں مثلاً نکلنا سے نکلنے جانا سے جانے وغیرہ بنا لیتے ہیں۔ یہ قاعدہ پنجابی میں بھی موجود ہے۔ مثلاً عبدالحکیم ؎

لب ادس دے ترلبوں خوں کھاونے توں — کرے لب خندہ دل دچا ہونے توں

لیکن پنجابی میں زیادہ رائج طریقہ یہ ہے کہ مصدر کے آخری الف کو اسی مطلب سے گرا دیا جاتا ہے۔ مثلاً کہن لگیا۔ کہنے لگا۔ رون لگیا۔ رونے لگا۔ مارن لگیا۔ مارنے لگا وغیرہ۔

عبدالحکیم ؎

پچھے اُس دے لگے گوہر وساون — تصدق سر زلیخا دے کرادن

دیگر ؎ ہویا کنعان دے وچ کال ظاہر — تگی نکلن خلق دی جان باہر

اب قدیم اردو اس قاعدہ میں بالکل پنجاب کی ہمنوا ہے۔ محمد افضل جھنجھانوی متوفی ۱۰۳۵ھ

اگر غم ہے تجے میری اگن کا — کرو کچھ فکر پیارے کے ملن کا (بکٹ کہانی)

ولی دکنی ؎

کروں کیا وقت نیں ہے اب ملن کا — نکچھ فرصت ہے اب باتاں کرن کا (بیاض [illegible])

دیگر ؎ لگا دل جوں لوالا جل میں کانپن — لگا جوں نرسوں تاری منہ کو ڈھانپن

محمد امین ؎

رہی اس بات سوں عاجز ہو دائی — زلیخا کے اگل بولن نہ پائی

(۱۸) اکثر ایسے مصادر ہیں جو پنجابی اور اُردو میں مشترک ہیں لیکن یہاں بعض ایسے مصادر کا ذکر کیا جائیگا جو فی زمانہ اُردو میں متروک ہیں اور پنجابی میں رائج ہیں +

(الف) آکھنا = کہنا اور بیان کرنا اور دریافت کرنا پنجابی میں رائج ہے لیکن پُرانی اُردو میں یہ مثال۔ محمد امین دکنی ؎

حقیقت سب تیری میں تجھ کوں آکھی   نہیں اس ہی ہنر چھانی میں راکھی

(ب) سڑنا۔ پنجابی میں جلنے کے معنوں میں آتا ہے۔ پرانی اردو میں رائج تھا۔ محمد افضل جھنجھانوی متوفی ۱۰۳۵ھ ؎

اے آساں بنجا نوں عشق کرناں   نمن اس آگ موں ہرگز نہ سڑناں (بکٹ کہانی)

(ج) لوڑنا = ضرورت ہونا۔ پنجابی میں بالعموم آتا ہے۔ پرانی اردو میں موجود تھا۔ احمد دکنی ؎

کرے ایک نیکی تو دے دس ثواب   جو لوڑے زیادہ پے دے بےحساب (لیلیٰ مجنوں)

(د) اپڑنا = پہونچنا۔ دکنی کی مثال۔ احمد دکنی ؎

جو قاصد کیرے ہاتھ نامہ چڑیا   جو نوفل کے نیڑے ترت اپڑیا

(ہ) پچھانا = پہچاننا۔ پنجابی میں آج بھی پے کے بعد چھ لاتے ہیں۔ پُرانی دکنی اس بارہ میں پنجابی کے دوش بدوش ہے۔ محمد امین ؎

ستارے سعد اور سب نحس جانوں   سورج اور چاند کی گردش پچھانوں

دیگر ؎   پڑے جس کے سو سرا و پر سو جانے   مگر وہ حق تعالیٰ سب پچھانے +

شاہ میراں جی شمس العشاق شرح مرغوب القلوب میں فرماتے ہیں: ۔

"ہور یگانہ ہو اسالک اپڑتوں۔ بات تو بہوت کی کرتا یوں ہے۔ جوں چھالاں کا پانی جھوٹ ہے۔ اسے بند کی بی جھوٹ ہے۔ خدا کا پچھانت پائے (رسالہ اُردو حصہ بست و ششم ص ۱۸۹)

(و) سٹنا = پھینکنا۔ ڈالنا اور چھوڑنا پنجابی میں آج بھی موجود ہے۔ اور بطور فعل

وامدادی فعل رائج ہے۔ لیکن احمد دکنی :۔

سو جیوں عشق کے بند میں جا پڑیا نپٹ گیان سنکر شکل پکڑیا

دیگر ؎ مجھے لگ کتنے کرسٹ ڈے پرت پرت چھوڑ دینی کسے ہے سکت

محمد قلی قطب شاہ ؎

پنکھی سٹے ہیں سب پران ورو بھرلے سمندراں
چھوٹے ہیں سب اپنے گھراں دیکھو تو زاری والے دالے

(س) لبھانا = تلاش کرنا۔ دریافت کرنا۔ عبدالحکیم پنجابی کہتے ہیں ؎

کہا یک جو کوئی کھوا لبھا دیں اسی تج چاہ یوسف نو سٹا دیں

دکنی میں انہی معنوں میں آتا ہے۔ محمد امین ؎

یقیں جو کوئی اللہ بن لبھاوے مراداں وے کبھی جگ میں نپاوے

(ح) لانا = لگانا۔ آج بھی پنجابی میں ملتا ہے ! ور دکنی سے بہ مثال۔ احمد دکنی ؎

بہو دن کے ناموس کوں آگ لائی سہس برس کا ننگ ماٹی ملائی

اور محمد افضل جھنجھانوی ؎

سکھی کیسی سکھی ری پیہہ تپیا یا کوئل نے انب پر چڑھ شور لایا

(ی) پانا = ڈالنا پنجابی میں آج بھی موجود ہے۔ اور پرانی اردو سے بہ مثالیں۔

محمد امین :۔ ؎

خدا نے یوں انھوں کے دل میں پایا عزیز مصر نام اپنا بنا یا

دیگر ؎ تمہیں دل اس فکر کے بیچ نہ پاؤ اٹھو جیوں آئے ہو تیوں پھر کے جاؤ

(ک) لڑنا۔ پنجابی میں سانپ کے ڈسنے کے لئے آتا ہے۔ آج بھی کثرت سے بولا جاتا ہے۔ دکنی میں بھی انہی معنوں میں آتا ہے۔ احمد دکنی کہتے ہیں ؎

تیتے کیسر کالی سنبولی اڑے نہ اُتنے سبھ جگ منتر پڑھے (لیلےٰ مجنوں)

(ل) نسا پنجابی میں بھاگنے کے معنے دیتا ہے۔ کسی قدر اختلاف کے ساتھ دکنی میں
بھی ملتا ہے۔ احمد دکنی کہتے ہیں ؎

جو لیدان لسّے فقیران وراس   چلی سب فقیری جگت چھوڑ نھاس

محمد امین دکنی ؎

بلا کر لائے جا کر شاہ کے پاس   کہا مایا چراکر جاتے ہیں ناس

ولی دکنی ؎

دونوں ہاتاں اپس کے کھو گیا او   ننسنگ نھاسن لگا ہے سگ بچاو

میں اسی قدر پر اکتفا کرتا ہوں۔ یہ یاد رہے کہ ان مصادر میں سے بعض ممکن ہے کہ
برج یا گجراتی وادیوں میں مل جائیں۔ لیکن سب بحیثیت مجموعی نہیں ملتے۔ اس لیے ہم اس
قیاس میں حق بجانب نہیں ہیں کہ اُردو نے ان مصادر کو برج یا دیگر زبانوں سے لیا ہے
بلکہ ہمیں یہ ماننا ہوگا کہ یہ اس ذخیرۂ زبان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو مسلمان ابتدا میں پنجاب
سے لیکر دہلی آئے ہیں +

(۱۹) میں یہاں بعض ایسے الفاظ کا ذکر کرونگا جو پنجابی اور اُردو میں مشترک ہیں
اگرچہ اُردو میں اب مستعمل نہیں +

(الف) ول پنجابی میں طرف کے معنے دیتا ہے۔ دکنی میں اس کی ترکیب سے دُوَلاں
بمعنی دو طرفہ آتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ جو اکبر کا معاصر ہے اپنے ایک قصیدہ میں لکھتا
ہے ؎

دسے فانوس کے درمیانے تھوں یوں جوت دیوے کا
سو تیوں دستا دُولاں ہیں تھے میویاں کا برن سارا

(ب) نال = ساتھ پنجابی میں آج بھی موجود ہے۔ اُردو میں بالعموم رائج تھا۔
محمد افضل متوفی ۱۰۳۵ھ ؎

بسا بہ تخت اوپر ناریاں لے   پیا کے نال بیٹھی ساریاں لے

محمد امین دکنی سے

ہنسے بسے خوشی ہو کے ہموں نال   ہموں اس کو بھی راکھے خوش و خوش حال

دیگر سے انے بھی سات خوشے نیل کنچال   اتنے بھی سات سو کھے تھے انوں نال

(ج) کان پنجابی میں بمعنی "واسطے" و "لئے" آتا ہے۔ اور دکنی میں بھی یہی معنے دیتا ہے۔ عبدالحکیم پنجابی سے

سونہراں نے ادسے تائیں لیا کھاہ   میں ہاں حیران ادسے کان لے شاہ

احمد دکنی قطب شاہی سے

سو کچھ ماں مانس کوں کیتا عطا   جو سب کچھ اسی کان پیدا کیتا

دیگر سے جت میں سدا برہ کا دکھ دکھوں   مرے کان جھگڑا روا کیوں کھوں

(د) کیچڑ کو پنجابی میں چکڑ کہتے ہیں۔ دکنی میں بھی چکڑ آتا ہے۔ احمد دکنی قطب شاہی سے

بڑے جو رکت ہور چکڑ میں پڑے   پنکھی جو سٹے کاٹ سو تر پڑے

دیگر سے پچھاڑی جو کھا کر ابی بی بڑیا+   رکٹ ہور ماٹی چکڑ میں پڑیا

(ہ) گھیو۔ پنجابی میں گھی کو کہتے ہیں۔ پرانی اردو میں یہ لفظ بھی آتا تھا۔ میر جعفر زٹلی عہد عالمگیر و شاہ عالم کے مصنف ہیں۔ ان کے ہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ سے

ترے ہمیشہ گھیو کو سبھاے راکھے جیو کو   جیسا پپیا پیو کو یہ نوکری کا حظ ہے

(ز) چوہڑا بمعنے خاکروب پنجابی لفظ ہے۔ میر جعفر کے ہاں یہ لفظ بھی ملتا ہے

سے دبے پر کیا چوہڑے کو سلام   نہ پوچھا حلال اور نہ پوچھا حرام

(ح) کھیر۔ ملتانی میں دودھ کے معنوں میں آتا ہے۔ قدیم اساتذۂ دکن بھی اسی معنی میں لاتے ہیں۔ میراں جی شمس العشاق سے

تھاں دیکھنیں لاگا بالک کچھ نہ آوے کھیر+   جس کے انگو بھرم نہ جاوے اس کیوں کہنا پیر

دیگر سے راج دہن کو دیویں مان کر تیوں نفیر   جرم نہ چاکھے تاک جنہ وہ کیا بوجھیں کھیر

(۲۰) یہاں ایسے الفاظ مذکور ہیں جو پنجابی لہجہ میں اُردو میں مستعمل رہے ہیں۔

(الف) منگنا پنجابی لہجہ میں ہے۔ اُردو میں ہم مانگنا کہتے ہیں۔ دکن میں یہی لہجہ رائج ہے۔ احمد دکنی ؎

سرفراز کرنے منگیا توں منجے　　　خداوند اس کا جزا دے تجھے

اور محمد امین دکنی ؎

زلیخا نے شکر رب کا کیا تب　　　جو میں تجھ کن منگا سو مجھ دیا سب

(ب) بندنا = باندھنا پنجابی لہجہ میں بندنا یا بننا ہے۔ اہل دکن بھی بندنا بولتے تھے۔ مثلاً معراج العاشقین:۔

"کعبہ کو نسبت بندنا میراج"۔

(پ) ہنسنا پنجابی میں بتخفیف نون غنہ آتا ہے یعنی ہسنا۔ اہل دکن بھی ہسنا بولتے تھے۔ محمد امین دکنی ؎

سو تب یعقوب کے یوں دل میں آیا　　　یوسف کو نیند بھیتر کن ہسایا

دیگر ؎　　یوسف جاگے تو تب پوچھا پدر نے　　　سپن بھیتر ہسایا تجکوں کن نے

(ت) ٹٹنا = ٹوٹنا۔ پہلا پنجابی ہے اور دوسرا اُردو۔ اہل دکن نے دونوں طرح سے لکھا ہے۔ احمد دکنی ؎

پرت جوڑ وہ ٹوٹے دل جو جوڑے　　　نہ ٹوٹے جو آکاس ٹٹ کر پڑے

(ٹ) پٹی = پاٹی بمعنی تختی و لوح۔ دکنی پنجابی لہجہ میں پٹی لکھتے ہیں۔ احمد دکنی ؎

پرت حرف تیں تن سبہ کر پٹی　　　کہاں گود میں دھر سکے وہ پٹی

(ث) ہتھ = ہاتھ اہل دکن پنجابی طرز میں بھی لکھتے ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ ؎

حضرت نبیؐ کے گیسواں دونوں اماماں کے پگاں

جبرئیل جھلاوے اپ ہتاں آرات ساری وائے وا

(چ) بُھکا = بھوکا۔ محمد قلی پنجابی لہجہ میں باندھتا ہے ؎

دو نور دیدے بی بی کے آخر دیکھو کیوں دکہ دکھے

لہو میں پڑے پیاسے بُھکے دیکھو یہ خواری ڈالے وا لے

(چ) ڈبنا = ڈوبنا۔ دکنی پنجابی لہجہ سے بھی واقف ہیں۔ احمد دکنی ؎

جو ڈبتا نکلتا دسے جگ میں سور ... سو مشرق پھرا ہو دیں نزدیک دور

(ح) بھین = بہن۔ دکنی بھین ہی لکھتے ہیں۔ محمد امین ؎

چلے تب بھین کے گھر کو خوش حالی ... جبیں دو دکھ دو دہل اس صاحب نے ٹالی

(خ) حکیم یوسفی دسویں صدی ہجری کے مشہور مصنف ہیں۔ طب ان کا میدان ہے جس میں کئی تصنیفات یادگار چھوڑیں +

جناب سید مسعود حسن رضوی۔ ایم۔ اے لکچرار لکھنؤ یونیورسٹی اپنے مضمون اُردو کے منظوم لغت (خیابان لکھنؤ۔ بابتہ جنوری ۲۷ سنہ ء) میں حکیم یوسفی کے ایک قصیدہ کا ذکر کرتے ہیں جو "قصیدہ در لغات ہندی" کے نام سے موسوم ہے۔ اس قصیدہ میں کل چوالیس ابیات ہیں جن میں سے چند سید صاحب نے اپنے مضمون میں نقل کئے ہیں۔ وہاں سے میں دو شعر یہاں نقل کرتا ہوں ؎

جیبھ کن آمد زبان و گوش دارمی ریش داں ... موچھ را میخواں بروت و کانہ کوردہ بہرہ کر

ہست پیشانی متہ سینہ چھتی دست است ہت ... موہ روی دچل رواں شو بیٹ بنشیں دک نگر

ان اشعار میں یہ الفاظ پنجابی لہجہ میں ہیں :-

کن۔ متہ۔ چھتی۔ ہت۔ موہ۔ دک = کان۔ ماتھا۔ چھاتی۔ منہ۔ دیکھ۔

(د) ہور = اور۔ یہ لطفہ آج بھی پنجابی میں مستعمل ہے۔ اُردو سے خارج ہو گیا ہے لیکن قدمائے اُردو کے استعمال میں عام طور پر تھا۔ محمد قلی قطب شاہ ۱۰۲۰ھ

سمدور ہے یک ہور ندیاں ہیں سو ہزار ... باناں سو کروڑاں ہیں وئے ٹیک رس ہے

(ڈ) لوک = لوگ پنجابی میں کاف ہے اور اُردو میں گاف لیکن اُردوئے قدیم میں کاف ہی تھا۔ چنانچہ شاہ برہان الدین خانم متوفی سنہ ۹۹۰ھ؁

سبے ہوویں لوک عوام بے مرشد بے نیام

احمد دکنی ؎

جو لیلیٰ کے لوکاں سُنی یہ خبر سنواری صدر ترت سنز گاہ گھر

(ذ) جوک = جونک۔ اہل دکن پنجابی لہجہ میں لکھتے رہے ہیں۔ محمد امین دکنی ؎

لگے بھوکوں سے مرنے وے سبھی لوک مریں یونکے کر جوں بھوکے مریں جوک

(س) پنجابی اور اُردو میں بعض حروف آپس میں تبدیل ہو جایا کرتے ہیں مثلاً پنجابی کی "واو" اُردو میں "بے" سے بدل جاتی ہے :-

پنجابی	اُردو	پنجابی	اُردو	پنجابی	اُردو
ویچنا	بیچنا	وچھانا	بچھانا	ویری	بیری
وال	بال	وٹا	بٹہ	ورنا	برنا
ورناوا	برناوا	ویاج	بیاج	ویھٹ	بیھٹ
واگاں	باگاں جمع باگ	ویہڑ	بیہڑ	وچارا	بچارہ (بیچارہ)
وچار	بچار	وجلی	بجلی	وگھ	بیگھ
وکانا	بکانا	وسنا	بسنا	وین	بین
وگاڑ	بگاڑ	واری	باری	ورف	برف
وار	بار	ور	بر	والا	بالا
والی	بالی	وچ	بیچ ، بچ	وچنا	بچنا
وِکاؤ	بِکاؤ	وللا	بللا	ویر	بیر
وساکھ	بیساکھ	وسرنا	بسرنا	وِس	بِس (زہر)

پنجابی	اُردو	پنجابی	اُردو
وات	بات	وٹی	بتی

(ش) پنجابی کی "ہے" اُردو میں "سین" سے بدل جاتی ہے :-

پنجابی	اُردو	پنجابی	اُردو	پنجابی	اُردو
کیہا	کیسا	جیہا	جیسا	کہیں	کسی
اوہ	اوس	ایہہ	اس	ورہ	برس
ترہیہ	ترس	ورہیا	برسا	ورہدا ہے	برستا ہے
سوہرا	سسرا	پھاہیں	پھنسا	تیہہ	تیس
ویہہ	بیس	چالیہہ	چالیس	گھاہ	گھاس
		سرہوں	سرسوں		

(ط) پنجابی کی "ہے" اردو میں "الف" سے بدل جاتی ہے :-

پنجابی	اُردو	پنجابی	اُردو	پنجابی	اُردو
ہک	ایک	ہور	اور	ہسوار	اسوار

(ق) پنجابی کی "ڈال" اُردو میں "تے" سے بدل جاتی ہے :-

پنجابی	اُردو	پنجابی	اُردو
وہاگا	تاگا	ماردا	مارتا

(س) بعض الفاظ میں حروف مقدم مؤخر ہو جاتے ہیں :-

پنجابی	اُردو	پنجابی	اُردو	پنجابی	اُردو
کوڑا	کڑوا	پھڑنا	پڑھنا	چکڑ	کیچڑ
پچھان	پہچان	بھَین	بہن	اناچک	اچانک
		سہرند	سرہند		

قدیم اُردو پر پنجاب کا اثر

اُردو پر قدیم زمانوں میں پنجابی لہجہ غالب تھا۔ اس کا ثبوت دینا موجودہ حالات میں بہت دشوار ہے۔ اس لئے کہ ان ابتدائی زمانوں کے جبکہ مسلمان لاہور سے ہجرت کر کے دہلی میں آباد ہوئے ہیں۔ نیز اس کے بعد کی تین صدیوں تک کے کوئی کتابی نمونے ہم کو نہیں ملتے۔ نہ ہم کو یہ علم ہے کہ اس عہد کی برج اور پنجابی میں کیا فرق تھا۔ الغرض برج پنجابی اور اُردو کے نمونوں کی عدم حاضری سے ہمارا کام بہت مشکل ہو گیا ہے۔ یقینی ہے کہ جب مسلمانوں کا کثیر گروہ قطب الدین ایبک کے ساتھ شمال سے ہجرت کر کے دہلی آیا ہے تو اپنے ساتھ پنجاب سے کوئی نہ کوئی زبان ضرور لے کر گیا ہے۔ آیا یہ زبان موجودہ پنجابی کے مماثل تھی۔ یا اس کی کوئی شاخ تھی۔ جواب معدوم ہے۔ ہم اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ بہرحال یہ زبان برج اور اس کی ہمسایگی میں ایک عرصۂ دراز تک رہنے سہنے کے باعث بدلنی شروع ہوئی ہے +

برج اور موجودہ پنجابی کا اصولی فرق گذشتہ سطور میں دکھا چکا ہوں۔ پنجابی کے اکثر الفاظ میں حرف علت کو جب کہ حرف ثانی واقع ہو گرا دیا جاتا ہے۔ اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب ہم فارسی کی تصنیفات اور تاریخوں کی ورق گردانی کرتے ہیں جن میں اتفاقیہ ہندی لفظ آ جاتے ہیں۔ اور ان الفاظ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں پنجابی کا دہلی کی زبان پر خاصہ اثر تھا۔ مثلاً پہلا ہندی لفظ جس پر ہماری نظر پڑتی ہے "لک" یعنی لاکھ ہے چنانچہ فارسی خوان اب تک لک ہی بولتے ہیں۔ قطب الدین ایبک کو لک داتا کہا جاتا تھا۔ اب لک پنجابی لہجہ میں ہے +

اُردو میں چارپائی کو ہم کھاٹ کہتے ہیں پنجابی لہجہ میں اگر اس کو لکھا جائے تو کھٹ ہوگا۔ اب مولانا ابراہیم فاروقی صاحب شرفنامہ نویں صدی ہجری کے مصنّف جو بنگالہ کے رہنے والے ہیں لکھتے ہیں :-

"کت ۔ بالفتح تخت میاں بافتہ اہندکھت نامند"

مولانا فخرالدین مبارک قواس غزنوی جو ہندوستان میں فارسی لغات نگاروں کے باوا آدم ہیں۔ اور عہد علاء الدین خلجی کے شاعر ہیں۔ اپنی فرہنگ میں اسی لغت کے لئے کہتے ہیں :-

"کت ۔ تخت ہندواں باشد میاں بافتہ"

تاریخ سیرالاولیا میں جو تغلقوں کے عہد کی تصنیف ہے یہ لفظ بار بار ہمیں ملتا ہے! در ہر بار کھت کی شکل میں ملتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ایام میں اہل دہلی کھاٹ کو کھٹ کہتے تھے یعنی پنجابی لہجہ میں بولتے تھے +

پاگ بمعنے پگڑی۔ ایک اُدر بھاشہ کا لفظ ہے۔ اس کی پنجابی شکل "پگ" ہے! اب امیر خسرو دہلوی باوجودیکہ دہلی میں پرورش پاتے ہیں۔ اور مسلمانوں کو دہلی میں آباد ہوئے اس وقت تک ایک صدی گذر گئی ہے۔ تاہم پگڑی کو پنجابی شکل میں "پگ" لکھتے ہیں۔ چنانچہ سے اے دہلی وائے بتاں ساده پگ بستہ و چیرہ کج نهاده

ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروزشاہی میں صفحہ ۲۴۱ پر ملک فخرالدین کھنڈا اور ملک رکن الدین انبہ کے نام نظر آتے ہیں۔ ان ناموں میں کھنڈ اور انبہ عرفی یا تمیزی نام ہیں۔ اس عہد میں کچھ اسی قسم کے عرف ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک امیر "ہرن مار" کے نام سے منسوب تھا دوسرا امیر "تورا بانڈ" کہلاتا تھا۔ اب بھاشہ میں کھنڈ کو کھانڈ۔ اور انبہ کو آنب یا آم کہتے ہیں۔ لیکن ان امرا کے ناموں کے ساتھ کھنڈ اور انبہ مذکور ہونے سے واضح ہوتا ہے کہ اس عہد کے مسلمان کھانڈ کو کھنڈ اور آم کو انب پنجابی لہجہ میں کہتے تھے۔ اس سے ثابت

ہوتا ہے کہ ان ایام میں دہلی کے مسلمانوں میں پنجاب کا لہجہ غالب تھا۔ کھنڈا اور قند کا ماخذ ایک ہی معلوم ہوتا ہے ۔

ہم برج بھاشا کے لہجہ کے مطابق اُردو میں نقّال کو بھانڈ کہتے ہیں لیکن ہمارے اسلاف پنجاب کے لہجہ میں بھنڈ کہتے تھے ۔ اور اس سے "بھانڈپن" کا مفہوم ادا کرنے کے لئے "بھنڈائی" بنا لیا ہے۔ چنانچہ ضیاء برنی کہتا ہے :۔

"از سخن مسخرگاں و بھنڈائی بھنڈاں و بوالعجبی بازیگراں و بے شرمی نادشتاں کہ از اطراف ممالک بدرگاہ رسیدہ بودند و در اطراف سراپچہ سلطانی بازی میکردند و ہنرہائے خود می نمودند و داد سخن میدادند و نادشتی و بھنڈائی را بنہایت میرسانیدند"

(تاریخ فیروز شاہی ص ۱۶۳)

یہ الفاظ ثابت کرتے ہیں کہ ان ایام میں دہلی پر پنجابی لہجہ غالب تھا ۔

اسی مصنف کے ہاں ایک اور مقام پر یہ عبارت ہے :۔

" درچندیں مواضع برہ چوزہ بندانیدہ بودند و چھپر انداختہ و چاہ ہا کاوایندہ و مٹہ ہا و سبوہا پر آب و آفتابہ ہائے گلیں مرتب داشتہ و بوریا ہا فراز کردہ"

مٹہ پنجابی میں ماٹ یا گول کو کہتے ہیں ۔

ضیاء برنی کے ہاں یہ فقرہ بھی آتا ہے :۔

" و آخر کار احمد ایاز را لرزہ در اندام افتاد و دلش دریاک شد و زہرہ ترقیدن گرفت و از شدت خوف و غلبۂ ہراس پگ در گردن انداختہ و سر محلوق را برہنہ کردہ در پیش درگاہ سلطانی آمد" (تاریخ فیروز شاہی ص ۵۴)

ہم دیکھتے ہیں کہ برنی بھی امیر خسرو کی طرح پگڑی کو پگ ہی لکھ رہا ہے۔ یہ یاد رہے کہ پگ بھاشا میں پاپوش کے معنے میں مستعمل ہے ۔

اسی تاریخ میں ایک اور موقعہ پر یہ فقرہ آتا ہے :۔

"ودرخان کھرنی وجموں وخرمائے ہندوی وبڑہال وسنبل وپیپل وکل نہال خواہند کرد" (صفحہ ۵)

برنی یہاں "جموں" پنجابی طرز میں لکھ رہا ہے۔ ہم آج کل بھاشہ کی تقلید میں جامن یا جامون کہتے ہیں۔

تاریخ فیروز شاہی میں شمس سراج عفیف فیروز شاہ خلجی کے شکار کے ذکر میں فقرۂ ذیل لکھتا ہے:-

"وبعضیں اگر در تلے ودہندے ماہی بودے شہنشاہ فرمودے کہ آں ماہیاں گراں کہ بالائے پیل بارکردہ مے بردند آں ماہیان در آں تل ودہند انداز ند" (صفحہ ۳۲۸)

اس فقرہ میں تل اور دھند پنجابی ہیں "تل" تال یعنے تالاب کی پنجابی شکل ہے۔ خالق باری میں تال آتا ہے:-

رایت لوا نیزہ بود اسپر است ڈہال　　　لب آب ندی حوض دگر سر دراست تال

ڈھنڈ ملتانی لفظ ہے جو بڑے اور گہرے تالاب یا جھیل کے معنے دیتا ہے۔ اب یہ لفظ ایسا ہے کہ آج پنجاب میں بھی عام طور پر لوگ اس سے واقف نہیں ہیں اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ دہلی میں ان ایام میں بولا جا رہا تھا۔ تو ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ پنجاب کا اثر دہلی پر کس قدر زبردست ہوگا۔

ہم آج کل دیوچہ کو جونک با نون غنہ بولتے ہیں۔ پنجابی تکلم کے مطابق جیسا کہ اس سے قبل عرض کر چکا ہوں یہ لفظ جوک ہے۔ اہل دکن بھی جوک کہتے تھے۔ دکن کے علاوہ باقی اُردو خوان دنیا بھی جوک ہی کہتی تھی۔ چنانچہ صاحب شرف نامہ ابراہیم فاروقی قرن نہم ہجری کے بنگالی مصنف کہتے ہیں:-

"دیوچہ۔ ہندش جوک گویند"

آج ہم جونک بولتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ بعد میں بھاشہ کے اثرات میں ہم نے لہجہ

اختیار کیا ہے ۔

صاحب شرف نامہ کلاوہ کی تشریح میں کہتے ہیں :۔

"کلابہ و کلاوہ "ہند" "اتی" "نامند" ۔

اب اٹی پنجابی ہے۔ برج میں آنٹی ہے۔ اُردو میں غالباً دونوں لہجے رائج ہیں یعنے وہ اٹی بھی کہتے ہیں۔ اور انٹی بھی البتہ برج کے لہجہ میں اتنی اصلاح کر دی ہے کہ آنٹی کے مدکو ترک کر دیا ہے ۔

گاڑی کو پنجابی گڈی کہتے ہیں۔ صاحب شرف نامہ کہتے ہیں :۔

"گردوں ، چرخ ۔ ہند گڈی خوانند"

یہاں پھر صاحب شرف نامہ پنجابی لہجہ میں لکھ رہے ہیں۔ اسی طرح گڑیا کے واسطے مصنّف موصوف کہتے ہیں :۔

"لعبت ۔ لعبت دختر کاں وآں صورت کہ از جامہ سازند ۔ ہند گڈی گویند"

گڈی پنجابی میں گڑیا کو کہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس عہد میں عام مسلمان اس لفظ کو پنجابی لہجہ میں بول رہے تھے ۔

چقندر کے ذکر میں بھی مصنّف فرماتے ہیں :۔

"سبزہ ایست مثل ترب کہ آنرا شلغم گویند ۔ ہندش گانگو نامند"

اہل پنجاب آج بھی شلغم کو "گونگلو" کہتے ہیں ۔ یہ یاد رہے کہ صاحب شرف نامہ بنگالہ کے رہنے والے ہیں۔ اور انہیں پنجاب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بنگالہ میں شلغم کو آج کل شلگم ہی کہتے ہیں جب اس عہد کے مسلمان عام طور پر گانگلو کہہ رہے ہیں۔ تو کیا یہ پنجاب کا اثر اُردو پر ظاہر نہیں کرتا۔ بعد کے اثرات میں ہم نے گونگلو کہنا ترک کر دیا ہے۔ اور شلغم کہنے لگے ۔

ہنو ماش کے ذکر میں بھی مصنّف حوالۂ قلم کرتے ہیں :۔

"بنو ماش بالضم و نام غلہ کہ ہندش منگ نامند"۔

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

"مزور آشامے است کہ مریض را دہند چنانچہ دریں ولایت مثلاً از برنج و منگ آشام

سازند و در خراسان از شکر و نار دہند"

اس عہد تک گویا مونگ کو پنجابی طرز میں مسلمان مُنگ کہتے رہے۔ لیکن صاحب مویدالفضلا جو دسویں صدی ہجری کے مصنف ہیں۔ اس کو صاف مونگ لکھتے ہیں۔ اور جب سے اب تک ہم مونگ ہی بولتے آئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس لفظ کے متعلق دسویں صدی میں مقامی لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔

اہل پنجاب سیسہ کو سکّا کہتے ہیں۔ چنانچہ نصاب ضروری:۔

ارزیز قلعی سرب ہے سکّا   سطبر ٹھلا باریک نکّا

اور ہم آج اردو میں سیسہ بولتے ہیں۔ چنانچہ اسمائے فارسی:۔

آنک سرب سیسہ کو جانو   رانگے کو ارزیز بکھانو

لیکن حکیم یوسفی جو دسویں صدی ہجری کے پہلے ربع کے مصنّف ہیں۔ اپنی تصنیف ریاض الادویہ میں آنک کا ہندی مرادف سکہ بتاتے ہیں۔ ان کے کچھ عرصہ بعد صاحب مویدالفضلا آنک کی تشریح کے وقت دونوں لفظ یعنی سکہ و سیسہ دیتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اہل اردو و اہل پنجاب کی طرح ابتدا میں سکہ کہتے رہے ہے۔ بعد میں سیسہ کہنے لگے۔ اور سیسہ ہی آخر کار غالب رہا۔

اردو میں برج لہجہ سے پنجابی لہجہ کا سخت مقابلہ رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی وقت میں ایک لفظ دونوں لہجوں میں بولا جا رہا ہے۔ مثلاً بادل اور بدّل۔ بازار اور بزار۔ چھاج اور چھج۔ صاحب ظفر نامہ سکندر ۸۶۴ و ۸۷۹ھ آتش کے بیان میں لکھتے ہیں کہ:۔ "ہندستا خوانند"۔

لیکن صاحب مؤید الفضلا ۹۲۵ھ اسی لفظ کے ذکر میں کہتے ہیں کہ "ہند ماسہ گویند" اور ہم آج مساہی بولتے ہیں۔ یہاں گویا پنجابی لہجہ غالب رہا۔ تاریخ فیروز شاہی میں جموں بلہجۂ پنجابی آیا ہے۔ لیکن صاحب مؤید الفضلا الوسیہ کے بیان میں اس کا ہندی مرادف جامن دیتے ہیں چنانچہ آج بھی جامن یا جامون بولا جاتا ہے۔ یہاں دیکھا جاتا ہے کہ برج کا لہجہ غالب رہا۔ اسی طرح اشترخار کے ذکر میں صاحب شرف نامہ کہتے ہیں "وہند اوراجواسہ گویند" لیکن مصنف مؤید الفضلا کا بیان ہے کہ "ہندش جانواسہ گویند"۔ ہم آج جوانسہ یا جواسہ کہتے ہیں اور پنجابی لہجہ کے مقلد ہیں۔

لفظ درائے کے متعلق صاحب ادات الفضلا ۸۲۲ھ کا بیان ہے کہ "اہل ہند آنرا گھنٹی گویند"۔ لیکن صاحب شرف نامہ ۸۶۴ھ و ۸۷۹ھ کا قول ہے کہ "درائے جرس ہندش گھانٹی خوانند"۔ ہم آج گھنٹی کہتے ہیں۔ صاحب شرف نامہ کے ہاں اور ایسے الفاظ ملتے ہیں۔ جو برج لہجہ میں ہیں۔ مثلاً تسمہ کے بیان میں "پاٹی" شخار کے ذکر میں ساجی شہمک کی تشریح میں ہچکی اور تشنی کے بیان میں "ساہی" علیٰ ہذا "چاپاتی" آج ہم ان الفاظ کا تلفظ پنجابی لہجہ کے موافق۔ پٹی۔ سجی۔ ہچکی۔ سہی۔ اور چپاتی کرتے ہیں۔

حکیم یوسفی نے ریاض الادویہ میں منجملہ اور ہندی الفاظ کے جو ہندی اور پنجابی میں مشترک مانے جا سکتے ہیں یہ الفاظ بھی دئے ہیں۔

"لانی۔ انب۔ تمّاں۔ کونج۔ آنڈہ۔ آملی۔ آرنڈ۔ ماکھی۔ کانچلی۔ بلائی۔ ہاڈ۔ ساجی"

ان میں پہلے چار تو خالص پنجابی ہیں۔ باقی تمام برج کے لہجہ میں ہیں۔ جن کو آج ہم انڈا۔ املی۔ ارنڈ۔ مکھی۔ کینچلی۔ بلّی۔ ہڈی۔ سجی بلہجۂ پنجاب ادا کرتے ہیں۔

میں خالق باری سے اور مثالیں دیتا ہوں مثلاً:۔

ٹاٹی۔ پاتھر۔ چالنی۔ چاکی۔ کال۔ تاتا۔ ڈھاکنی۔ چاکھ۔ ماکھی۔ مانچھر۔ کانکر۔ ہانسی۔

پوتلی۔ پانسلی +

جنہیں آج ہم پنجابی لہجہ میں ہٹی۔ بچھر۔ چلنی۔ کل۔ ننا۔ ڈھکنی۔ چاکھ۔ مکھی۔ مچھر۔ کنکر ہنسی۔ پتلی۔ پسلی کہتے ہیں +

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بالکل ممکن ہے کہ پرانی برج میں اور پنجابی میں کوئی فرق نہ ہو۔ اور برج میں حروف علّت کا اظہار بعد کی نشو و نما ہو۔ اس کے متعلق ہم اتنا جانتے ہیں کہ پنجابی میں یہ قاعدہ یعنی حروفِ علت کی تخفیف تقریباً مسلمانوں کی ہند میں آمد کے وقت بھی موجود تھا۔ عرب سیّاحوں نے بعض ہندی الفاظ کا ذکر کیا ہے۔ جن میں انبہ اور زط بھی شامل ہیں۔ پنجاب میں انبہ آج بھی بولا جاتا ہے۔ باقی رہا زط یہ پنجابی لفظ جٹ کی معرب شکل ہے۔ اردو میں برج کی تقلید میں جاٹ بولتے ہیں۔ یہ ایک جنگجو قوم کا نام ہے۔ جو اُن ایام میں سندھ و پنجاب میں کثرت سے آباد تھی۔ ایرانی بتقلید پنجاب جت کہتے ہیں۔ چنانچہ ابوالفرج رونی :۔

گرد افغان و جت بر غبتِ حرص　　پیدہ زد موکب سوار ملک

اِن مثالوں سے ظاہر ہے کہ قدیم زمانوں میں پنجاب کا اثر اُردو پر بہت نمایاں تھا۔ لیکن جُوں جُوں وقت گزرتا گیا۔ یہ اثر رفتہ رفتہ زائل ہوتا گیا +

سطور آیندہ میں برج بھاشہ کی بعض خصوصیّات درج کی جاتی ہیں تاکہ قارئین کرام اُردو پنجابی اور برج زبانوں کے فرق کو معلوم کر سکیں۔ اور یہ رائے قائم کر سکیں کہ آیا اُردو زبان پنجابی کے قریب ہے یا برج کے +

برج بھاشا

دراصل ضلع متھرا کی زبان ہے جہاں سے نکل کر اس نے بہت وسعت اختیار کر لی ہے یعنی جنوب میں تمام ضلع آگرہ اکثر علاقہ ریاست بھرتپور۔ دھولپور اور قرولی مغربی علاقہ ریاست گوالیر اور مشرقی علاقہ ریاست جے پور میں پھیلی ہوئی ہے۔ شمالاً گڑگانوہ کے مشرقی حصہ میں۔ شمال مشرق میں دوآبہ۔ بلند شہر علیگڈھ۔ ایٹہ۔ مین پوری میں اور گنگا پار۔ بدایوں۔ بریلی اور ترائی پرگنہ نینی تال میں بولی جاتی ہے۔ اور مختلف مقامات پر مختلف نام رکھے گئے ہیں مثلاً مشرقی علاقہ میں جہاں قنوجی زبان سے اس کا اتصال ہوتا ہے انتر بیدی کہا جاتا ہے۔ گوالیار کے شمال مشرقی گوشہ میں جو دھولپور کے متوازی ہے اور جہاں سیکر واڑ راجپوت آباد ہیں سیکر واڑی، قرولی کے میدانی علاقہ اور بعض علاقہ گوالیار میں چمبل پار جادو بانی کہتے ہیں۔ اس لئے کہ اس علاقہ میں اس نام کی راجپوت قوم آباد ہے۔ بھرتپور کے جنوبی علاقہ۔ قرولی خاص اور مشرقی علاقہ جے پور میں جو ڈانگ کے نام سے موسوم ہے۔ ڈانگی کہتے ہیں۔ اور پھر اس کی مقامی تین تقسیمیں ہیں یعنی ڈونگر واڑا۔ کالی مال۔ اور ڈانگ یا نگ۔ علاقہ نینی تال میں اس کا نام بھکسا ہے۔ قدیم زمانہ سے برج بھاشہ نے شاعری کی گود میں پرورش پائی ہے۔ اور ہندوستان کے بعض مشہور شاعر اسی زبان میں لکھتے رہے ہیں۔ وٹھلنا تھ۔ سورداس نابھہ داس۔ دیو دت اور بہاری لال بیحد مشہور ہیں۔ (گریرسن) ۔۔

اہل مغرب نے اس زبان کی یہ حدبندی شاید درست کی ہو۔ لیکن مسلمانوں نے اس کو بہت وسعت دے دی تھی۔ وہ اس کو بھاکھا یا بھاشہ کے نام سے یاد کرتے رہے ہیں اور بھاکھا کی ذیل میں انہوں نے قنوجی۔ اودھی اور بندیلی کو بھی داخل کر لیا تھا۔ بلکہ اس کا

میدان اس سے بھی وسیع تر تھا یعنی مشرقی اور مغربی ہندی اس کے دامن میں آجاتی تھی۔ مسلمانوں کا یہ نقطۂ نظر عجیب رہا ہے۔ وہ ہندوستان کی ہر زبان کو ہندی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ عام اس سے کہ پنجابی ہو یا برج ہو یا پوربی۔ اُردو ہو یا مارواڑی اور بنگالی۔ آج ہندوؤں نے بھی ہندی کے ذیل میں برج۔ قنوجی۔ اودھی۔ بندیلی۔ مارواڑی وغیرہ زبانوں کو شامل کر لیا ہے۔ بھاشہ شاعری کی زبان تھی اور اس میں ہر ہندی شاعر عام اس سے کہ وہ اودھی ہو یا گجراتی۔ مالوی یا بہاری شعر لکھتا تھا۔ اگرچہ اس کے اشعار میں اس کی وطنی زبان کی خصوصیات زیادہ غالب ہوتی تھیں ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ مسلمانوں کے لئے جہاں فارسی شاعری اور ادب کی زبان تھی۔ اسی طرح بھاشہ موسیقی اور شعر کی زبان تھی۔ اہل اسلام کی شعر دوستی نے بھاکا کی شاعری کو بہت کچھ تقویت دی ہے۔ انہی کے زمانہ سے اس زبان میں شعر و ادب پیدا ہوتے ہیں۔ گویا اہل اسلام کے پاس تین زبانیں تھیں۔ اوّل فارسی جس میں وہ شعر و ادب تاریخ وانشا لکھتے رہے۔ دوسری اُردو جس کو اپنے ساتھ پنجاب سے لے گئے تیسری بھاکا یا بھاشہ جس میں موسیقی اور شعر لکھتے رہے۔ خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں فارسی پر زوال آنے لگا۔ آیندہ قرون میں عام توجہ بھاشہ کی طرف منعطف ہوگئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں عام ہندی گو شعرا پیدا ہو گئے۔ بھاشہ میں کثرت سے شعرا ہوئے ہیں جن میں صوفی وغیر صوفی شامل ہیں۔ لیکن موجودہ نسلوں کی عدم اعتنا سے اُن کے کلام کا اکثر حصّہ ضائع ہو گیا۔ اور جو کچھ باقی ہے۔ وہ بھی عنقریب معدوم ہو جائیگا برج بھاشہ کوئی قدیم نام نہیں ہے۔ قدما اس کو گوالیاری کے نام سے یاد کرتے تھے۔

برج کی بعض خصوصیات

برج میں مصدر "یو" یا "وو" یا "نو" آخر میں لگانے سے بنتا ہے۔ مثلاً ہو یئو = ہونا بوجھو و = بوجھنا۔ چلنو = چلنا۔ اسماء و افعال اور اسمائے صفات کے آخر میں ایک واو مجہول اضافہ کر دیا جاتا ہے جس موقعہ پر اُردو اور پنجابی میں الف ملتا ہے مثلاً اپنو = اپنا۔ تھا ریو = تمہارا۔ چلیو = چلا۔ یا واو معروف بڑھا دیا جاتا ہے۔ جیسے بست سے بستو۔ غلام سے غلامو۔ شیطان سے شیطانو۔ مستقبل کے اُردو اور پنجابی لاحقہ "گا" کے بجائے "گو" آتا ہے مثلاً مارونگو۔ مارونگا۔ لیکن زیادہ رائج شکل "ماروں" یا "مارے ہوں" = مارونگا۔ "مارے ہیں" = (ہم) مارینگے۔ "مارہے" یا مارے ہے = (تو یا وہ) مارےگا "مارہو" یا مارہو = (تم) مارو گے۔ "مارہیں" یا "مارے ہیں" = (وہ) مارینگے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح مصدر کی علامت "نو" اسی طرح مستقبل کی علامت "گو" اُردو سے لی گئی ہے۔ ہے کی گردان اُردو۔ برج اور پنجابی میں یکساں ہے۔ صرف یہ فرق ہے کہ واحد متکلم میں برج میں ہوں با واو مجہول اردو میں با واو معروف ہوں۔ اور پنجابی میں واو الف سے بدل کر ہاں بن گیا۔ اور جمع واحد میں "ہن" بنگیا +

تھا کی تصریف میں پنجابی اور اُردو کسی قدر اختلاف کے ساتھ متفق ہیں لیکن برج میں مختلف ہے۔ یعنی واحد مذکر "ہتو" واحد مؤنث "ہی"۔ جمع مذکر "تھے" اور جمع مؤنث "ہیں" +

ماضی نا تمام میں "ہو" بجائے "تھا" لاتے ہیں۔ مثلاً میں مارتا تھا کے بجائے میں مارے ہو وغیرہ کہتے ہیں۔ حال و استقبال میں بہت کم فرق ہے۔ ہوں ماروں ہوں یا میں مارتا ہوں۔ وغیرہ یا ہوں مارت ہوں وغیرہ لاتے ہیں۔ جمع کے لئے بالعموم اسم کے آخر میں ایک نون اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً موتی۔ اور۔ دن۔ گھاٹ۔ کان

بات۔ چور۔ گوال اور گاے کی جمع موتن۔ اورن۔ دنن۔ گھاٹن۔ کانن۔ باتن۔ چورن
گوالن اور گاین ہے۔ مصرع۔ کانن میں موتن کو چوکڈا گل پھولن کا ہار + ظرف
کے لئے ایک "یا" اسم کے آخر میں لاتے ہیں۔ جیسے گھر سے گھرے یعنی گھر میں۔ "ن" "نی"
اور "نوں" بغرض جارہ آخر میں لگا دیتے ہیں۔ مثلاً بھوکن۔ بھوکنی اور بھوکنوں یعنی بھوک
سے۔ علامات جارہ میں کا اور کے کی جگہ "کو" آتا ہے۔ مثلاً گل پھولن کو ہار۔ یعنی گلے
میں پھولوں کے ہار۔ گھوڑن کو یعنی گھوڑوں کا۔ مجہول کا کم رواج ہے۔ لاحقہ "نے"
اکثر اوقات افعال لازمی کے ساتھ برخلاف اردو اور پنجابی کے مستعمل ہوتا ہے۔
مثلاً لھوڑے بیٹا نے چلیو۔ یعنی چھوٹا بیٹا چلا۔ نے کے استعمال میں بےضابطگی سے
ظاہر ہے کہ وہ اردو اثرات میں برج میں پہونچتا ہے۔ واو اکثر اوقات میم سے بدل
جاتی ہے۔ جیسے مہاں = وہاں۔ چرامنو = چراونا یعنی چرانا۔ آمنو = آونا یعنی آنا۔
منامن = مناون یعنی منانا۔ جامیں = جاویں۔ رومتی = روو تی یعنی روتی۔ بامن =
بادن۔ مالدہ = والدہ = اردو کے اثرات میں اسمائی تصریف کا استعمال برج میں
ہونے لگا ہے۔ لیکن بےقاعدہ اور غلط۔ مثلاً اردو میں جہاں چھوٹے لڑکے کا کہینگے۔
اہل برج اس کی جگہ "لوہڑے چھورا کو" کہینگے۔ اس میں بےقاعدگی یہ ہے کہ اہل اردو
اسم کی تصریف کی خاطر اس کے اسمائے صفات و دیگر متعلقات کو پنجابی کی طرح
منصرف کرتے ہیں۔ یہاں برج میں اسم "چھورا" کو منصرف نہیں کیا۔ اور اسم صفات
لوہڑیکو منصرف کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اہل اردو اسی جملے کو لوہڑے چھورے کا لکھینگے
اس سے ہمیں قیاس لگا لینا چاہئے کہ تصریف کا قاعدہ اردو سے گیا ہے۔ یہی حالت
کنواں میں سوں اور کالے گھوڑا کو زین کی ہے۔ اردو میں جمع الف اور نون کے
اضافہ سے بنتی ہے۔ برج نے بھی اس قاعدہ کو اردو سے لے لیا ہے لیکن اس کا
استعمال بہت کم ہوتا ہے۔ افعال کا پیچیدہ طریقہ جو اردو اور پنجابی میں افعال

مرکبہ یا توابعات کے الحاق سے ہوتا ہے۔ برج اِس سے بڑی حد تک آزاد ہے ۔

اُردو کی "لام" برج میں "رے" سے بدل جاتی ہے۔ مثلاً جلنا = جرنا۔ یہ بھی یاد رہے کہ "ڑے" اُردو میں کثرت سے آتی ہے۔ اس کے برخلاف برج میں بہت کم مستعمل ہے۔ اُردو کی "ڑے" یا تو "رائے" مہملہ سے بدل جاتی ہے۔ مثلاً لڑی = لری لڑائی = لرائی۔ جوڑی = جوری۔ پھاڑنا = پھارنا۔ یا "ڈال" سے بدلتی ہے۔ جیسے بڑا = بڈا۔ گاڑی = گاڈی۔ گوڑ = گوڈ۔ گاڑنا = گاڈنا ۔

شہر دہلی میں اگرچہ اُردو بولی جاتی ہے۔ لیکن آس پاس کے دیہات میں ہریانی زبان موجود ہے۔ جو درحقیقت اُردوے قدیم کی ایک شکل ہے۔ یہ نظریہ کہ اُردو برج سے نکلی ہے۔ اس عقیدہ پر مبنی ہے۔ کہ قدیم زمانوں میں دہلی میں برج زبان بولی جاتی تھی۔ حالانکہ آج دہلی برج کے علاقہ سے فاصلہ پر واقع ہے۔ مسلمانی عہد سے پیشتر ممکن ہے کہ دہلی میں برج کا رواج ہو۔ لیکن اُردو پر برج کے اثرات کی توجیہ اَور طرح سے کی جا سکتی ہے۔ سکندر لودھی کے عہد سے شاہجہان کے زمانہ تک آگرہ لودہیوں۔ سوروں اور مغلوں کا پایہ تخت تھا۔ جو عین برج کے علاقہ میں واقع ہے ۔

مسلمان اور ہندی زبانیں

امیر خسرو اپنی مثنوی نہ سپہر میں ہندوستان کی مفصلہ ذیل زبانوں کا شمار کرتے ہیں :-

(۱) سندھی - (۲) لاہوری (۳) کشمیری (۴) ڈوگری (۵) دھور سمندری (۶) تلنگی (۷) گجراتی - (۸) معبری (۹) گوڑی منسوب بہ گوڑ - قدما گوڑ کو لکھنوتی کہتے تھے - پٹھان گوڑ - مغلوں نے جنت آباد نام دیا - (۱۰) بنگالی (۱۱) اودھی (۱۲) دہلوی (۱۳) سنسکرت - جو عربی کے سوا تمام زبانوں سے افضل ہے +

کسی قدر ترمیم کے ساتھ یہ تقسیم آج بھی صحیح مانی جا سکتی ہے - ان زبانوں کو ہندوستان کی قدیم پراکرتوں کی یادگار مانا جاتا ہے - لیکن ان میں ادب و شعر مفقود تھے ! البتہ گیت اور سرود کا رواج تھا - جو عوام کی زبان زد تھے - اور یہ مسلمان ہیں جنہوں نے سب سے پیشتر ان زبانوں کی طرف توجہ دی ہے - اور شاعری کا ان میں رواج دیا +

مسلمانوں کی آمد سے پیشتر سنسکرت زبان ہندوؤں کی مذہبی - علمی - درباری اور ادبی زبان تھی - برہمن راجاؤں کے درباروں میں حاوی تھے ! اور مذہب و علوم انہی کی حفاظت میں تھے - درباروں میں سنسکرت اور سنسکرت بولنے والوں کا گذر تھا - عوام الناس میں تعلیم عام نہیں تھی - اور نہ اس دیوبانی زبان کی تحصیل کی ان کو اجازت تھی - وہ صرف برہمنوں کی میراث تھی - رعایا میں تجارت پیشہ لوگ اپنے لئے اسی قدر تعلیم ضروری سمجھتے تھے کہ بہی کھاتہ اور حساب جان سکیں - ورنہ باقی رعایا جاہل مطلق تھی - دیسی زبانیں جن کے بولنے والوں کی تعداد کروڑوں تھی عام کس مپرسی کی حالت میں تھیں - نہ ان میں ادب تھا نہ شعر - برہمن جو ملک کا تعلیم

طبقہ تھا۔ سنسکرت کے ہوتے ہوئے عام پراکرتوں کی طرف کیوں توجہ کرتا۔ ان زبانوں
کی ترقی یا ان میں علوم و فنون کا رواج اس فرقہ کے مقاصد کے عین مخالف تھا۔ راجا
اور پرجا پر اس کا اقتدار اس قدر عظیم تھا کہ دنیا کا کوئی مذہب اس کی مثال پیش
نہیں کرسکتا۔ برہمن کے بغیر دین و دنیا کا ہر کام بند تھا۔ اس کی صدارت کے بغیر
عبادت اور پرستش دشوار تھی۔ موت زیست۔ شادی غمی میں اس کی شرکت لازمی
تھی۔ ان کا معالج وہ تھا۔ نجومی وہ تھا۔ وزیر وہ تھا۔ مشیر وہ تھا۔ مدبر وہ تھا اور
مقنن وہ تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ کونین میں نجات انسانی کا مختار کار وہی تھا۔ اِدھر راجا
قبضہ میں تھے۔ اور اُدھر دیوتاؤں پر تصرف تھا۔ برہمنوں نے نہ صرف جماعتی آزادی کو
معطل کر دیا تھا۔ نہ صرف عوام الناس پر تعلیم کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ بلکہ ضمیر انسانی
کی حریت کو بھی اپنے طاقتور قوانین سے ہمیشہ کے لئے مفلوج کر دیا تھا۔ صدیاں
اس ابدی سکوت اور سکون میں گزر گئیں۔ آخر بودھ جی مہاراج آئے اور انہوں نے
اپنے مت کی تلقین عوام الناس کی زبان میں شروع کی۔ اس طرح پالی زبان نے کچھ
ہی عرصہ میں بے حد ترقی کر لی۔ اور بودھ مت والوں کی مذہبی زبان بن گئی۔ کئی صدی بعد
برہمنوں نے اپنا کھویا ہوا اقتدار پھر حاصل کر لیا۔ اور بودھ مت کا ہندوستان سے اخراج
کر دیا۔ اور ایکمرتبہ اور تمام ہندوستان میں ہمتوں کا دور دورہ ہوگیا ۔

سنسکرت اور برہمنوں کے اقتدار کے زمانہ میں ظاہر ہے کہ کوئی دیسی زبان
ترقی نہیں کرسکتی تھی۔ اور نہ اُس کے لئے کوئی ایسا موقع تھا۔ لیکن مسلمانوں کی آمد
عظیم الشان تغیرات کا پیش خیمہ ہے جس کے دنبال میں اقتصادی۔ معاشی۔ تمدنی
اور لسانی انقلاب رونما ہوئے۔ مسلمان فاتحانہ حیثیت سے آئے۔ اور بہت جلد
اس سرزمین کو اپنا وطن تصور کرنے لگے۔ انہوں نے ممالک خارجہ کی تجارت کا دروازہ
اس ملک پر کھول دیا۔ بیسیوں نئی صنعتیں مثلاً کاغذ سازی۔ پشمینہ سازی۔ زین سازی

نعلبندی۔ باغبانی۔ فن حلوائی۔ قالین سازی۔ پارچہ بافی۔ طب یونانی۔ فن تعمیر کاشی کاری
آئینہ سازی۔ بیطاری۔ دارو سازی۔ کشتی گیری۔ شال بافی وغیرہ وغیرہ کی ترویج دی۔
زندگی کے ہر شعبہ اور فن کو نمایاں ترقی دی۔ فنون لطیفہ کی سرپرستی کی۔ مختلف کھانوں
اور اچاروں کا رواج دیا۔ قسم قسم کے عطریات کی ایجاد کی۔ شعر دوستی اور ادب پرستی
مسلمانوں کی قومی خصوصیت ہے۔ چنانچہ جب وہ ہندوستان میں آباد ہو گئے۔ اور ملکی
زبان سمجھنے اور بولنے لگے۔ ان کی یہ قومی خصوصیت بر روی کار آئی۔ اور وہ اِس ملک
کی زبانوں میں دلچسپی لینے لگے۔ ہندوستان کے شمال ومغرب کی زبانیں جن میں
پشتو۔ کشمیری۔ سندھی اور پنجابی شامل ہیں۔ اکثر مسلمان شعرا کی مرہُونِ منّت ہیں
برج اودھی۔ گجراتی اور بنگالی زبانوں میں ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں نے
بھی ایک معقول حصّہ لیا ہے۔

میرا یہ بیان کہ ہندی زبانوں کے ادبیات مسلمانوں کے ہندوستان میں قیام کا نتیجہ
ہیں۔ ایسے حلقوں میں جہاں برج کی شاعری اور پرتھی راج راسا کی قدامت میں یقین
کیا جاتا ہے۔ ناقابل قبول ہوگا۔ کیونکہ ایک عرصہ سے برج اور راسا کا نام ہماری دنیا
میں گونج رہا ہے۔ لیکن اگر واقعات کو اچھی طرح پرتالا جائے۔ اور اس امر کو بھی مدّ نظر
رکھا جائے کہ ہندو قوم تاریخ میں ہمیشہ کمزور رہی ہے۔ اور آج بھی اس کی تحقیقات
قدیم ادبیات ہندی کے متعلق الجھی اور پریشان ہونے کے علاوہ زیادہ تر ظنی و اتفاق
پر مبنی ہے۔ تو میرے مطالب کا سمجھنا آسان ہو جائیگا۔

یہاں میں اپنے دعوے کی تائید میں جناب دنیش چندر سین بی۔ اے کی تاریخ
ادبیات بنگال سے ایک اقتباس جو زیادہ تر خلاصہ کی شکل میں ہے۔ ناظرین کے
پیش کرتا ہوں:۔

"بنگالی زبان کے ادبی پایہ تک ارتقا حاصل کرنے کے متعدد اسباب ہیں۔ ان

میں سب سے پیش پیش بلا شائبۂ اشتباہ مسلمانوں کی فتح بنگال ہے۔ اگر ہندو راجا بدستور سابق مختار اور حکمران رہتے۔ تو بنگالی زبان کے لئے دربار تک رسائی حاصل کرنا ایک دشوار امر تھا۔ ان پٹھانوں نے تیرہویں صدی میں بنگال کو تسخیر کر لیا۔ اُن کے سلاطین نے بنگالی زبان سیکھی۔ اور اپنی کثیر التعداد ہندو رعایا کے ساتھ جن پر حکمرانی کرنے کے لئے وہ آبسے تھے۔ قریبی تعلقات قائم کر لئے۔ جب ان سلاطین نے سنسکرت کے مشہور رزمیوں رامائن اور مہا بھارت کا ذکر سُنا۔ جو ہندوؤں کی مذہبی اور منزلی زندگی کی تشکیل میں عجیب و غریب اثر رکھتے تھے۔ تو قدرتاً اُن کو شوق ہوا کہ ان نظموں کے موضوع سے آگاہی حاصل کریں۔ انہوں نے چند عالموں کو بنگالی زبان میں اُن کے ترجمہ کرنیکا حکم دیا۔ جس زبان کو وہ اَب بولتے اور جانتے تھے۔ مہا بھارت کا بنگالی ترجمہ ناصر شاہ والی گوڑ کے حکم سے ہوا۔ جس نے ۱۳۲۵ء تک پورے چالیس سال سلطنت کی تھی"۔
(صفحہ ۱۱۰) ۰

جب بنگالی زبان کے ادبیات کا سنگ بنیاد مسلمانوں کے ہاتھ سے رکھا جاتا ہے۔ جس کا ہم کو اب تک کوئی علم نہیں تھا۔ تو یقین کر لینا چاہیئے کہ دُوسرے علاقوں میں جو اہل اسلام کے زیر نگیں تھا۔ انہوں نے دیسی زبانوں کی ترویج میں ضرور حصّہ لیا ہے۔ اس کا ثبوت پیش کرنا کوئی دشوار نہیں ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ بھاشہ کے میدان میں مسلمانوں کے نام ہندو شعرا سے اقدم ہیں۔ ہندی کا پہلا بڑا شاعر کبیر ہے۔ جو نویں صدی ہجری سے تعلق رکھتا ہے۔ ہندو شعرا زیادہ تر دسویں صدی ہجری میں پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے تلسی داس اور سور داس۔ کبیر سے پیشتر بھی مسلمان شعرا موجود تھے ۔

مسلمانوں میں ہندی شعرا کے سرتاج خواجہ مسعود سعد سلمان المتوفی ۵۱۵ھ

ہیں۔ اُن کا ہندی کلام اگرچہ دستبرد زمانہ سے محفوظ نہیں رہا۔ لیکن بارہ ماسہ سب سے پیشتر انہی نے لکھا ہے۔ چنانچہ فارسی میں ان کا مشہور بیاد وازہ ماہہ اَب تک محفوظ ہے۔ چونکہ پنجاب سے مُسلمانوں کے تعلقات دہلی کے مقابلہ میں زیادہ قدیم ہیں۔ اِس لئے مُسلمانوں نے اسی ملک کی زبان میں سب سے پہلے شعر گوئی کی بنا رکھی۔ مشائخ وصوفیہ نے سب سے پیشتر دہلی و پنجاب میں ہندی کی سرپرستی کی ہے۔ ان کا تعلق عوام الناس سے براہ راست تھا۔ اِس لئے دیسی زبانوں کی تربیت اِنہی سے شروع ہوتی ہے۔ اِن اہل اللہ میں ہم بعض مشہور بزرگوں کے نام دیکھتے ہیں۔ مثلاً شیخ فریدالدین مسعود متوفی ۶۶۴ھ شیخ نظام الدین اولیا متوفی ۷۲۵ھ امیر خسرو متوفی ۷۲۲ھ شیخ شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی متوفی ۷۲۴ھ انہوں نے شیخ نظام الدین اولیا سے ہندی دوہروں میں مشاعرات کئے ہیں۔ اور مبارز خاں کے ارادۂ سفر کے وقت ذیل کا ہندی دوہا مع اس کے ترجمۂ فارسی کے خان کے پاس بھیجا تھا:۔

سجن سکارے جائینگے اور نین مرینگے روئے بدھنا اسی رین کر بھور کدہی نا ہوے

شعر فارسی:۔

من شنیدم یار من فردا رود راہِ شتاب یا الٰہی تا قیامت بر نیاید آفتاب

(داستانِ تاریخ آصفیہ)

اِسی جماعت نے ہندی موسیقی کی تہذیب و ترقی میں بھی بڑا حصّہ لیا ہے۔ جہاں فارسی موسیقی قول وزانہ وغیرہ کے وہ دلدادہ تھے۔ ہندی موسیقی سے بھی اُن کی خانقاہیں خالی نہیں تھیں۔ وُہ سنسکرت تک کے نغمات سننے کے عادی تھے شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی متوفی ۶۶۶ھ اس فن میں مہارت کامل رکھتے تھے ملتانی دھناسری انہی کی ایجاد ہے۔ امیر خسرو نے فارسی اور ہندی موسیقی کو پیوند دیا۔ سلطان حسین شاہ جونپوری ۹۰۵ھ نے سترہ راگ ایجاد کئے۔ نایک

بخشو نے بہادری راگ۔ نایکی کلیان اَور نایکی کا ٹھڑا وضع کیئے۔ درباری کا ٹھڑا میاں تانسین کی یادگار ہے۔ شیخ عطاء اللہ الملقب بہ شیخ رتن فن موسیقی میں ممتاز پایہ رکھتے تھے۔ شیخ بہاء الدین برناوی متوفی ۱۰۳۰ھ اس فن میں کامل و اکمل تھے۔ ساز خیال اور ساز کھڑس کے موجد ہیں۔ ابراہیم عادل شاہ متوفی ۱۰۳۵ھ فن موسیقی میں نایکی کا درجہ رکھتا تھا۔ باز بہادر والی مالوہ اس فن میں بے نظیر مانا گیا تھا موسیقی میں مسلمانوں نے اس قدر ترقی کی تھی کہ اس فن پر جس قدر نفیس کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اکثر مسلمان مصنفین نے لکھی ہیں۔ بنگالی میں اس فن کی تمام تصنیفات مسلمان دماغوں کا نتیجہ ہیں *

سلاطین، امرا و عمال نے ہندی کی سرپرستی میں کچھ کم حصّہ نہیں لیا ہے تاج الدین والی لکھنوتی متوفی ۷۳۶ھ بنگالی میں مہابھارت کا ترجمہ کراتا ہے۔ اسی صدی میں فیروز شاہ خلجی ۷۹۰ھ سنسکرت سے بعض کتابیں ترجمہ کرواتا ہے۔ سلطان زین العابدین والی کشمیر متوفی ۸۷۷ھ کئی زبانوں میں ماہر تھا۔ وہ تبتّی زبان بھی بے تکلف بولتا تھا۔ ایک طرف جہاں اُس نے مہابھارت اور راج ترنگنی کا ترجمہ کرایا۔ دُوسری طرف فارسی اَور عربی کتابوں کا بھی کشمیری زبان میں ترجمہ کروایا۔ ودیا پتی شاعر غیاث الدین والی بنگالہ کا مداح ہے۔ ہندی زبانوں کی سرپرستی میں علاء الدین حسین شاہ والی بنگال متوفی ۹۳۵ھ کا نام آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ اِس کا دربار ہندی اور بنگالی شعرا سے آباد تھا۔ قطبن نے اپنی تصنیف مرگاوتی جس کا ذکر آئندہ آئیگا ۹۰۹ھ میں اسی بادشاہ کے نام پر معنون کی ہے۔ اور مالا دہر داسو ساکن کلنگرام اِسی بادشاہ کے حکم سے بھاگوت کا بنگالی زبان میں ترجمہ کرتا ہے۔ ابھی اس کے دو باب ہی ترجمہ کیئے تھے کہ بادشاہ نے شاعر کو ۱۴۸۰ء میں گنسراج خاں کا خطاب دے دیا۔ اسی حسین شاہ کے سپہ سالار پراگل خاں کے حکم سے جو ناظم چٹاگانگ بھی تھا

گوندر پلیسور نے مہا بھارت کا دُوسرا ترجمہ بنگالی زبان میں شروع کیا۔ ترجمہ ختم ہونے نہیں پایا تھا کہ اُس کا انتقال ہوگیا۔ اُس کے فرزند چھوٹے خاں نے جو باپ کا قائم مقام ہوتا ہے۔ سری کرنا نندی کو اسی کام پر مقرر کیا۔ اور ترجمہ ختم ہوگیا +

قاضی محمود گجراتی متوفی سنہ ۹۲۰ھ ہندی کے زبردست شاعر تھے۔ اُن کے اشعار مجالس حال و قال کو ایک عرصۂ دراز تک گرماتے رہے۔ ملک محمدؐ جائسی نے شیر شاہ سور کے نام پر پدماوت لکھی۔ اور دُوسری متعدد تصنیفات اپنی یادگار چھوڑیں شیخ دانیال چشتی نویں صدی ہجری میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور ایک سو گیارہ سال عمر پاکر سنہ ۹۹۴ھ میں رحلت کرتے ہیں۔ ہندی کے اعلےٰ شاعر تھے۔ شیخ عثمان غازی پوری نے چترادلی کا عشقیہ افسانہ لکھا۔ قطبن۔ ملک محمد جائسی اور شیخ عثمان غازی پوری نے عام مذاق کی تصنیفیں لکھ کر ہندی شاعری کو عالمگیر مقبولیت کی شاہراہ پر گامزن کر دیا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ بعد کے آنے والے ہندو شعرا نے اس کو مذہبی رنگ میں رنگ دیا۔ تلسی داس اور سُور داس نے زبان کو مذہبی تنگنا میں محصُور کرکے مناقب سری رامچندر و سری کرشن کے لئے وقف کر دیا۔ پچھلے شاعر جو آئے اور جن میں اکثر ہندو تھے۔ تلسی داس اور سور داس ہی کے نقش قدم پر جادہ پیما ہوئے۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ ہندی شاعری مذہب کی جکڑ بندیوں سے کبھی آزاد نہ ہوسکی اور سرگزشت کرشن و رامچندر کے بیان پر اس کی تمام جد و جہد ختم ہوگئی +

اکبر کے دربار میں متعدد ہندو شاعر موجود تھے۔ جن کی تنخواہیں اور جاگیریں بھی تھیں۔ اس کا فرزند شہزادہ دانیال ہندی کا قابل شاعر تھا۔ عبدالرحیم خاں خانخاناں فن شعر میں بلند پایہ رکھتا تھا۔ اس کا دربار فارسی اور ہندی شعرا کا مرجع تھا۔ نرہری اور بابا کوی اکبر کے دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ بابا کوی کو جس کا نام

متھوریا پھاٹک تھا۔ بادشاہ نے راؤ کا خطاب اور جاگیر عطا کی تھی۔ "کلی چرتر" اس نے عبدالرحیم خاں خانخاناں کے اشارہ سے لکھی تھی۔ تان سین نے اپنی کتاب سنگیت سار اسی عہد میں تالیف کی +

کیشو مسّر اور پوکھر دونوں جہانگیر کے دربار کے شعرا کے زمرہ میں داخل تھے اسی عہد میں طاہر نے کتاب کوک سار ۱۰۳۰ھ میں تصنیف کی۔ سندر داس گوالیاری اور سرومنی شاہجہان کے عہد کے شعرا ہیں۔ سرومنی نے شاہجہان کے ارشاد سے "اروشی" نام کی منظوم لغت طیار کی۔ سندر داس کو شاہجہان نے "مہاکوی راجہ" کا خطاب دیا تھا۔ ویدک میں ایک کتاب "پران سکھ" نامی ۱۰۶۴ھ میں وجود میں آئی۔ جگنا تھ کلاوَنت کو شاہجہان نے خطاب "کبراے" عنایت کیا۔ بادشاہ کے نام پر بارہ دُہرپد اُس نے مختلف نغموں میں تیار کئے جو بادشاہ کو بہت پسند آئے شاہی حکم سے وہ روپیوں میں تولا گیا۔ اس کا وزن چار ہزار پانچسو روپیہ ہوا اور یہی روپیہ اس کو انعام میں مل گیا +

شیخ پیر محمد سلون متوفی ۱۰۴۷ھ ہندی و فارسی میں عمدہ اشعار لکھتے تھے۔ شیخ جنید موہانی چشتی متوفی ۱۰۸۰ھ عربی فارسی و ہندی کے اعلےٰ شاعر تھے۔ داراشکوہ کے ہاں متعدد ہندی خواں ملازم تھے جن کا کام ہندی زبان میں ترجمے کرنا تھا۔ "سارسنگرہ" جو دوہوں کی بیاض ہے۔ اسی کے حکم سے مدون ہوئی +

سترہویں صدی عیسوی کی ابتدا میں دولت قاضی نے لور چندرانی بنگالی نظم لکھنی شروع کی۔ قاضی کی بے وقت وفات کی وجہ سے یہ نظم ختم نہ ہو سکی۔ علاول ایک اور مسلمان شاعر نے ۱۶۵۶ء میں اس کی تکمیل کی۔ عبدالحکیم نے قصۂ یوسف زلیخا کو اسی زبان میں نظم کیا۔ دولت وزیر بہرام نے لیلیٰ مجنوں کی مثنوی لکھی محمد اکبر نے "زین جلال" ایک ایک عشقیہ افسانہ پر قلم اٹھایا۔ کبیر محمد نے "رنگ مالا" شمشیر علی نے "ریجوان ساہا

(رضوانشاہ) اور شمس الدین صدیق نے "بھاؤ لابھ" تصنیف کیں۔ بنگالی زبان میں بیشمار مصنفین گذرے ہیں جنہوں نے مسلمانی بنگالی نیز ہندو بنگالی میں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

عالمگیر کا دربار اگرچہ شاعروں سے خالی نظر آتا ہے۔ لیکن اس کا لاڈلا فرزند محمد اعظم شاہ ہندی زبان سے بے حد الفت رکھتا تھا۔ نواز ایک مسلمان شاعر نے اعظم شاہ کی خواہش سے ۱۶۸۰ء میں شکنتلا ناٹک لکھی۔ اسی شہزادہ کے فرمان سے مختلف کویوں نے مل کر بہاری شاعر مشہور کی "ست سئی" کی تدوین کی یہ نسخہ اشاعت اعظم شاہ کے نام سے مشہور رہا ہے۔

دیوا شاعر شاہ عالم اوّل ۱۱۲۴ھ کے دربار سے متعلق تھا۔ ایک اور شاعر عالم نامی اس بادشاہ کا ملازم خاص تھا۔ ہندوؤں کی روایت ہے کہ عالم در اصل برہمن تھا کسی مسلمان عورت کے عشق میں مبتلا ہو کر مسلمان ہو گیا۔ عالم نے ایک تصنیف "عالم کیلی" جس میں رادھا اور کرشنا کے واقعات درج ہیں۔ اپنی یادگار چھوڑی۔ قاسم پسر واجد نے کیشو داس کی "رسک پریا" پر ایک نفیس شرح لکھی۔

سری پت بھٹ ایک گجراتی ایودھیا برہمن تھا۔ اس نے سید ہمت خاں نواب الہ آباد کے نام پر "ہمت پرکاش" ہندی دیدک میں بعہد عالمگیر ۱۶۷۶ء میں نظم کی۔ ایک اور شاعر بلبیر اسنے ہمت خاں مذکور کی فرمائش پر فن عروض میں کتاب "پنگل من ہرن" سمت ۱۷۴۱ بکرمی میں تصنیف کی۔ سید محمد سعید المخاطب بہ سید میراں بھیک چشتی صابری عہد عالمگیر کے بزرگ ہیں۔ ان کا انتقال ۱۱۳۱ھ میں ہوتا ہے۔ ہندی زبان کے قابل شاعر تھے۔ قوال اُن کے اشعار ابھی تک گاتے ہیں۔ انہی کے مرید محبوب عالم عرف شیخ جیون ہیں۔ ہریانہ کی زبان میں اُن کی تصنیف دردنامہ محمدؐ ہے۔ محشر نامہ بھی انہی کی یادگار رہا ہے۔

یعقوب خاں نے بندیلی زبان میں کتاب "رس بھوشن" لکھی۔ "نکھ سکھ" میرزا عبدالرحمٰن نے عہد فرخ سیر میں تالیف کی۔ سید بہاڑ خلف سید حمزہ "رس رتنا گار" ایک طبی تالیف کے مصنف ہیں۔ شیخ سلیمان ایک معراج نامہ موسوم "نیخالق نامہ" کے ناظم ہیں۔ شیخ خوش محمد قادری نوشاہی متوفی ۱۱۲۷ھ فارسی و ہندی کے مقبول شاعر تھے۔

خود محمد شاہ بادشاہ دہلی متوفی ۱۱۶۱ھ ہندی زبان کا شاعر تھا۔ اس کی تصنیفات سے ایک بارہ ماسہ اب تک موجود ہے۔ اعظم خاں نے اس کے حکم سے "سنگار درپن" سمت ۱۷۸۶ بکرمی میں تالیف کی۔ آنندگھن شاعر مشہور محمد شاہ کا ملازم تھا۔ امیر خاں محمد شاہی دیوی کوی کا مربی تھا۔ صورت مسرا اسی عہد میں نصر اللہ خاں محمد شاہی کا ملازم تھا۔ عالم۔ فیض اور اکرم۔ غلام نبی اور انور خاں بھی ہندی شعرا کے زمرہ میں منسلک ہیں۔ لیکن ہم اُن کے زمانوں سے نا واقف ہیں۔ فیض غالباً محمد معظم فیض ہیں۔ جو فارسی و ہندی کے زبردست شاعر تھے۔ اور سنسکرت کے فاضل۔ انہوں نے لیلاوتی کا سنسکرت سے دوبارہ ترجمہ کیا ہے۔ ڈیڈوانہ کے رہنے والے ہیں۔ اور قاضیوں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا زمانہ عہد محمد شاہی ہے۔ ان کا فارسی دیوان اور کچھ مثنویاں طبع ہو چکی ہیں۔

آخر میں "رس خاں" کا نام بھی داخل کیا جاتا ہے۔ جس کو ہنود مذہبیا ہندو بیان کرتے ہیں۔ کبھی اس کو ایک ساہوکار بچّہ کا عاشق کہتے ہیں۔ کبھی کسی ہندو عورت کا شیدا بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح بعض اس کو سیّد کہتے ہیں اور بعض پٹھان۔ شاہی خاندان کا اس کو ممبر بتایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ رس خاں ایک روز بھاگوت پڑھ رہا تھا۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ جس شخص پر ہزاروں گوپیاں عاشق تھیں۔ اُس سے عشق کرنا چاہیئے۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس کی معشوقہ نے طعنہ

دیا کہ "جیسا تم مجھے چاہتے ہو اگر اس کو چاہتے جس کی ہزاروں گوپیاں عاشق ہیں تو تم کتنے پاگل ہو جاتے" قصہ مختصر رس خاں نے برجھو کا مقام دریافت کیا۔ اُس سے کہا گیا کہ وہ برج میں رہتا ہے اس پر وہ برج چلا گیا۔ وہاں کرشن نے اپنے دیدار اسے دیئے۔ اس طرح رس خاں کرشن کا نام لیوا ہو گیا۔ اس کا زمانہ حیات اس کی نظم پریم پاٹکا سے معلوم ہوتا ہے کہ سمت ۱۶۷۱ بکرمی تھا۔ رس خاں کے زمرہ میں علی خاں۔ شیخ نبی۔ میر احمد۔ تاج خاں اور پیرزادی بی بی کے نام بھی شامل کئے جا سکتے ہیں۔ اِن کے واقعات حیات ہندی بھگت مالاؤں میں مل سکتے ہیں۔ ہنود نے ان کو اپنی جماعت میں تسلیم کر لیا ہے۔

پرتھی راج راسا

"سنیتھا چندرکا" میں ہندی شعرا کے ذکر میں لکھا ہے :-

"کہا جاتا ہے کہ گیارہویں شتک کے انت تک اپبھرنش کا پرچار تھا۔ اس کے
اوپرانت وہ ہندی کے رنگ میں ڈھلنی لگا۔ کوی چند ہندی بھاکا کے آدِ کوی
ہیں۔ اُن کے پہلے بھی کچھ کوی ہو گئے ہیں۔ جن میں کھومان۔ قطب علی۔ سائیں۔
دان چارن۔ فیض۔ اکرم کوی کا نام وشیکھ الیکھیو گئے ہے۔ پرنتو ہندی
بھاکا کے آدیم پڑورکوی چند بردائی ہیں۔ اُن کے پہلے کے کویوں کے نہ تو کوئی
کاوی کہلانے یوگے اوتم گرنتھ ملتے ہیں۔ اور نہ اُن کی بھاکا ہی ٹکسالی اتھوا
واستوک ہندی کہی جاسکتی ہے۔"

اِس بیان کی رُو سے چند بردائی کو ہندی کا سب سے پہلا شاعر مانا گیا ہے۔
کہتے ہیں کہ چند پرتھی راج کا وزیر اور شاعر تھا۔ اور پرتھی راج راسا اسی کی طرف منسوب
ہے۔ ۵۸۸ھ میں پرتھی راج ترائن کے میدان میں سلطان معزالدین محمد بن سام سے
شکست کھا کر مارا جاتا ہے۔ اور مسلمانوں کا قبضہ اجمیر و دہلی پر ہو جاتا ہے۔ راسا اِس
عہد کی تصنیف بتائی جاتی ہے۔ لیکن راسا ایک مشتبہ تصنیف ہے۔ اس کے متعلق
بہت کچھ اختلاف آرا ہے۔ بعض اس کو چند کی اصلی تصنیف مانتے ہیں۔ اور بعض ایک
مجعول تالیف خیال کرتے ہیں۔ با خبر اصحاب کی یہ رائے ہے کہ راسا سولھویں یا
سترھویں صدی میں کسی نے چند کے نام پر تصنیف کر دی ہے۔ چنانچہ مہامہوپادھیا
کبیراج شیامل دان جی کی یہی رائے ہے (ہندی نورتن صفحہ ۵۲) برخلاف اس کے
مصنفین ہندی نورتن اس کی اصلیت کے حق میں ہیں۔

راسا سے واقف کاروں کی یہ رائے ہے کہ اس میں دس فیصدی فارسی اور عربی الفاظ موجود ہیں۔ جو بجائے خود بدگمانی کیلئے ایک زبردست دلیل ہے۔ کیونکہ اجنبی زبانوں کے الفاظ کی اس کثرت کے ساتھ دہلی یا اجمیر کی زبان میں آمیزش ایسے ابتدائی زمانہ میں قریب قریب ناممکن ہے۔ اِس کے بیانات بھی اس قدر لغویت سے لبریز ہیں کہ یہ کتاب بحیثیت کتاب تاریخ ہمارے احترام کی مستحق نہیں۔ مثلاً یہ بیان کہ شہاب الدین کا بھائی حسین نامی تھا۔ شہاب الدین کی بیوی سے ناجائز تعلقات رکھتا تھا۔ جب شہاب الدین کو اِن تعلقات کی خبر ہوئی تو حسین اپنی پیاری جان لیکر پرتھی راج کے پاس بھاگ آیا۔ یا یہ کہ پرتھی راج نے شہاب الدین کو مختلف موقعوں پر سات مرتبہ شکستیں دیں گرفتار کیا اور روپیہ لے کر چھوڑ دیا۔ نیز یہ کہ شہاب الدین پرتھی راج کا مطیع ومحکوم تھا۔ یہ بیانات اس قدر لغو ہیں کہ ہمیں اُن کی تردید میں کوئی وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ صرف اس قدر جاننا کافی ہے کہ حسین نام کا کوئی شخص معزالدین محمد بن سام کا بھائی نہیں تھا۔ اس کے صرف ایک بھائی تھا۔ جو غیاث الدین محمد بن سام کے نام سے غور کا بادشاہ تھا۔ اور معزالدین محمد بن سام اس کے نائب اور سپہ سالار کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسی طرح یہ خیال کہ پرتھی راج نے سلطان موصوف کو سات مرتبہ شکستیں دیں۔ اگرچہ ابوالفضل نے ہندو بیانات کی تقلید میں لکھ دیا ہے۔ قرین عقل وقیاس نہیں۔ کیونکہ جب ہم شہاب الدین کے کارناموں کو سالوار دیکھتے ہیں۔ تو اِن فرضی شکستوں کے لئے اس کی سوانح حیات میں کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ اِس لئے یہ بیان بھی صداقت سے معرا ہے۔

راسا میں آتشیں اسلحوں کا ذکر بھی موجود ہے۔ جو راسا کے مفروضہ زمانہ سے کئی صدی بعد ہندوستان میں رائج ہوتے ہیں۔ ڈوسن صاحب کہتے ہیں کہ:۔

راسا کے ۵۰ ویں چھند میں تاتار خاں شہاب الدین کو مسلح ہونے اور آتشیں

اسلحہ کی تیاری کے لئے کہتا ہے۔ ۲۵۷ ویں چھند میں توپوں اور اُن کی آوازوں کا ذکر
آتا ہے۔ ۲۱۶ ویں چھند میں راسے گوونید کا قتل زنبورک کے ذریعہ سے جو شترنال
کا دُوسرا نام ہے۔ بیان کیا جاتا ہے"۔

ہمیں ان بیانات کی اتنی ہی وقعت کرنی چاہیئے جتنی بی چھچو کے امیر خسرو کو حقہ پلانے کے قصّہ کی۔ نہ سلطان معزالدین کے عہد میں توپیں تھیں اور نہ زنبورک۔ نہ اُس کے عہد میں تاتارخاں کے نام یا خطاب کا کوئی شخص تھا۔ تاریخ ہند میں سب سے قدیم شخص جو اس خطاب کا مالک ہے۔ محمد ارسلان تاتارخاں ہے۔ جو غیاث الدین بلبن متوفی ۶۸۶ھ کے عہد کا امیر ہے۔

یہاں ایک اَور امر قابل غور ہے کہ شہاب الدین سلطان محمد بن سام کے بچپنے کا نام ہے جو اس کے غزنین کا بادشاہ بنائے جانے پر ترک کر دیا گیا۔ اور معزالدین محمد بن سام اختیار کر لیا گیا۔ اَب اس نام سے وہ اپنی مدّت سلطنت میں مشہور رہا ہے اس کے سکّوں پر بھی یہی نام ہے۔ اِس کے عہد کے مورخین مثلاً صاحب تاج المآثر وطبقات ناصری اسی نام سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ بعد کی تاریخوں مثلاً تاریخ فیروز شاہی میں بھی معزالدین کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ راسا میں بار بار اس کو شہاب الدین غوری کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اِس پہیلی کا حل یہی ہے کہ اکبری عہد کے مسلمان مورخین زیادہ تر اس کو شہاب الدین کے نام سے پکارتے آئے ہیں۔ چنانچہ بعد کے مورخین نے یہی نام اختیار کر لیا۔ اس لیئے اگر راسا کا مصنف سلطان معزالدین کا درحقیقت معاصر ہوتا۔ تو وہ قطعاً شہاب الدین نہ لکھتا بلکہ معزالدین۔

راسا میں توپ و بندوق کا ذکر۔ دس فیصدی غیر ہندی الفاظ کی اس میں آمیزش اَور دیگر بیانات کی لغویت وغیرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب ایسے زمانہ

میں لکھی گئی ہے۔ جب کہ تو پٹ ہندوق ہندوستان میں عام طور پر استعمال ہونے لگی ہیں۔ اور فارسی و عربی الفاظ ہندی زبان میں شامل ہو چکے ہیں +
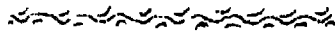
امیر خسرو

وفات ۷۲۴ھ

ادبی دنیا کے آفتاب عالمتاب ہیں۔ اور خاک ہند اب تک اُن کے اوصاف و کمالات کا انسان پیدا نہیں کر سکی ہے۔ وہ ایک طرف فارسی کے زبردست ناظم و ناثر ہیں۔ دوسری طرف عربی و سنسکرت میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں۔ متعدد امور کی ایجاد انہی کی طرف منسوب ہے۔ ہندی اور ایرانی موسیقی کی تدوین کر کے اپنی ایجادوں سے اُسکو مالا مال کر دیتے ہیں۔ جہاں فارسی پر ان کے احسان ہیں۔ وہاں ہندی بھی اُن کے چشمۂ فیض سے سیر آب ہوئی ہے۔ ان کی تصنیفات نظم و نثر کی تعداد ننانوے بتائی گئی ہے۔ اشعار کی تعداد چار اور پانچ لاکھ کے درمیان کہتے ہیں۔ جس قدر فارسی میں ان کا کلام ہے۔ اس سے کہیں زیادہ ہندی میں بتایا جاتا ہے۔ لیکن امیر نے دیباچۂ غرۃ الکمال میں اپنی ہندی نظموں کا ذکر بدیں الفاظ کیا ہے :۔

"جزوے چند نظم ہندوی نیز نذر دوستاں کردہ شدہ است۔ اینجا ہم بدیگرے بس کردم و نظر بر نداشت کہ لفظ ہندوی در پارسی لطیف آوردن جہدانِ لطفے ندارد مگر بضرورت آنجا کہ ضرورت بودہ است آوردہ شد" +

آخری فقرہ میں اشارہ ہے۔ ان الفاظ و فقرات ہندی کی طرف جو امیر گاہ گاہ اپنے اشعار

ہیں لکھ گئے ہیں۔ لیکن امیر کے ہندی کلام کا اب تک پتہ نہ چل سکا گذشتہ عہدی کے تذکرہ نگاروں نے جو نمونۂ کلام دیا ہے۔ میں یہاں نقل کئے دیتا ہوں۔ از قسم شہر آشوب ؎

تنبلی پسرے کہ میفروشد تیلے — از دست و زباں چرب او وا ویلے
خاے بلبش دیدم و گفتم کہ تل است — گفتا کہ بروئیست درین تل تیلے

یعنی ترجمہ ہے "ان تلوں میں تیل نہیں" کا۔ ہندوستان کا قاعدہ ہے کہ گوجریاں دُودھ دہی وغیرہ لیکر گلی گلی آواز دیتی پھرتی ہیں "لیو دہی لیو دہی" امیر کے عہد میں بھی یہی دستور تھا۔ فرماتے ہیں :۔

گجری تو کہ در حسن و لطافت چو مہی — آں دیگ دہی بر سر تو چتر شہی
از ہر دو لبت قند و شکر میریزد — ہرگاہ بگوئی کہ "دہی لیہو دہی"

دیگر ؎
زرگر پسرے چو ماہ پارا — کچھ گھڑیے سکارئیے پکارا
نقد دل من گرفت و بشکست — پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

اشعار ذیل بھی صنعت شہر آشوب سے تعلق رکھتے ہیں ؎

رفتم بہ تماشہ بکنار جوئے — دیدم بلب آب زن ہندوئے
گفتم صنما چیست بہاے موئیت — فریاد بر آورد کہ "در در موئے"

"در در موئے" فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں پڑھا جاتا ہے۔ فارسی میں یہ معنی ہیں کہ ایک ایک موتی کا ایک ایک بال ہے۔ ہندی میں یہ مطلب ہے کہ مر دار دور ہو۔ فرہنگ آصفیہ میں ذیل کا قطعۂ شہر آشوب امیر کے نام پر دیا ہے :۔

ہندو بچۂ بیں کہ عجب حسن دھرے چھے — بر وقت سخن گفتن مکھ پھول جھرے چھے
گفتم ز لب لعل تو یک بوسہ بگیرم — گفتا کہ ارے رام ترک کائیں کرے چھے

اس قسم کی نظمیں جن میں پیشہ وروں کا قطعات کی شکل میں ذکر ہو شہر آشوب

کہلاتی ہیں۔ مولانا محمد ابن چڑیا کوٹی جنہوں نے جواہر خسروی میں امیر کا شہر آشوب مرتب کیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

"سنسکرت اور ہندی بھاشہ میں اس قسم کی نظمیں میری نظر سے گذری ہیں۔ دپنتی واکیر ولاس گوپال کوی نے اسی طرز پر نظم کیا ہے جس میں تمام پیشہ وروں کے نام اور اُن کے کام نظم میں بیان کئے ہیں۔ غالباً اسی طرز کو حضرت امیر خسرو نے فارسی زبان میں لا کر ایک جدت اور فارسی لٹریچر میں نیا اضافہ کیا ہے۔"

مَیں یہاں اس قدر اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس معاملۂ خاص میں امیر خسرو سنسکرت و بھاشہ کے مرہُونِ منّت معلوم نہیں ہوتے کیونکہ خواجہ مسعود سعد سلمان سب سے پیشتر فارسی میں ان نظموں کا رواج دیتے ہیں۔ اور "مقطعات شہر آشوب" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ تمثیلاً خواجہ کے شہر آشوب سے یہاں ایک آدھ نمونہ حوالۂ قلم کر دیا جاتا ہے۔

درحق دلبر خبازگفت

آنکہ او بردکان زبس خوبی   ہمچو خورشید بر سپہر آمد
شد فراز تنور چوں دل من   بادو مہ رفت و بادو مہر آمد

صفت یار بربطی گفتہ

بتانہ زہرۂ آسمان جمالی   چو زہرہ مین بر تو فرخندہ فالی
کنار تو خالی نباشد ز بربط   ز بربط مباشد ملے زہرہ خالی

ذیل کی نظم بھی امیر کی طرف منسوب ہے:-

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں   کہ تابِ ہجراں ندارم اےجاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلش چو عمر کوتاہ   سکھی پیا کوں جو مَیں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں   کسے پڑی ہے جو جا سنا دے پیارے پی کو ہماری بتیاں

چو شمع سوزاں چو ذرّہ حیراں ز مہر آں مہ بگشتم آخر — نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں
بحق روز وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسرو — سپیت منکے دورائے راکھو جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں

وہ گئے بالم وہ گئے ندیو کنار — آپ پار اتر گئے ہم تو رہے اروار
بھائی رے ملاحو ہمکوں پار اتار — ہاتھ کا دیو وں گی مندرا گل کا دیوں ہار
دیکھ میں اپنے حال کوں روؤں زار و زار — پی کن وتنا بہت ہیں ہم ہیں او گنہار
بابل بھیجی میں سسرال کوں تا ندا کو بھول — ہو چھا ونجہ وہا جیا تا لاہا مول
چکوا چکوی دو جنے انکوں مار ونہ کو — اوہ مارے کرتار کے رین بچھوڑی ہو
سیج دیکھتی دیکھ کے روؤں دن رین — پیا کستی میں بہروں پل بھر سکھ نہ چین
سب نا رین سو سکھ سیو ین کنتاں کوں گل لائے — میں دکھیاری جنم کی دو کھی گئی بہائے
تازی چھوٹا دیس میں قصبے پڑی پکار — دروا نے دینے رہ گئے نکس گئے اسوار
گوری سوئے پلنگ پر مکھ پر ڈارے کیس — چل خسرو گھر آپنے سانجھ پڑی چو دیس

(از بیاض حمکوکہ پروفیسر سراج الدین آذر ام ۔اے پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور)

ذیل کی غزل ایسی بیاض سے نقل کی جاتی ہے۔ جو تیرہویں صدی ہجری کی ابتدا میں لکھی گئی ہے :-

جب یار دیکھا نین بھر دل کی گئی چنتا اتر — ایسا نہیں کوئی عجب راکھے اسے سمجھائے کر
جب آنکھ سے اوجھل بھیا تڑپن لگا میرا جیا — حقا الٰہی کیا کیا آنسوں چلے بھر لائے کر
توں تو ہمارا یار ہے تجھ پر ہمارا پیار ہے — تجھ دوستی بسیار ہے یک شب ملو تم آئے کر
جاناں طلب تیری کروں دیگر طلب کس کی کروں — تیری جو چنتا دل دھروں اک دن ملو تم آئے کر
میرا جو من تم نے لیا تمنے اٹھا غمکوں دیا — غم نے مجھے ایسا کیا جیسا پتنگا آگ پر
خسرو کہے باتاں غضب دل میں نہ لاوے کچھ عجب — قدرت خدا کی ہے عجب جب جیو دیا گل لائے کر

(از بیاض پروفیسر سراج الدین آذر ۔ ام ۔ اے)

مَیں نے اس غزل کو یہاں لکھ تو دیا ہے لیکن یہ ماننے کیلئے تیار نہیں کہ امیر خسرو اس کے مالک ہیں +
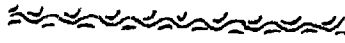
خالق باری

یہ وہ خوش قسمت کتاب ہے جو بالاتفاق حضرت امیر خسرو دہلوی کی طرف منسُوب ہے۔ تذکرہ نگاروں نے اِس کے متعلق حسب معمول مبالغہ سے کام لیا ہے۔ مولوی محمد امین صاحب چڑیا کوٹی فرماتے ہیں کہ " اس میں کئی ہزار اشعار تھے"! مولانا محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ "کئی بڑی بڑی جلدوں میں تھی" اور اپنے تخیل کی رنگینی سے کام لے کر یہ فقرہ بھی اضافہ کر دیا ہے کہ " وہ ایک بھٹیاری کے لڑکے کیلئے لکھی گئی تھی"۔ لیکن اگر تحقیق سے کام لیا جائے تو یقین ہے کہ یہ بیانات بے اصل ثابت ہوں۔ یہ بات تو عقل میں آتی ہے کہ بچوّں اور مبتدیوں کے لئے جو کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ بالعموم مختصر اور رسالہ کی شکل میں ہوا کرتی ہیں۔ مثلاً حامد باری۔ رازق باری۔ واحد باری۔ اللہ باری۔ ایزد باری۔ صمد باری اور قادر نامہ وغیرہ جو سب کی سب اسی خالق باری کی طرز میں ہیں۔ یہ رسالے اکثر اوقات بچوّں کو حفظ کرائے جاتے تھے۔ اس لئے ضروری تھا کہ مختصر ہوں +

یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خالق باری کے امیر کی طرف منسوب کرنے کیلئے ہمارے پاس کیا وجوہ ہیں۔ کلیاتِ خسرو کے سلسلہ میں ایک جلد موسوم بہ جواہر خسروی بھی علیگڈھ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں امیر کے متفرق کلام کے علاوہ مولوی محمد امین صاحب چڑیا کوٹی نے خالق باری کو نہایت محنت

اور تحقیق کے ساتھ مرتب کرکے شائع کر دیا ہے۔ اس کے دیباچہ میں مولانا نے حسبِ ذیل کے بعض وجوہ کی بنا پر خالق باری کو امیر کی تسلیم کرتے ہیں ❖

"(۱) جیتل کا لفظ اس کتاب میں ملتا ہے۔ جو حضرت امیر کے زمانہ تک ایک ہندی سکہ تھا۔ اور آپ کے قریب عہد میں متروک ہو چلا تھا۔ یہاں تک کہ تاریخ میں اس عہد کے بعد اس کا نام بھی نہیں ہوتا ہے" ❖

میں اس کے متعلق اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ لفظ جیتل ہر زمانہ میں ملتا ہے مثلاً آئینِ اکبری میں جہاں اکبری عہد کے سکوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ابوالفضل جیتل کو ایک فرضی سکہ اور دام کا پچیسواں حصہ مانتا ہے ❖

مہابت خاں عہد عالمگیر کا ایک امیر ہے۔ وہ ایک عرضداشت میں جو سرتاپا شکایت سے مملو ہے لکھتا ہے :-

"مدار کار بر قاضی و قاضی برشوت راضی۔ در غزنی و قندھار اشتہار یا فتہ کہ مطربان باستقبال فرمان می شتابند و نرخ حسب الحکم موقوف برد و جیتل افتاد و اسد خاں کہ ہنوز بوے شیر از دہانش نرفتہ وزیر اعظم و دستورِ معظم فرمودند" ❖

آنند بن ہیمراج گوالیری نے فن سیاق میں ایک رسالہ موسوم بخلاصۃ السیاق ۱۱۰۵ھ مطابق ۳۷ جلوس عالمگیری میں تصنیف کیا ہے۔ اس میں جیتل کا لفظ عام طور پر ملتا ہے۔ چونکہ یہ رسالہ چھپا نہیں۔ اس لئے یہاں ایک دو فقرے نقل کر دئے جاتے ہیں ❖

"دستور معلوم کردن دامہا بہ حساب فی من :: باید کہ مبلغ نرخ من را با دامہا ضرب نماید و حاصل ضرب را جیتل دانستہ۔ پنجاہ جیتل یک تنگہ بگیرد۔ مثلاً فی من بیست تنگہ :: قیمت پنج دام می باید۔ پس بیست را با پنج ضرب دادیم ۔ حاصل ضرب یک صد جیتل بیامد و ازیں دو تنگہ گرفتیم قیمت پنج دام معلوم شد" ❖

"اگر کسی پُرسد فی من دہ تنگہ است دو آنثار راچہ باید داد۔ باید کہ آنثار را با تنگہا ست
زرخ من ضرب دہد وحاصل ضرب را جیتل دانستہ بر چہل جیتل مقرر نماید۔ پس
یک بہلولی قیمت دو آنثار معلوم شد" +

شیخ جنید کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو ؎

چو دزد اندر کمیں باشد کسے جو نلیند ہجا را
نباشد سود یک جیتل گولئے مول بھی سارا

جس زمانہ میں جیتل کا سب سے زیادہ چرچا رہا ہے وہ امیر خسرو کے عین بعد ہے
سلطان فیروز شاہ تغلق ۷۵۲ھ و ۷۹۰ھ نے اپنے عہد میں جیتل (ایک تنگہ کا
پچاسواں حصہ) کی تقسیم جس میں نیم جیتل اور دانگ جیتل شامل ہے کر دی تھی ۔
چنانچہ مولانا شمس سراج اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں :-

"سلطان فیروز شاہ فرمان فرمود کہ مہر نیم جیتل کہ آنرا اوہ گویند دمہر دانگ جیتل
کہ آنرا پنکہ گویند وضع کنند تا غرض فقرا و مساکین حاصل شود" +

جیتل کے لئے ہر عہد کی مثالیں بہم پہنچائی جا سکتی ہیں۔ لیکن میں بخوف
طوالت انہی امثال پر قناعت کر کے مولوی صاحب کے دُوسرے استدلال کو بیان
کرتا ہوں +

"(۲) محاورات قدیم مثلاً" مَیں تجھ کہیا"۔ "تو کت رہیا"۔ "باد اوڑاتی دھوا چلی"
"آگھنا (دیکھنا)"۔ "تچاو (شوق)" وغیرہم الفاظ کی گواہی سے خالق باری کا زمانۂ
تصنیف عہد خسروی میں قطعی طور پر مقرر اور متعین ہو سکتا ہے" +

یہ دلیل بھی مضبوط معلوم نہیں ہوتی ۔ کیونکہ مَیں تجھ کہیا۔ تو کت رہیا آج بھی
ہندوستان کے دیہات میں بولے جاتے ہیں ۔ آکھنا پنجابی زبان میں کہنے اور
دریافت کرنے کے معنوں میں آج بھی آتا ہے۔ "باد اڑائی" کے معنے خدا جانے

مولانا نے "ہوا چلی" کیسے لکھ دیئے۔ کیونکہ مصرع خاک دہول جو باد اوڑاتی ہیں یا اوڑاتی کا تعلق دہول کے ساتھ ہے۔ یعنی ایسے دہول جسے خاک اڑا سکے۔ بہرحال ان میں کوئی بھی ایسا محاورہ نہیں جو محاوراتِ قدیمہ کی فہرست میں شامل کیا جا سکے۔ تیسری وجہ مولانا نے مفصلہٴ ذیل دی ہے :۔

(۳) اس میں شک کرنے کے بہت کم وجوہ ہیں کہ خالق باری حضرت امیر خسرو کی تصنیف ہے۔ اور یہ شائبۂ شک بھی خود خالق باری کے مقطع یعنی آخری شعر کو دیکھ کر بالکل رفع ہو جاتا ہے۔ جس میں لفظ خسرو موجود ہے۔ اور جس شاعرانہ شوخی و فصاحت کے ساتھ یہ لفظ مقطع میں واقع ہوا ہے۔ اور اس پردہ میں شانِ انکسار کا طرّہ دیکھ کر نا ممکن ہے کہ کوئی صحیح المذاق شخص اس کو تخلص سمجھے اور صرف ایک لفظ بامعنی مثل دیگر الفاظ بامعانی کے جن سے خالق باری بھری ہوئی ہے قرار دے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

مولوی صاحب سرن پناہ   گدا بھکاری خسرو شاہ

اس کی ترکیب بالکل وہی ہے۔ جیسے آج کوئی خسرو نام کا شخص اپنے تئیں کسی تحریر میں خاکسار خسرو لکھ کر ختم کلام کر دے "۔

مولانا کا یہ استدلال زیادہ تر شاعرانہ رنگ میں ہے۔ اہل اللہ میں سادات نے اپنے نام سے پہلے یا بعد میں شاہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مثلاً شاہ نعمت اللہ ۸۳۲ھ، شاہ میاں جی ۸۹۰ھ اور سید راجی حامد شاہ ۹۰۰ھ وغیرہ لیکن امیر خسرو کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ شاہ کا لفظ اپنے تخلص کے آخر میں لا کر سادات کے نام کے ساتھ خواہ مخواہ التباس پیدا کر دیتے۔ اور نہ امیر کے زمانہ میں فقرا کے نام کے ساتھ اس لفظ کا رواج تھا۔ لیکن اس شعر میں سب سے زیادہ توجہ طلب مصرع اول ہے۔ جس میں مولوی صاحب کی ترکیب موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ مولوی

صاحب، منشی صاحب، پنڈت صاحب کی سی ترکیبیں امیر خسرو کے عہد میں رائج نہیں تھیں۔ "مولوی صاحب" درکنار تنہا مولوی کا لفظ بھی امیر کے عہد میں علما کے نام کے ساتھ نہیں ملتا۔ ایسے مرکب محض گذشتہ صدی کی مبتدعات سے ہیں۔ اس لئے ہمیں اس شعر کو جدید اضافہ ماننا پڑیگا۔ اَور بات بھی یہی ہَے کیونکہ اگرچہ یہ شعر مطبوعہ نسخوں میں اسی طرح ملتا ہَے۔ مگر قلمی نسخوں میں اس کی شکل بالکل مختلف ہَے۔ جو حسبِ ذیل ہے ؎

دو جگ رہا خسرو کا نام خالق باری ہوئی تمام

ایک اَور نسخہ میں یوں ہَے ؎

دو جگ وِچ رہیا خسرو نام خالق باری ہوئی تمام

اِن شعروں میں اگرچہ خسرو کا تخلص موجود ہَے۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ خسرو وہی مشہور امیر خسرو ہیں۔ خسرو اور لوگوں کا بھی تخلص ہوسکتا ہے۔ اَور میرا خیال ہے کہ ہم نے خالق باری کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رکھی ہے۔ تاریخ و ادب میں اس کا کہیں ذکر نہیں آتا۔ نہ امیر خسرو کی تصنیفات کے ساتھ اس کا شمار ہوتا اَور نہ کوئی اسے جانتا ہے۔ اور نہ اس کے قدیم نسخے دستیاب ہوتے ہیں جس قدر نسخے ملتے ہیں بارہویں اور تیرہویں قرن ہجری کے نوشتہ ہیں۔ صرف ایک نسخہ ایسا ہے جو گیارہویں صدی سے تعلق رکھتا ہَے۔ یہ نسخہ برٹش میوزیم کی فہرست کتب فارسیہ میں "ریول ۱۶ اب ۳" ہے۔ جو طامس ہائڈ متوفی ۱۷۰۲ء مطابق ۱۱۱۴ھ کی مِلک تھا۔ فہرست نگار کا بیان ہے کہ کسی فرنگی نے سترہویں صدی عیسوی میں نقل کیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس نسخہ میں مصنف کا نام مذکور نہیں ہے۔ انڈیا آفس میں ایک نسخہ ۲۴۴۸، سنہ ۱۱ جلوس محمد شاہی مطابق ۲۴ ربیع الثانی ۱۱۳۴ھ کا کتابت شدہ ہَے۔ لیکن اسی کتب خانہ میں ایک

اور نسخہ ع ۲۴۷ہماری دلچسپی کے کچھ سامان رکھتا ہے۔ اس کی تاریخ کتابت معلوم نہیں لیکن اس کا نام "مطبوع الصبیان" دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خالق باری کا اصلی نام مطبوع الصبیان ہے۔ اس نسخہ کے ساتھ نثر کا ایک دیباچہ بھی ہے۔ فہرست نگار نے اس کا ایک پارہ نقل کر دیا ہے وہو ہذا :۔

"الحمد للہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ [بداں] اسعدک اللہ تعالیٰ فی الدارین کہ چند کلمۂ عربی و فارسی ہر یک با ترجمۂ ہندوی برائے تعلیم صبیان بر طریق ریختہ [گفتہ آمد]

بدقسمتی سے اس نسخہ میں بھی مصنف کا نام مرقوم نہیں۔ اس رسالہ میں چھپن فصلیں ہیں۔ اور ہر فصل میں چار شعر ہیں۔ اس حساب سے اس کے اشعار کی تعداد دو سو چوبیس ہوتی ہے۔ کتاب کا آغاز حسب معمول خالق باری سرجن ہار الخ سے ہوتا ہے۔ اب یہ فصلیں یا تو تناسب الفاظ و لغات یا بحور کے لحاظ سے قائم کی گئی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رائج الوقت خالق باری کا شیرازۂ اشعار بہت کچھ درہم و برہم کر دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ اس کا دیباچہ اور نام قطعاً بھلا دیئے گئے۔ سب سے دلچسپ دیباچہ کا وہ پارہ ہے جس میں ریختہ کا لفظ موجود ہے ریختہ کے موجد اگرچہ امیر خسرو ہیں۔ لیکن ان کے ہاں وہ موسیقی کی ایک اصطلاح ہے۔ اس دیباچہ میں ریختہ نظم کے معنوں میں آیا ہے۔ اور یہ وہ معنے ہیں۔ جو ولی اور سراج کے ہاں ملتے ہیں۔ ریختہ بمعنے نظم گیارہویں صدی کے آخر میں ملتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ کتاب مطبوع الصبیان معہ دیباچہ اسی قرن میں کسی وقت تصنیف ہوئی ہوگی ۔

عالمگیر کے عہد میں اُردو زبان کی طرف خاص توجہ کی جاتی ہے اور بچوں کے لئے یہی زبان ذریعۂ تعلیم بن جاتی ہے۔ گیارہویں اور تیرہویں صدی میں خالق باری کے انداز کی درجنوں کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ مثلاً رازق باری، حامد باری

ایزد باری، واحد باری، صمد باری، مالک باری، اللہ باری اور قادر نامۂ میرزا غالب وغیرہ وغیرہ جب اس قدر کتابیں دو صدی کے اندر اندر لکھی گئی ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ خالق باری بھی اُن کے متصل زمانہ میں لکھی گئی ہو گی۔ یہ امر قرین قیاس نہیں کہ خالق باری ۱۰۲۵ھ سے قبل لکھی گئی ہے۔ اس کے بعد پورے چار سو برس یعنی گیارھویں صدی تک اہل علم خاموش رہیں اور بارھویں اور تیرھویں صدی میں اس کی تقلید میں درجنوں کتابیں لکھی جانی شروع ہوں۔ میرے نزدیک خالق باری اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور اس کا زمانہ ہمیں دیگر تصنیفات کے زمانے کے قریب ماننا چاہیئے +

اگر خالق باری امیر خسرو کی تصنیف ہوتی تو صورت حالات بالکل مختلف ہوتی اس عہد سے لیکر سینکڑوں کتابیں اب تک اس کی تقلید میں لکھی جاتیں شارح اس کی شرحیں لکھتے۔ اہل لغات اس سے استناد کرتے اور یہ کتاب مختلف فیہ لغات کے لیئے ایک سندی ماخذ بن جاتی۔ بہت کم لوگ واقف ہیں جس محنت اور مشکلات کے ماحول میں آٹھویں نویں اور دسویں قرن ہجری کے ہندی فرہنگ نگاروں نے اپنی کتب لغات ترتیب دی ہیں۔ وہ ادنیٰ ادنیٰ شرحوں سے لغات جمع کرتے ہیں۔ کتابوں کے حواشی سے الفاظ لیتے ہیں۔ اُستادوں سے پوچھ رہے ہیں۔ خطوط و رقعات سے استناد کر رہے ہیں۔ وغیرہ۔ اگر امیر خسرو اتنا بڑا مجموعۂ لغات اپنی یادگار چھوڑ جاتے جو کہا جاتا ہے کئی ہزار اشعار اور کئی جلدوں پر شامل تھا۔ تو کیا یہ فرہنگ نگار جو ایک درجن سے زیادہ ہیں اس سے استفادہ نہیں کرتے۔ یہ خیال کرنا کہ محض اتفاقیہ یہ کتاب ان کے ہاتھ نہیں لگی۔ بے حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کتاب کو داخل نصاب مانا جاتا ہے۔ اس لئے تو وہ بھی سے ان کی واقفیت اس سے ضروری تھی +

مولانا محمد امین صاحب نے اس یقین کے اندر کہ خالق باری امیر خسرو کی تصنیف ہے۔ شاعرانہ انداز میں دل کھول کر اس کی مدح سرائی کی ہے۔ بلکہ نصاب الصبیان سے ایک قسم کا مقابلہ کر کے خالق باری کی افضلیت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اور غالباً مولانا نے یہ سب کچھ محض عقیدتاً کیا ہے۔ کیونکہ حقیقتاً اگر ان کو مقابلہ منظور ہوتا تو نصاب الصبیان کے بجائے عیدالوابع کے نصاب یا قادر نامۂ میرزا غالب سے مقابلہ کرتے۔ جو ہر حال میں زیادہ موزون ہوتا۔ امیر کی وقعت ہمارے دل میں بھی اسی قدر ہے۔ جس قدر کہ مولانا کے دل میں ہے۔ لیکن خالق باری کا معاملہ اور بات ہے۔ میں امیر کی طرف اس تالیف کا انتساب امیر کی ہتک سمجھتا ہوں۔ ہمیں اس کے نقائص پر بھی ذرا ایک نگاہ ڈال لینی چاہیئے۔

اس کتاب میں ہر قسم کی ترتیب کا التزام مفقود ہے۔ مضمون الفاظ اور وزن میں کوئی ترتیب ملحوظ نہیں۔ ہندی الفاظ کے صحیح تلفظ کی کوئی پروا نہیں کی گئی۔ عربی۔ فارسی اور ہندی الفاظ کے مرادفات التزاماً نہیں دیے کبھی فارسی ہندی دیے۔ کبھی فارسی عربی پر قناعت کر لی۔ اور کبھی صرف ہندی الفاظ پر۔ پھر بھرتی کے الفاظ اس کثرت سے لائے گئے ہیں کہ الفاظ برائے بیت خالق باری کا دقیع پہلو بن گئے ہیں۔ مثلاً ؎

بادہ شراب دراوق وصہباے است ومد

گر جرعہ زاں خوری تو کنی کار نیک و بد

کا آخری مصرع تمام و کمال برائے بیت ہے۔ پھر وہی الفاظ بعض اوقات دوبارہ دہرا دیئے ہیں۔ ان کی مثالیں دینا باعث طوالت ہے۔ ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ کتاب نوعمر بچوں کے لیئے لکھی گئی ہے۔ اس لیئے اس کی بحروں کا شگفتہ اور سبک ہونا ضروری تھا۔ لیکن اس تصنیف کی اکثر بحریں غیر شگفتہ

ناہموار ہیں۔ پھر اوزان کی غلطیاں بھی موجود ہیں۔ ایک مصرع بڑھ گیا اور ایک گھٹ گیا۔ کوئی ادھا اور کوئی لمبا ہو گیا۔ مثلاً شعر

زر بود سونا سیم چیتل نقرہ روپا جامہ کپڑ ٹاٹ پٹرڑ ڈبہ کوپا

جو بظاہر بحر رمل مسدس سالم میں ہے لیکن مصرع اول کی ابتدا میں ایک سبب خفیف زائد از وزن لایا گیا ہے۔ اور شعر

عقرب بنا زی بچھو کثر دم برج فلک بشمر تو سر وش و فرشتہ ملک

میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلا مصرع انگڑائی لے رہا ہے۔ اس کے وزن کی اگر تلاش کی جائے تو فارسی والے کہینگے کہ کوئی ہندی وزن ہوگا۔ اور ہندی والے کہینگے کہ فارسی وزن ہوگا۔ آنیوالے شعر میں

توت فرصاد است کھیرا باد رنگ چھینکا آونگ ہندوی ڈھیل ہے درنگ

آونگ کا گاف اور ڈھیل کی لام زائد از وزن ہیں۔

بعض مقامات پر دیکھا جاتا ہے کہ مصنف مختلف موقعوں پر ایک ہی لفظ کے دو مختلف معنے دے جاتا ہے۔ مثلاً ذیل کے دو شعر

عنقا سیمرغ ہست لگ لگ ہے تیترا ہم بارکش ریسماں ہے جیبڑا

طاؤس مور باشد و دراج تیترا خوب ونکو بھلا و بد و زشت ہے برا

مصنف کے نزدیک تیتر کی فارسی لگ لگ بھی ہے۔ اور دراج بھی لیکن خود فارسی میں لگ لگ اور دراج دو مختلف جانور ہیں۔ دراج بیشک تیتر ہے۔ لیکن لگ لگ کو اہل لغات یوں بیان کرتے ہیں:-

"مرغے است مشہور کہ گردن و منقار و پاے دراز دارد و مار را شکار کند"

حکیم سنائی فرماتے ہیں ؎

آں لگ لگ گوید کہ لک الحمد ولک الشکر تو طعمہ من کردۂ آں مار زیاں را

اب ایسی غلطی امیر خسرو سے نہایت بعید ہے۔ کسی دُوسرے موقعہ پر خرما کے معنے ایک جگہ کھجور بتلائے ہیں۔ اور دوسری جگہ املی۔ چنانچہ ؎

جان خرما ہندوی انبلی۔ واں صمغ گوند گلیم است کنبلی

ہندوی گویند خرما را کھجور واکھ را تو فارسی میداں انگور

املی کو اگرچہ خرمائے ہندوی کہا جاتا ہے لیکن جس طریق سے مصنف نے بیان کیا ہے بے حد مغالطہ خیز ہے۔ انگور کا تلفظ جس طرح شعر دوم میں کیا گیا ہے۔ وہ ہمیں پنجاب کی یاد دلاتا ہے۔ انگور کا یہ تلفظ امیر سے بعید ہے۔ بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ کتاب بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ شعر آیندہ میں مصنف سے ایک اور لغزش مشاہدہ ہوتی ہے۔

فارسی سیمرغ و عنقا ہست تدرو و کبک ہنس

ہانچہ پرفان است کانور ہے زیرو نسل ہنس

اس شعر میں تدرو، کبک اور ہنس تین مختلف پرندوں کو مصنف نے ایک مان لیا ہے۔ کبک کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ اسی کو ہم چکور کہتے ہیں ؎

کبک کو ہندی میں کہتے ہیں چکور

میرزا غالب قاطع برہان میں کہتے ہیں "تدرو در فارسی طائرے را گویند کہ بہ تیر ہندی آنست" اور فرہنگ نویس کہتے ہیں کہ "مرغے ست صحرائی شبیہ بخروس درنہایت خوش روشی وخوش رفتاری" لیکن ہمارے لئے سب سے اہم یہ امر ہے کہ خود امیر خسرو کبک اور تدرو کو علی الرغم مصنف خالق باری علیحدہ علیحدہ پرندے تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ قران السعدین

آنکہ پریدے زپر خود تدرو ماندہ چو پر گم شدگاں زیر سرو

لالہ چو از کوہ برفت از شکوہ کبک ببرید دل از بیخ کوہ ؎

(کلیات خسرو طبع بمبئی)

قرآن السعدین میں دونوں شعر اسی ترتیب سے بلا فاصلہ ملتے ہیں۔ جس سے اس احتمال میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ امیر کے نزدیک کبک اور تدرو دو مختلف جانور ہیں۔ اس لئے خالق باری کا مصنف اور امیر خسرو ایک شخص نہیں ہیں۔ لیکن صاحب خالق باری نے تدرو اور کبک کو ایک جانور کیوں تسلیم کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود بعض اہل لغات اس غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ مثلاً مؤید الفضلا میں تدرو کی تشریح میں ہم یہ عبارت پڑھتے ہیں :-

تدرو بفتحتین، کبک و آں پرندہ ایست آتش خوار و خوش رفتار کہ بکوہہا بود

کذا فی الادات [الفضلا]۔

(ادات الفضلا، قاضی بدرالدین محمد دہلوی نے ۸۲۲ھ میں تالیف کی ہے) اب ظاہر ہے کہ صاحب خالق باری نے اپنی کتاب کی تالیف کے وقت ادات الفضلا۔ مؤید الفضلا ۹۲۵ھ یا کسی اور ایسی کتاب لغات سے امداد لی ہے جس کے ماخذ میں یہ کتابیں شامل ہیں +

بیت ذیل بھی قابل توجہ ہے :-

نیا خال ہندوی ماموں جان   او رعمو کہئے چچا بکھان

"نیا" کے معتبر معنے دادا یا نانا کے ہیں چنانچہ لغت فرس۔ فرہنگ جہانگیری، رشیدی، چراغ ہدایت اور آنند راج میں صرف یہی معنے دیئے ہیں۔ اور فردوسی علے العموم انہی معنوں میں لاتا ہے۔ مثال :-

درو گر زمانست وما چوں گیا   ہم انش نبیرہ ہمانش نیا

مصنف خالق باری نہایت مشہور اور مستند معنوں کو صرف نظر کر کے غیر معروف بلکہ مشتبہ معنے "ماموں" دیتا ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جو اوپر بیان ہو چکی ہے یعنی ادات الفضلا یا مؤید الفضلا وغیرہ لغات سے نقل کر رہا ہے۔

چنانچہ موید الفضلا میں اس لغت کے لئے لکھا ہے "جد و برادر مادر و برادر بزرگ"
لیکن یہ یاد رہے کہ آخری دو نو معنوں کے لئے ہمارے پاس کوئی معتبر سند نہیں ہے۔
اور غالباً ایسے معنے ہیں جو ہندوستان میں بعض غلط فہمیوں کی بنا پر پیدا ہو گئے ہیں۔

خالق باری جیسی کتاب کی تصنیف کتب لغات کی امداد کے بغیر دشوار ہے لیکن جو لغات مصنف کے پیش نظر ہیں۔ ایسی ہیں جو مغلوں کے عہد سے پیشتر ہندوستان میں لکھی گئی ہیں۔ کیونکہ جو لغزشیں ان کتابوں میں موجود ہیں۔ ان کا عکس خالق باری میں بھی مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ خالق باری ان کتب لغات کے بعد لکھی گئی ہو۔ موید الفضلا ۹۲۵ھ میں کہا جاتا ہے۔ تصنیف ہوتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ خالق باری اس کتاب کی تصنیف کے بہت بعد تالیف ہوئی ہوگی۔

خالق باری کو موید سے موخر ماننے کے لئے ایک اور بھی دلیل ہے جو یہ ہے کہ موید الفضلا میں بعض اوقات فارسی الفاظ کے ہندی مرادفات بھی دیئے گئے ہیں۔ جب ان ہندی الفاظ کا خالق باری کے ہندی الفاظ سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو موید کا تقدم خالق باری پر صریحاً ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ موید کی زبان خالق باری کی زبان سے زیادہ قدیم ہے۔ میں یہاں چند الفاظ کی فہرست مقابلہ کی غرض سے ناظرین کے پیش کرتا ہوں۔

موید الفضلا ۔ حربا = کہرکٹ ۔ داس = ہنسوا ۔ چارمغز = اکروٹ
خالق باری ۔ حربا = گرگٹ ۔ داس = دانتی ۔ جوز خراساں = اخروٹ
موید الفضلا ۔ جوزبوا = جاپہل ۔ بوے = گندہ ۔ خیار = کلھری
خالق باری ۔ جوزبویا = جائےپھل ۔ بوے = باس ۔ خیار = ککڑی

مویدالفضلا - انگوزہ = ہینگ - دبہ = کوپہ - خرس = بھال
خالق باری - انگوزہ = ہینگ - دبہ = کوپا - خرس = ریچھ
مویدالفضلا - خنور = کوٹھی - دوغ = چھاچھ - آسمانہ = چھتہ
خالق باری - کندو = کوٹھیا - دوغ = مہی - سقف = چھت
مویدالفضلا - فانہ = جنوائی -
خالق باری - فانہ = جمائی -

لیکن خالق باری کی زبان کے مقابلہ کے لئے میرے نزدیک سب سے مناسب کتاب نصاب سہ زبان یا صمد باری عبدالواسع ہانسوی ہے عبدالواسع عہد عالمگیر کے ایک بزرگ مانے جاتے ہیں۔ ان کی کتاب دستورالعمل معروف بہ رسالہ عبدالواسع نہایت مشہور رہے۔ اور اب بھی درس میں داخل ہے۔ نصاب سہ زبان ایک نہایت دلچسپ کتاب ہے۔ اس میں التزاماً ہر مصرع میں تین تین لفظ عربی، فارسی اور ہندی کے بالترتیب یکے بعد دیگرے دئے گئے ہیں۔ ساتھ ہی متناسب الفاظ کو علیحدہ علیحدہ عنوان کے نیچے بیان کر دیا ہے مثلاً لغات اعضائے انسان۔ اجناس غلہ۔ میوہ جات۔ ترکاریہا و گلہا۔ ادویات وغیرہ وغیرہ خاتمہ میں مصادر مشہورہ وغیر مشہورہ دے دیئے ہیں۔ اب خالق باری اور نصاب کی زبان میں بہت کم فرق دیکھا جاتا ہے۔ اکثر الفاظ دونوں میں عام ہیں۔ لیکن چونکہ عبدالواسع ہانسی کے متوطن ہیں۔ جہاں ہریانی زبان کی اشاعت ہے۔ غالباً اس اثر میں عبدالواسع بعض ایسے الفاظ (اگرچہ ہندی ہیں) دے جاتے ہیں۔ جن سے موجودہ اردو خواں واقف نہیں۔ ذیل میں خالق باری اور نصاب کے مابہ الامتیاز الفاظ کی ایک فہرست دی جاتی ہے:-

خالق باری - فانہ = جمائی - تپ = جوڑی - راسو = نیول -

نصابِ سہ زبان	فانہ = جبنھائی	تپ = جرڑ	راسو = نیولا
خالق باری	روباہ = لونکڑی	شیر = سینہہ	امید = آس
نصابِ سہ زبان	روباہ = لونبڑی	شیر = باگھہ	امید = آسا
خالق باری	نیا = ماموں	مردمک = پوتلی	لب = ہونٹھ
نصابِ سہ زبان	نیا = دادا	مردمک = بنزی	لب = ادھر
خالق باری	گوش = کان	رخسار = گال	انگشت = اونگلی
نصابِ سہ زبان	گوش = سرون	رخسار = کپول	انگشت = انگری
خالق باری	پاے = پانو	مادر = ماں	پیشانی = کپار
نصابِ سہ زبان	پاے = چرن	مادر = مہتاری	پیشانی ماتھا
خالق باری	چشم = نین	پہلو = پانسلی	
نصابِ سہ زبان	چشم = لوچن	پہلو = پانسلی	

دونوں کتابوں کی زبان پر غور کرنے سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ خالق باری نصاب سے چنداں مقدم نہیں ہے ÷

آخر میں ایک اور امر کی طرف بھی توجہ دلائی جاتی ہے کہ موجودہ خالق باری کا متن جس میں علیگڑھ کا نیز بازاری اڈیشن شامل ہیں۔ چنداں قابلِ اعتبار نہیں معلوم ہوتے۔ مولوی محمد امین صاحب چریا کوٹی نے اگرچہ نہایت جانفشانی سے اپنا نسخہ مرتب کیا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے انہوں نے زیادہ تر مطبوعہ نسخوں پر اعتبار کیا ہے۔ اور قلمی نسخوں کی طرف توجہ نہیں کی۔ اس لئے ان کا نسخہ اگرچہ بازاری نسخوں کے مقابلہ میں بہتر مانا جا سکتا ہے۔ تاہم مستند نہیں ہے۔ کیونکہ بمرورِ زمانہ مطبوعہ نسخوں میں بہت کچھ ترمیم و تنسیخ اور حک و اصلاح ہوگئی ہے۔ خالق باری کی قدیم ترتیب اور اشعار کی تنظیم بالکل

برباد کر دی گئی ہے اور رفتہ رفتہ بعض اغلاط بلکہ یوں کہیئے مصنوعی لغات اس میں شامل ہو گئے ہیں۔ مَیں یہاں صرف چند مثالوں پر قناعت کرتا ہوں *

علیگڈھ اور بازار کے نسخوں میں ایک مصرع ۔

"تابہ گزکان است کڑاہی و توا"

آتا ہے جس میں "گزکان" نے مصنوعی لغت کی حیثیت اختیار کر لی ہے گزکاں اس صورت میں آنند راج ۔ برہان ۔ نفائس ۔ رشیدی اور جہانگیری میں نہیں ملتا البتہ قازقاں ۔ قزقاں اور گزغاں بمعنی "دیگ بزرگ مسین" ملتا ہے ۔ ترکی زبان کا لفظ ہے امیر خسرو فرماتے ہیں ؎

دلے یا اینہمہ زیں خوان خالی شستہ بہ دستم

کہ حلوائے رضا پختہ نگردد اندریں گزغاں

قلمی نسخوں کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے مصرع بالا میں "گزغاں" دراصل لکھا تھا ۔ اسی طرح مصرع ع

ہندوی کھانڈا کھاوے اُن من (یا آن من) میغ

میں "اُن من" یا "آن من" ایک حیرت میں ڈالنے والا لغت بن گیا ہے ۔ مولوی محمد امین صاحب بھی اس لفظ کی تشریح سے عاجز ہیں اور تجویز کرتے ہیں "قیاس یہ چاہتا ہے کہ یہ لفظ "امنڈ" ہے ۔ اس صورت میں وزن عروضی درست ہو جاتا ہے" لیکن اس کے معنے جو مولوی صاحب "بادل کا گھر آنا" بیان کرتے ہیں ۔ چنداں چسپاں نہیں ۔ مگر قلمی نسخوں میں یہ مصرع یوں ہے ع

ہندوی کھانڈا کھاوے ابر میغ

اب وہ تمام گنجلک رفع ہو جاتی ہے ۔ ایک مصرع

"ہم قرنفل لونگ راکیکر بجواں"

میں کیکر کو پنجابی لفظ بتایا گیا ہے۔ چنانچہ تمام نسخوں میں اس کو پنجابی لکھا گیا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت خیز یہ امر ہے کہ اہل پنجاب اس لفظ سے اپنی لاعلمی ظاہر کرتے ہیں۔ قلمی نسخوں میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصرع مذکور دراصل یوں ہے ع

"ہم قرنفل لونگ را نیکو پڈاں"

اس سے ظاہر ہے کہ کیکر محض اتفاقیہ ایک مصنوعی لغت بن گیا ہے اور کوئی تعجب نہیں۔ اگر لفظ 'نیکو' ترقی معکوس کرتا ہوا کیکر بن گیا ہو۔

شیخ شرف الدّین احمد یحیٰی منیری

ہندوستان کے مشاہیر اولیا سے ہیں۔ ابتدا میں سلطان المشائخ نظام الدین اولیا کے مرید ہونے کی نیت سے ۷۲۵ھ میں دہلی آئے۔ لیکن اس وقت تک ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ آخر دہلی ہی میں شیخ نجیب الدین فردوسی کے مرید ہو گئے۔ بہار جا کر مدتوں کوہ راجگیر میں ریاضت و عبادت میں مشغول رہے ۷۸۲ھ میں وفات پائی۔ اور میر اشرف جہانگیر سمنانی نے نماز جنازہ پڑھائی تصنیفات کے سلسلہ میں آپ کے ملفوظات و مکتوبات موسوم بہ معدن المعانی کتاب ارشاد السالکین اور شرح آداب المریدین مشہور ہیں۔ شرف نامۂ احمد منیری، ابراہیم بن قوام فاروقی نے آپ ہی کے نام پر سلطان باربکشاہ ۸۶۲ھ و ۸۷۹ھ والی بنگالہ کے عہد میں لکھا ہے۔ شیخ شرف الدین بھاشہ میں بھی شاعری کرتے تھے اور شرف آپکا تخلص تھا۔ ذیل میں آپکا ایک "کج مندرہ" جو انواع امراض کے لئے مفید بتایا جاتا ہے۔ نقل کرتا ہوں۔ ان کے دو دوہرے اس کج مندرہ میں بھی موجود ہیں۔ علاوہ ازیں کج مندرہ اس عہد کی اردو کا بھی ایک اچھا خاصہ نمونہ ہے:۔

کج مندرہ از شاہ شرف الدین احمد یحیٰی منیری بر جمیع امراض کہ دریں فرکر بنشود مجربست از علت خشک جھاڑا بکند۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی محمد واٰلِ محمد صاحب التاج والمعراج والبراقِ اِسْمہٗ جِسْمہٗ مُطَھَّرٌ منور مَولی الثقلین

صاحب العلم والحلم دافع البلاءِ والوباءِ ابوالقاسم محمد
بن عبداللہ صاحب العرب والعجم۔ یاایھا المشتاقون
الذین اٰمنوا بنورِ جمالہٖ صلوا علیہ وآلہٖ وسلموا تسلیمًا
کثیرًا کثیرًا برحمتک یاارحم الراحمین۔ بسم اللہ
شافی بسم اللہ المعافی بسم اللہ الکافی بسم اللہ
خیرالاسماءِ بسم اللہ الذی لا یضر مع اسمہٖ شیئٌ
فی الارض ولا فی السماءِ وھوالسمیع العلیم۔ اوانکارا وثنا
کرتا بیدن ہرثاوہی ایک سرجن ہار دوجات تین تلوک۔ چار بید پانچ پنڈ وچھ تارک
سات سمندر آٹھ بس نوگرہ دس راون۔ اگیارہ رودر بارہ راس۔ تیرہ تنبول
چودہ بھون پندرہ تتھ۔ سولہ کلا چار کہاں چار بان پانچ بھوت آت
تان نوئے ناتہ چوراسی سدّ دیا چوسٹھ جوگنی اشٹ کوڑی ناگ تی تیس
کوڑی دیوتا چوراسی سخن سرجیو جنت اکاس پاتال مرت منڈل رات دن
پھر کہری ڈنڈ بی ڈنڈ پلا پیپلا جوک مہورت میں تئیس ساکھی دھرت ہوں جو
کچھ فلانے کے پنڈ پران میں ہوی راہ کا بات کا کوتے کا پوکہر کا اندھیاری
کا اجیالی کا چوت کا پھیت کا کیئے کا کرائے کا بھیجے کا بجائے کا لاتکھے کا
الکھیں کا دیو دانو بھوت پلیت راکس بھوکس ڈائن ڈکن ساکھن کچن چوڑیل
میل ملان جان بھوان ڈبنہ موٹھ تپ تجاری جاڑا جوڑی الکھوری بھکوڑی کدھینلا
مروٹ آدا دلھکی کرکری آدھا سیسی آدبسیسی نہر داڈھرداکل سوا کچھ دی پلہی
اٹھارہ کوڑہ اٹھارہ پرمیو ہوک سوک جلندر کنٹھ دہر ریس پیس کوڑہ
کشٹ آلوں لوہو بلغم پی چش مرکی کہی کہا گلنٹی پھرکی باؤ گولا۔ سرخ باد
سبز باد سیاہ باد زرد باد دہفتاد دو باد ہر بادے کہ باشد در وجود فلاں جن آکار

دہس سہے دوہائی سلیمان بن داؤد پیغمبر کی جل بھسمنت ہو بیک بلا جائے
بیک بلا جائے ثا تر سوا لاکھ پیغمبر کا بجر تھا پ نسے ثا تہ چوراسی سدھا کا
سراپ چی چی کرنت تی تی مرنت دہائی شاہ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کی بحق
کٓهٰیٰعٓصٓ حٰمٓ عٓسٓقٓ وبحق لم یلد ولم یولد ولم یکن لہٗ
کفوًا احد وننزل من القراٰنِ ما ھُوَ شفاءٌ وَّرحمۃٌ
للمؤمنین وَلَا یزید الظالمین اِلّا خسارًا

کالا ہنسا زلا بسے سمند رتیر
پنکہ پیاسے بکہ ہرے زہل کرے مریر
درد رہے نہ پیر

بحق لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ محمّد رّسُوْلُ اللہ ایں دوہرہ را سہ بار بخواند

شرف حرف ایل کہیں درد کچھو بسائے
گر دچھویں دربار کی شو درد دور ہو جائے

(از بیاض مملوکۂ مولوی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار)

شاہ کبیر یا کبیر داس

یہ ذات کے جولاہے اور بنارس کے رہنے والے ہیں کہتے ہیں کہ اُن کی وفات پر مسلمانوں نے انہیں رسوم اسلام کے مطابق دفن کرنا چاہا۔ اور ہندوؤں نے اپنے مذہبی طریق پر جلانا چاہا۔ اس سے کم از کم دونوں قوموں میں ان کی ہردلعزیزی مسلم ہے صاحب دبستان نے جو حالات لکھے ہیں وہ زیادہ تر ہندو ذرائع سے ماخوذ ہیں۔ ان میں انہیں راما نند کا چیلہ بتایا گیا ہے۔ ہندی نورتن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔ لڑکے کا نام کمال اور لڑکی کا نام کمالی تھا۔ کبیر کے کلام میں قدم قدم پر مسلمانی اثر نمایاں ہے۔ اگرچہ اس کا کلام کبیر پنتھیوں اور ہندوؤں کی مزاولت میں رہنے سے بہت کچھ مسخ ہو گیا ہے اور اکثر غیر کبیری کلام اس میں شامل کر دیا گیا ہے تاہم مسلمان صوفیوں اور کبیر کے کلام میں بہت کم فرق دیکھا جاتا ہے۔ اکثر امور میں وہ صوفیوں کے ہم آواز ہے۔ عشق الٰہی۔ ذکر۔ فنائیت۔ محویت۔ حیرانی۔ ترک وتجرید۔ موت کی یاد۔ دنیا کی بے ثباتی۔ ہمہ اوست جو صوفیہ کے ممتاز مضامین ہیں۔ کبیر کے ہاں عام ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اس کے اکثر اشعار ہمیں مسلمان شعرا کی یاد دلاتے ہیں۔ حافظ شیرازی کہتے ہیں ع

ہر کسے پنج روزہ نوبت اوست

کبیر کہتے ہیں ع کبیر نوبت آپنی دن دس لیہو بجاے

فردوسی کا شعر ہے ؎

چہ بندی تو دل بر سرائے فسوس کہ ہر زماں ہمی آید آواے کوس

کبیر کہتے ہیں ؎

کبیر سرپر سراے ہے کیا سوئے سکھ چین   سوانس نگارا کوچ کا باجت ہے دن رین

ابُوالفرج کہتا ہے ؎

ہر کس بقدر خویش گرفتار محنت است   کس راندا دہ اند برات مسلمی

کبیر کا قول ہے ؎

راجا دکھیا پرجا دکھیا جوگی کو دکھ دونا ری   کہے کبیر سنو بھائی سادھو کوئی مندر نہیں سوناری

مولانا روم ؎

چشم بند و لب بہ بند و گوش بند   گر نہ بینی سرّ حق بر من بہ خند

اور کبیر ؎

دیکھ رہی دیکھ تجھ میں تیرا دھنی دم کو روک دِ بدار پائے

دم کو روک اور مول کو بند کر چاند سورج گھر ایک آئے

کبیر کا یہ شعر ہمیں عمر خیام کی یاد دلاتا ہے ؎

ماٹی کہے کمہار کوں تو کیا روندے موہیں   اک دن ایسا ہو دیگا میں روندونگی توہیں

کبیر کی زبان اُردو سے بہت ملتی جلتی ہے۔ دس فی صدی سے زیادہ اس کے ہاں فارسی الفاظ ہیں۔ بلکہ ایسے فارسی محاورے جو اُردو کے ذریعہ سے عام میں رائج تھے۔ اس کے ہاں موجود ہیں مثلاً نوبت زدن فارسی محاورہ ہے۔ کبیر نے اس کا ترجمہ نوبت بجانا کر لیا۔ اسی طرح "نلیشہ بر پا زدن دخوردن" فارسی کا ایک اور محاورہ ہے۔ کبیر اس کا بھی استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ ؎

دین گنوایو سنگ دُنی دنی نہ چالی ساتھ   پانو کلھاڑی مار یا مورکھ اپنے ہاتھ

فارسی کی ضرب المثل ہے :۔ ؎

کہ زنگی بشستن نگردد سفید

کبیر اپنے انداز میں یوں لکھتا ہے :۔

کویلا ہوے سنا وجر و نو من صابن لاے

ان چند امثال سے جو یہاں دکھائی ہیں۔ ظاہر ہوتا ہے کہ کبیر اپنے تخیل۔ جذبات اور مقولات میں بہت کچھ مسلمانوں کے زیر اثر ہے۔ اور کیا اس کی تربیت مسلمانوں میں ہوئی ہے۔ لیکن جس طرح حضرت عیسٰی نے یورپ پہنچ کر یورپین خط و خال پیدا کر لئے ہیں۔ اسی طرح کبیر کے کلام نے ہندوؤں کی صحبت میں رہ کر ہندوانی شکل اختیار کر لی ہے۔ کبیر کے معتقدین نے یہی نہیں کیا ہے بلکہ ایک قدم اور بلند پروازی کی ہے۔ یعنی کبیر کے نام پر ایسے ابیات اور نظمیں شائع کی ہیں جو اسلام پر حملہ ہیں۔ مثلاً یہ شعر کبیر کے نام پر شہرت رکھتا ہے ؎

کانکر پاتھر جوڑ کے مسجد لینی بنا ے تا چڑھ ملا بانگ دے بہرا ہوا خدا ے

کیا یہ سمجھا جائے کہ کبیر جو مسلمان اور مسلمان زادہ تھا اور مسلمان گھر کا پرورش یافتہ اذان جیسے معمولی رکن اسلامی کی غایت اصلی سے ناواقف محض تھا۔ مسلمانوں کا بچہ بچہ تک جانتا ہے کہ اذان کا مقصد اعلان نماز ہے۔ تاکہ نمازی بروقت جمع ہو جائیں۔ نعوذ باللہ یہ مقصد نہیں کہ خدا بہرا ہے۔ اسی طرح ایک اور شعر ہے۔

؎ مسلمانوں کے پیر اولیا مرگی مرگا کھائی

خالا کی ری بیٹی بیاہیں گھر ہی میں کر بس گائی

اس شعر میں پہلا اعتراض مرغا مرغی کے ذبیحہ پر ہے۔ دوسرا اعتراض خالہ کی بیٹی بیاہنے پر۔ یہ اعتراض محض ہندو نقطۂ نظر سے ہیں۔ اور ہر وہ شخص جس نے مسلمانوں میں پرورش پائی ہے اس کو لغو سمجھیگا۔ کبیر ایک صاحب ترک و تجرید شخص ہے اس کے مسلک کو ایسے فریقی مسائل سے کوئی لگاؤ نہیں۔ کبیر اپنی اصلی نظموں میں اپنے آپکو مسلمان جولاہہ کہتا ہے۔ اس کی ایک نظم میں وہ بار بار اپنے آپ کو مسلمان جولاہہ کہتا ہے۔ جس کا پہلا مصرع یوں شروع ہوتا ہے:۔

"مسلمان جولاہہ ایک"

دُوسرا مصرع مجھ کو یاد نہیں رہا۔

کبیر کا بارہ ماسہ راقم کے پاس موجود ہے۔ جو انہوں نے اپنے مرید سیّد مراد کی فرمایش پر لکھا ہے۔ اِس میں سمت تصنیف سمت ۱۱۳ دیا ہے۔ جو غالباً کوئی اور سمت ہے۔ میں اس کا ابتدائی بند یہاں نقل کر دیتا ہوں :۔

پیہ کی نیہا نیک نہیں پائی سبھی عمر میں کھیل گنوائی بناں پیہ کھو یو زنا پا گئی بیس اب آیو بوڑہا پا

پیہ کو سمرن کچھو نہ کینیاں جھن جھن بیھی انت جبیا گور کی بچن نیک نہیں مانی ساٹھ برکھ میں جات نجانی

جن گورو بچن ساتھ گورما نا چیلا سید مراد سیانا برہی نام کبیرا دیو سنت بچن اکارتھ کھویو

تے جگ کو ان آے سنائے مانس مانس میں جی دکھ پائے کہدیو موکوں بارہ ماسہ موسوں کہی مرہ یہ آسا

بارہ ماسہ میں کہوں پنڈت دیوا سیس برہی سمت ہے بھیو گیارہ سے اُونتیس

صاحب مخزن الاصفیا (صٓ ۴۴۶) کبیر کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"مرید و خلیفۂ شیخ تقی است از اولیاء اللہ و مشاہیر عہد خود است و جمالِ ولایت را در طریقِ ولایت مستور داشتے و در موحدان وقت خود ممتاز بود و اورا در زبان ہندی کلام بسیار عالی است کہ بر علو درجات او وال است و اگر در کلام او تفحص و تجسّس کردہ آید نوعے از قسم وصال یا فتہ مے شود و فراق را در ساحتِ وصلت او اصلا عبور نیست۔ و اول کسے کہ بزبان ہندی حقائق و معارف بیان فرمودہ اوست و انواع اشعار ہندی دارد لیکن اکثرے از جنس بشن پد و ساکھی از وے منقول است و اگر بنظر انصاف بہبینی جواہر دقائق و لآلی حقائق بمیزان سنجیدہ است کہ مثل آں در کلام دیگرے یافتہ نمیشود...... واز قوت باطنی او آنکہ اہل اسلام و ہنود ہر دو فریق بر اعتقاد کامل دارند و از خود شمارند۔ چنانچہ در اہل اسلام

بہ پیر کبیر در ہنود بہ بھگت کبیر اشتہار دارد"

شیخ عبدالحق اپنے دادا شیخ سعد اللہ متوفی ۹۲۸ھ کی رائے کبیر کے متعلق ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:۔

"عمی میفرمودند روزے از ایشاں پرسیدم ایں کبیر مشہور کہ سخن پرہا ے وے میخوانند مسلمان بود یا کافر؟ فرمودند موحد بود۔ عرضہ کردم کہ موحد مگر غیر کافر و مسلمان است؟ فرمودند فہم ایں معنی دشوار است خواہید فہمید"

(اخبار الاخیار ص۳۰۳)

کبیر کے زمانۂ وفات کے متعلق بہت کچھ اختلاف ہے۔ اکثر مصنفین ان کو سلطان سکندر لودھی کے عہد میں مانتے ہیں۔ مثلاً ابوالفضل اور صاحب دبستان المذاہب اس طرح ان کی وفات دسویں صدی ہجری کے پہلے ربع میں ہونی چاہئے۔ لیکن سرکاری آرکیالوجیکل رپورٹ آثار قدیمہ و مخطوطات صوبۂ شمال و مغربی واودہ (ص۲۲۴) میں لکھا ہے کہ بجلی خاں نے کبیر کا روضہ موضع مگھر ضلع بستی میں (جہاں کبیر وفات پاتے ہیں) ۱۴۵۰ء میں طیار کرایا (جو سال ۸۵۴ھ کے مطابق ہے) اور ۹۷۲ھ میں فدائی خاں نے بعہد اکبر اس روضہ کی مرمت کرائی۔ شاہِ کبیر کی یادگار میں ایک مسجد شہر جونپور میں بابا بھیک نے ۹۹۱ھ میں تعمیر کی ہے۔ کبیر کی اوقاف کے لئے دو گانو شاہی زمانہ سے معافی میں چلے آتے ہیں۔ ایک گانو مسلمانوں کے قبضہ میں ہے اور دوسرا ہندوؤں کے قبضہ میں۔ کبیر کے مزار کے برابر ہندوؤں نے کبیر کا سمادھ بنا رکھا ہے۔ سمادھ میں ایک سادھو رہتا ہے۔ اور مزار پر مسلمان مجاور ہیں +

کبیر کی تحریک ان اثرات کی آواز بازگشت ہے جو اسلام کی موجودگی سے ہندوستان میں بروئے کار آئے ہیں۔ کبیر کی آواز توحید کی نشر و اشاعت

اور بُت پرستی کی بیخ کنی میں نہایت مفید ثابت ہوئی ہے۔ اور ہندوستان کے
ایسے مذاہب پر جو اس کے بعد وجود میں آئے ہیں اس کا اثر نہایت گہرا ہے
مثلاً کبیر پنتھیوں کا وہ پیشوا مانا جاتا ہے۔ دادو پنتھیوں، ستنامیوں اور نانک
پنتھیوں پر بھی کبیر کا پرتو نمایاں ہے۔ مسٹر بوس کا بیان ہے کہ کبیر نے ہندوستان
کی بارہ تیرہ مذہبی تحریکات پر اثر ڈالا ہے۔ بلحاظ شاعری اس کا پایہ بہت
بلند ہے۔ ہندی زبان کا درحقیقت پہلا بڑا شاعر ہے۔ اس کا کلام سادگی،
تاثیر، صفائی، جدت، معنی آفرینی، سوز و گداز اور شیرینی ادا کے اوصاف
سے آراستہ ہے۔ کبیر کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ دقیق سے دقیق خیال کو
چند معمولی الفاظ میں ادا کر سکتا ہے۔ جس کو خواندہ و جاہل اور عامی و عالم
سب سمجھ سکتے ہیں۔ اور اسی کمال کی بدولت اس کو دائمی شہرت کا تاج مل گیا
ہے۔ تلسی داس اور سورداس اگرچہ کبیر سے بہت بعد گذرے ہیں۔ لیکن ان کا
کلام اس قدر دقیق اور عالمانہ ہے کہ ہم اس کا اکثر حصہ سمجھنے سے قاصر ہیں
لیکن کبیر کے ہاں یہ دقت محسوس نہیں ہوتی۔ اگرچہ اس کا وطن بنارس ہے
لیکن اس نے وہ زبان استعمال کی ہے جو اس زمانہ میں عوام الناس کی زبان
تھی۔ اسی لئے اس کا کلام اُردو کے اس قدر قریب ہے کہ آج بھی اس کا
سمجھنا دشوار نہیں۔ کبیر کی تصنیفات سے بعض ریختہ بھی مشہور ہیں۔ اسی
طرح اس نے فارسی بحروں میں بھی لکھا ہے۔ اور دیکھا جاتا ہے کہ بعض موقعوں
پر اس نے ردیف و قافیہ کی بھی پابندی کی ہے۔ میں یہاں دو مثالیں درج
کرتا ہوں:۔

خلق سب رین کا سپنا، سمجھ من کوئی نہیں اپنا ‏ ‏ کٹھن یہ موہ کی دھارا، بہا سب جات سنسارا
گھڑا جو نیر کا پھوٹا، پتا جو ڈار سے ٹوٹا ‏ ‏ اس ترجات جندگانی بھی لگا بھی ہانی

بھُولو مت دیکھ تن گورا جگت میں جیونا تھورا — تجو بدلو یہ چترائی رہو تھ سنگ جگ مانہیں
تکس جیب پران جا دینگے کوئی نہیں کام آدینگے — جسن پر وارست وارا اُسی دن ہوئینگے نیارا
آ اِس نر جسان یہ بہا لگالے نام سے نیہا — سکٹے جسم جال کی پھانسی کہے کبیرؔا بی ناسی

(کبیر بچنا ولی ص ۱۸۳)

دیگر

سنتا نہیں دھن کی خبران حد باجا باجتا — رسمند منڈ ر گا جتا باہر سُنے تو کیا ہوا
گانجا افیم و پوستا بھنگ و شرابیں پیو تا — اِک پریم رس چاکھا نہیں املی ہوا تو کیا ہوا
کاسی گیا اَور دوار کا تیرتھ سکل بھرم پھرے — گانٹھی نہ کھولی کپٹ کی تیرتھ گیا تو کیا ہوا
پوتھی کتابیں بانچتا اوروں کو نت سمجھاوتا — ترکوٹی محل کھوجے نہیں بک بک مرا تو کیا ہوا
قاضی کتابیں کھوجتا کرتا نصیحت اور کو — محرم نہیں اس حال سے قاضی ہوا تو کیا ہوا
شطرنج چوپڑ گنجفہ اک نرد ہے بدرنگ کی — بازی نہ لائی پریم کی کھیلا جوا تو کیا ہوا
جوگی دگمبر سے بڑا کپڑا رنگے رنگ لال سے — واقف نہیں اس رنگ سے کپڑا رنگا تو کیا ہوا
من رتھ جوکے راوٹی گل چمن میں ہنستے سدا — کہتے کبیرا ہیں سبھی گھٹ گھٹ ابن صاحب رم رہا

(کبیر بچنا ولی)

یہ نظمیں اچھی خاصی اُردو کہلائے جانے کی مستحق ہیں۔ لیکن مجھ کو شبہ ہوتا ہے کہ وہ کبیر کی نہوں۔ اور بعد میں کبیر کی طرف منسوب کردی گئی ہوں۔ بات یہ ہے کہ ہندی ادبیات میں ہم ہر قسم کی ابتری اور آشوب سے ملاقی ہوتے ہیں۔ قدما کے حالات اور اُن کے سنین حیات و ممات سے ہندی ادیب اکثر بے خبر ہیں۔ اسی طرح اساتذہ کے اصلی اور غیر اصلی کلام کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ اب اسی کبیر کی طرف اسّی بچاسی تالیفات منسوب ہیں۔ خدا جانے ان میں کتنی کبیر کی ہیں اور کتنی الحاقی اسی طرح اپنے ادبی ذوق کی قدامت ثابت کرنے کی دھن میں وہ ہر لغو دستاویز کو بھی راج

اور اُس کے جانشینوں کے عہد کی ماننے کیلئے تیار ہیں ۔

میرا خیال ہے کہ کبیر کے بعد بھی کبیر کے نام پر برابر نظمیں لکھی جاتی رہی ہیں کیونکہ بعض نظموں میں ایسی اشیا اور چیزوں کا ذکر آتا ہے۔ جو کبیر کے عہد میں رائج نہ تھیں۔ مثلاً بندوق۔ تماکو اور دُوربین۔ بندوق اگرچہ دکن میں پہلے سے رائج تھی۔ لیکن ہندوستان میں بابر کے عہد تک بھی بہت کم معلوم تھی۔ اور عام استعمال میں ہرگز ہرگز نہ تھی۔ تنباکو ہندوستان میں اکبر کے عہد میں آتی ہے۔ اور دوربین تو گذشتہ صدی میں یورپین لاتے ہیں۔ میں اُن کی مثالیں ذیل میں عرض کرتا ہوں ؎

تیر تپک سے جو لڑے سو تو سور نہ ہوے
مایا تیج بھکتی کرے سور کہائے سوے (کبیر بیجا دلی ۲۹)

دیگر ؎

کب تارو بندوق چلایا داس دیو کب بنب بجایا (کبیر بیجا دلی ۱۶۹)

دیگر:- ؎ بھنگ تماکو سلفا گانجا سو کھا کھوب اڑایا ہے (کبیر بیجا دلی ۱۲۵)

دیگر:- ؎ نفرے دوارے دوربیں لگا ہے اترے بوجھل پار (" ۱۰۱)

شیخ بہاء الدین باجن متوفی ۹۱۲ھ

منتسب آخر قرن نہم کے بزرگ ہیں۔ اور شیخ رحمت اللہ گجراتی بن مخدوم شیخ عزیز اللہ متوکل کے مرید ہیں۔ صاحب خزینۃ الاصفیا شیخ عزیز اللہ کے مرید بتاتے ہیں (ص ۱۱۲) شیخ رحمت اللہ محمود بیکڑہ ۸۶۳ھ و ۹۱۹ھ والی گجرات کے پیر ہیں۔ شیخ بہاء الدین کے والد کا نام معز الدین ہے۔ اور مزار برہان پور میں ہے اُن کے بھائی میاں میناں بھی شیخ رحمت اللہ ہی کے مُرید تھے۔ سال وفات بقول تذکرۂ گلزار ابرار ۹۱۲ھ ہے کچھ مدت سیاحی بھی کی ہے۔ ادھر گجرات سے سندھ و خراسان تک گئے۔ ادھر جزیرۂ سیلان تک پہنچے +

شیخ باجن ہندی و فارسی میں اشعار لکھتے تھے۔ اور باجن تخلص کرتے تھے۔ باجن کے معنے ہندی میں ساز کے ہیں۔ اُنہوں نے فارسی زبان میں ایک تصنیف اپنے پیر کے حالات اور مریدوں کی ہدایت میں لکھی ہے۔ اور اس میں اپنے اشعار کثرت سے لائے ہیں۔ باجن پہلے شخص ہیں جنہوں نے اُردو زبان کو "زبانِ دہلوی" کے نام سے یاد کیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو اِن ایام میں بھی برج بھاشہ سے علیحدہ مانی جاتی تھی۔ ان کے ہاں صرف ایک نمونہ اس اُردو کا ملتا ہے۔ میں اس کو اس سے پیشتر انہی صفحات میں نقل کر چکا ہوں۔ نمونۂ کلام:

مناجات ؎

روزے دھر دھر نماز گذاری دینی فرض زکوٰۃ
بن فضل تیرے چھوٹک ناہیں آگیں کا ہمیں بات

دوہرہ ؎

بھونرا لیوے پھول رس سیا لیوے باس
باجن ملے سینچے آس کر جیوں راکھے داس

دوہرہ ؎

نہ اسے جنیا نہ وہ جایسا ناوہ مائی باپ کہلایا باجن سبہا شہ آپ نہ پایا پرگٹ ہو پر آپ لگایا

دوہرہ ؎

باجن وہ کسی سر کہا نہیں اور اس سر کہیا نہیں کوے جیسا کوئی من منہ چنت ہے ویسا ابھی نہوے

دوہرہ ؎ باجن جو کیسیکے عیب ڈہانکے اِس تھے درجن تھر تھر کانپے

نعمت علی اس تھے پائی۔ یئں چپایں (کذا) انکھیاں جا پی نچائی

دوہرہ ؎

باجن بھکیاری بکہسان کرے گا وہ اپنی بہیک کارن کچہ کچہ کہیگا

جو کچھ قسمت میں ہے سوہی لہیگا گداکوں تبوہی براتا رہے گا

دیگر ؎

محمدؐ سرور پرم کا رحمت اللہ بھریا باجن جیوڑا وار کر سر آگین دھریا

عقدہ ؎

ایک آپین جاگتہ اورن بھی جگا دشہ پھرسے پھرسے سیدہ سنادنہ

النک النک بیٹھی ہے چوکیاں جاگو لوکا جاتی رات

دوہرہ ؎

باجن کوئی نجانے وہ کدتھا او کہ تھے پرگٹ ہوُا

وہی جانے آپ کوں جب تھے پرگٹ ہوُا

قطبن

اصلی نام معلوم نہیں۔ تخلص قطبن ہے اور بھاشا کے سربرآوردہ شاعر ہیں
ان کے متعلق میری اطلاع کا تنہا ماخذ ناگری پرچارنی سبھا بنارس کی ۱۹۰۳ء
کی رپورٹ ہے جو سیام داس صاحب بی۔ اے آنریری سکریٹری سبھا مذکور نے
تیار کی ہے اور یو۔ پی کی گورنمنٹ نے اپنے خرچ اور حکم سے چھپوائی ہے۔ سبھا
کی یہ رپورٹیں جو صرف ہندی مخطوطات سے تعلق رکھتی ہیں ۱۹۰۰ء سے
شروع ہوتی ہیں۔ ابتدا میں سالانہ رپورٹ شائع ہوتی رہی۔ بعد میں سہ سالہ رپورٹ
کی شکل میں تبدیل کر دی گئی۔ اور مسٹر سیام داس ہی اڈیٹر رہے ہیں۔ یہ رپورٹیں اب تک
مسلسل شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان رپورٹوں نے ہندی قلمی ادبیات کی تلاش
اودھ۔ بہار۔ اضلاع متحدہ۔ مالوہ۔ راجپوتانہ اور بندیل کھنڈ وغیرہ میں جاری
رکھ کر جہاں جہاں قلمی ذخائر کا سُراغ لگا اُن کی فہرست اپنے ذیل میں شامل کر لی
ہے۔ ان فہرستوں سے ہندی کے ذخیرہ پر ایک نہایت ہی حیرت بخش روشنی
پڑی ہے۔ اور سینکڑوں نادر اور نامعلوم کتابیں دریافت ہوئی ہیں۔ درحقیقت
ناگری پرچارنی سبھا نے یہ ایک نہایت مفید کام ہے جو تکمیل کو پہنچایا ہے۔
طباعت کے مصارف گورنمنٹ صوبۂ متحدہ نے برداشت کئے ہیں۔ ہم مسٹر
سیام داس کو اُن کی محنت۔ ہمت ذوق اور استقلال کامل پر جو انہوں نے ہمارے
وطن کے مخطوطات کے تحفظ میں دکھائے ہیں، مبارکباد دیتے ہیں۔ اور
دعا کرتے ہیں کہ اُردو کے میدان میں بھی خدا مسلمانوں کو یہی توفیق عطا
فرمائے۔

ناگری پرچارنی سبھا کی تازہ دریافت کردہ کتابوں میں قطبن کی تصنیف مرگاوتی بھی شامل ہے۔ یہ ایک نظم ہے، جو محمد جائسی کی پدماوت کی طرح ایک عشقیہ افسانہ ہے۔ قصہ کا خاکہ مسٹر شیام داس نے اِس طرح بیان کیا ہے:۔

"راجا گنپت دیو چندر گیری کے راجہ کا فرزند شہزادی مرگاوتی کے عشق میں مبتلا ہوکر صحرانوردی اختیار کرتا ہے۔ یہ شہزادی کنچنگر کے راجہ روپامرار کی دختر بلند اختر ہے۔ راج کنواری اور کمالات کے علاوہ فن پرواز سے بھی واقف ہے۔ شہزادہ بڑی اور مسلسل مصائب کی برداشت کے بعد شہزادی تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ اور بیاہ ہو جاتا ہے۔ بیاہ کے کچھ عرصہ کے بعد شہزادی یکایک غائب ہو جاتی ہے۔ اور شہزادہ کو اس کی تلاش میں پھر بیابانوں کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔ وہ ایک دریا سے محصور پہاڑی پر پہنچتا ہے۔ اور ایک عورت کو جو کسی راکشش کے قید میں تھی۔ رہائی دلاتا ہے۔ اِس عورت کا نام رکمن تھا۔ رکمن کا والد اس شکرگزاری میں رکمن کا بیاہ شہزادہ سے کر دیتا ہے۔ چند روز کے بعد شہزادہ چھپ کر چل دیتا ہے۔ اور متواتر تکالیف اٹھانے کے بعد اسی شہر میں پہنچ جاتا ہے جہاں مرگاوتی اپنے باپ کی وفات کے بعد اس کی جانشین بنکر راج کر رہی ہے۔ میاں بیوی دوبارہ مل جاتے ہیں۔ اور شہزادہ حکومت میں شریک ہو جاتا ہے۔ دونوں بارہ سال تک نہایت راحت اور آسایش کے ساتھ حکومت کرتے ہیں۔ راجہ گنپت دیو اپنے فرزند کی لمبی جدائی کی تاب نہ لاکر اس کی تلاش میں آدمی روانہ کرتا ہے۔ جو رکمن کے شہر ہوتا ہوا کنچن نگر پہنچ جاتا ہے۔ اور راجہ کا ضروری پیغام شہزادہ کو پہنچا دیتا ہے۔ شہزادہ اپنی بیگم مرگاوتی و خدم و حشم سمیت روانہ ہوتا ہے۔ اور راستہ میں سے رکمن کو لیتا ہوا مع الخیر اپنے باپ کی راجدھانی

پہنچ جاتا ہے۔ شہر میں اس کی آمد پر بڑی خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ اور شہزادہ
کئی برس تک اپنی دونوں بیویوں کے ساتھ بڑے لطف سے زندگی بسر
کرتا ہے۔ ایک دن شہزادہ شکار کھیلنے گیا۔ اور اپنے ہاتھی سے گر کر فوت
ہو گیا۔ اس کی وفادار بیویاں اس کی نعش کے ساتھ جل کر مر جاتی ہیں۔
اور قصہ ختم ہو جاتا ہے"۔

مسٹر سیام داس کی نگاہوں میں اس کتاب کی اہمیت اس لئے بڑھ گئی ہے کہ
ہندی ادبیات کا اکثر حصہ سری رامچندر اور سری کرشن کی مناقب آرائی پر
وقف ہے۔ خال خال ایسے شاعر گذرے ہیں۔ جنہوں نے ملک محمدؐ جایسی
کی طرح عشقیہ افسانوں یا حکایات پر قلم اٹھایا ہے۔ قطبن اس سلسلہ کا غالباً
پہلا ہندی شاعر ہے۔ جس نے جایسی سے بھی سینتیس سال قبل افسانہ نگاری کی
بنیاد ڈالی ہے۔ مسٹر سیام داس کا بیان ہے کہ "قطبن کا سرپرست حسین شاہ
شیر شاہ سور کا باپ ہے"۔ اور حاشیہ میں اضافہ کرتے ہیں کہ "حسین شاہ بعد
میں جونپور کا بادشاہ ہو گیا۔ جب ۱۴۷۸ء میں بہلول لودھی نے جونپور کا الحاق
دہلی کے ساتھ کر دیا۔ حسین شاہ بہار میں جا کر ۱۴۹۴ء تک حکومت کرتا رہا۔ اس
سال سکندر لودھی نے بہار پر حملہ کیا۔ حسین شاہ کو شکست ہوئی اور بھاگ کر
بنگالہ چلا گیا۔ اور کچھ سال بعد وفات کر گیا"۔

یہاں مسٹر موصوف کو تھوڑا سا مغالطہ ہو گیا ہے۔ وہ حسن سور شیر شاہ کے
باپ جاگیر دار سہسرام اور سلطان حسین شرقی والی جونپور ۸۶۳ھ/۱۴۵۸ء و ۹۰۵ھ/۱۵۰۰ء
کو ایک ہی شخص فرض کر رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ قطبن کا سرپرست نہ حسن سور
ہے۔ اور نہ حسین شاہ شرقی ہے۔ اس لئے کہ مرگاوتی محرم ۹۰۹ھ/۱۵۰۴ء کے پہلے
عشرہ میں تصنیف ہوتی ہے۔ اور حسین شاہ شرقی اس سے چار سال پیشتر یعنی

سنہ ۹۰۵ھ (۱۵۰۰ء) میں فوت ہو جاتا ہے حسین سور کو قطبن کا مُربی ماننا بھی دور از کار ہے اس لئے کہ دونوں کے نام مختلف ہیں۔ یعنی مرگا وتی کا مصنف اپنے ممدوح کا نام حسین شاہ بتاتا ہے اور شیر شاہ کے باپ کا نام حسن ہے۔ جو ایک معمولی جاگیردار تھا۔ میرے خیال میں قطبن کا سرپرست علاء الدین حسین شاہ والی بنگالہ ہوگا۔ جس نے سنہ ۸۹۹ھ (۱۴۹۳ء) سے لیکر سنہ ۹۲۵ھ (۱۵۱۸ء) تک حکومت کی ہے۔ یہ بادشاہ ہندی اور بنگالی ادبیات کا ایک سرگرم سرپرست تھا۔

قطبن اپنے مرشد شیخ بڈھن کے ذکر میں کہتے ہیں ؎

شیخ بڈھن جگ سا چا پیر د   نام لیت سدھ ہوئے سریر و

قطبن نام لئی پا دھرے   سر ردی دوہ جگ نہ مرے

پاچھلے پاپ دہوے سب گئے   جھڑیں پرانے اور سب نئے

نیکے بھیا آج اوتارا ۱ ۱   سب سوں بڑ سو پیر ہمارا

جیہ کو باٹ دکھائی ہوئے   پہنچے ایک نمک میں سوئے

دوہرا ؎   گرو ہینتھ دکھاے دین ہے جو چل جانے کوے
نمک ایک میں پہنچے جو مت بھائے سو ہوے

اور حسین شاہ کے لئے کہتے ہیں : ؎

شاہ حسین آہے بڑ راجا   چھتر سنگاسن ان کو چھاجا

پنڈت اوبدھ ونت سیانا   پڑھے پوران ارتھ سب جانا

دھرم دود دسٹل ان کو چھاجا   ہم سر چھاہ جیو جگ راجا

دان دیے اوگنت نہ آئے   بلی اوکرن نہ سربر پائے

ٹلے جہاں لوں گنیے رہ ہیں   سیوا کرہیں یا سب چھہ ہیں
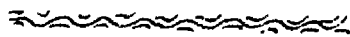
شیخ عبدالقدوس گنگوہی متوفی ۹۴۵ھ

آپ کے والد کا نام اسمٰعیل ہے اور شیخ محمد بن شیخ عارف بن شیخ احمد عبدالحق چشتی صابری کے مرید ہیں۔ اور صاحب تصنیفات کثیرہ ہیں۔ از آنجملہ انوار العیون۔ رسالۂ قدسیہ۔ رسالۂ نور الہدیٰ۔ رسالۂ قرۃ العین اور رشد نامہ ہیں۔ اِن کے مکتوبات مولانا خضر بدہن بن رکن جونپوری نے جمع کیے ہیں۔ ۹۴۵ھ میں وفات پائی۔ وہ ہندی کے بلند مرتبہ شاعر ہیں۔ الکھ داس تخلص کرتے تھے۔ نمونۂ کلام:۔

سرود در پردۂ پوربی ؎

دہن کارن پی آپ سنوارا   بن دہن سکھی کنت کنھارا
شہہ کھیلے دہن ما نہیں ایوان   پاس پھول منہ اچھے جیواں
کیوں نہ کھیلوں تیج سنگ میتا   مجھ کارن تیں اپنا کیتا
الکھ داس آکھے سن سوئی۔   سوئی پاک اریقہ ہن سوئی

سبد ؎

ایک تھیں ہم اننت بھیلی آپی آپ بیاہی   سہجنہ سہجنہ کینا سنہو رانا ایام سسرا جنوائی
دوہرہ ؎ ایک اکیلا آپ سو جس تھیں یہ سنسار   آٹھ پناتھ ھول سوں سبھی ایک انکار

دوہرہ ؎

جدھر دیکھوں ہے سکھی دیکھوں اور نکوی   دیکھا بوجھ بچار منہ سبھی آپیں سوے
جیسو کنہہ آئینہ منہ ٹھیو تیسو پند بندیں زمیو   باہر بھیتر کہا نجانے سرب نرنتر اپکی کاے
جیت پانی ست لٹ تبل اہنس پوجا اچھی پھول   پوجا امرس لادھیو ٹھیو سرب نرنتر آپیں دیو
سبد ؎ جل تھل مہیرا اور اکاس   پی سرب نرنتر تو ہے پاس

توہ چھاڈ پیا کہ کہواں جانوں　　جنہہ رجانوں تنہہ توہ اٹھانوں
باہر بھیتر کہا تجسا ہے　　سرب ترنتر ایکی کا سے ہے
الکھ داس آکھے مور کنت　　دنہہ جاگ سکھی رات بسنت

سبد ـــ جان اجان سبھ کھیلنہ لوئی　　بن پی کھیلے نہ کھیلا ہوئی ہے
جان اجان جاگ کھیلے رے　　ہو ہو ہو ہو ہولی رے ہے
سبھ کھیکنہ سکھی مہہ جان　　سرب ترنترپی پروان ہے
جان اجان جاگ کھیلے بھاگ　　کنت بلیا لیوں ہردے لاگ
الکھ داس آکھے سن تانہاں　　ہم تم کھیلینہ دی گل بانہاں

دوہرہ ـــ

دیکھوں ری من پوچھوں ری دیکھوں نونبانی　　سبھی رنگ نیر کا مایا رنگ سمایا پانی
رہنسی کیونہ ناچوں سکھی پی جی رنگ چرہایا　　تن من جیو ایک نگ دیکھا تو میں آپ گنوایا

عقدہ ـــ الکھ داس آکھے سن لوے　　دوئی دوئی کہو مت بھائی کوئی ہے
جل تھل مہیسر سرب ترنتر　　کورکھ ناتھ اکیلا سوئی

شلوک ـــ　　اپنا شت پرانا شت ناشت کنجت جگترا
بدہ باچا منو ناشت نتر دیوی اکل بتا

سبد ـــ پھلے نہ پھیلے آشے نجا ہے　　کالسی کا سبد کالسی ہی سماے
جل تھیں اپنا بلیلا جل ہیں ماتھ بلاے　　تیسا یہ سینسار سبھ مولنہہ جلے سماے

دوہرہ ـــ

آپ گنوائیں پی ملے پی کہوئے سبھ جاے
اکتھ کتھا ہے پرم کی جے کوئی بوجھے ماے

پرشپرشپرشپرشپرشپرش

شاہ علی محمد جیو گام دھنی گجراتی

سید احمد کبیر رفاعی کی اولاد میں ہیں ۔ اور سید عبدالرحیم کے پوتے ہیں[1] ۔
۱۴ رجمادی الاول ۹۷۳ھ کو انتقال کیا ۔ اور رائیکھر میں متصل روضۂ شاہ عزبی مدفون ہیں ۔ ہندی کے شاعر ہیں ۔ کتاب چشتیہ میں لکھا ہے کہ جب مخدوم بہاء الدین برناوی خاتم التارکین بسبیل سیاحت گجرات تشریف لے گئے ۔ شاہ علیجیو کے مہمان رہے اس قیام کے زمانہ میں میزبان نے اپنا ہندی کلام جو عجیب و غریب اور پُر لذت بحور میں لکھا تھا ۔ سنایا ۔ اور اپنا ایک رسالہ جو نکات و دقائق موحدانہ پر مشتمل تھا ہدیہ دیا ۔

شاہ علیجیو کے کلام کو ان کی زندگی میں اُن کے مرید شیخ حبیب اللہ ابن عبدالرحمٰن القریشی الاحمدی نے ایک مختصر دیباچہ کے ساتھ مدوّن کیا ہے اور اس کا نام جواہر اسرار اللہ رکھا ہے ۔ دیباچہ حسب ذیل ہے :۔

"میگوید بندۂ فقیر وحقیر کہ یکے از کمینہ مریداں دعاگو بحضرت رب العالمین بندگی حضرت قطب الاقطاب العالم والآفاق تاج الافراد سلطان العارفین غوث الاعظم الشریف سلطان سیدی معشوق اللہ الحسینی الرفاعی رضی اللہ تعالے عنہ المسمّی بہ شیخ حبیب اللہ ابن عبدالرحمٰن قریشی الاحمدی کان اللہ لہٗ کہ چند مکاشفات حضرت بندگی سید السادات سیدی وشیخی شیخ العالم الشریف المخاطب

---

[1] تحفۃ الکرام میں سید عبدالرحیم کا پوتا لکھا ہے ۔ لیکن حبیب اللہ شاہ عمر کا پوتا بیان کرتا ہے ۔ بظاہر ہے کہ حبیب اللہ اپنے مرشد کے جد کے نام سے زیادہ صحیح اطلاع دے سکتا ہے

حضرت اللہ تعالیٰ بخطاب سلطان العارفین و سلطان العالم الشریف شاہ علیجیو معشوق اللہ مدظلہٗ ابن شاہ ابراہیم ابن شاہ عمر الحسینی الاحمدی رضی اللہ عنہم .. .. .. دربیانِ توحید و اسرار بالفاظ گوجری بطریق نظم فرمودہ بود دریں مختصر آوردہ و جمع کردہ و آں ملفوظات حضرت سلطان العالم شاہ علی محمد معشوق اللہ المتابت بجواہر اسرار اللہ را بکتاب جواہر اسرار اللہ نام داشتہ"۔

جواہر اسرار اللہ کی یہ پہلی اشاعت ہے جس کا ایک نسخہ دیوانِ عطار (مملوکۂ پروفیسر سراج الدین آذر۔ ایم۔ اے) کے حاشیہ پر مرقوم ہے۔ یہ نسخہ گیارہویں صدی کی ابتدا کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کی دوسری اشاعت شاہ علیجیو کے پوتے سیّد ابراہیم بن شاہ مصطفےٰ ابن شاہ علیجیو نے مرتب کی ہے۔ اس اشاعت کا ایک نسخہ نوشتہ ۱۱۲۷ھ میرے پاس ہے۔ سیّد ابراہیم اپنے دیباچہ میں حبیب اللہ کی اشاعت کا ذکر کرتے ہیں لیکن اس کا نام ابو الحسن شیخ محمد ابن عبدالرحمٰن القرشی الاحمدی لکھتے ہیں۔ اور اس کا ایک فارسی قصیدہ بھی جو شاہ علیجیو کی مدح میں ہے نقل کرتے ہیں۔

یہاں شاہ علیجیو کے کلام کا نمونہ دیا جاتا ہے :۔

نکتۂ اوّل در مکاشفہ ؎

اپنے بھاؤ جو لیا یا لور سے   سو کیوں بھیس کچھو بھی چھوٹے

نکتۂ دوم ؎

نو کھنڈ ہور جے اسمہ آہے   سب پیو جہت تھیں جہتا ہوا ہے

ہونتوں دونوں ناؤں اسی کے   آہیں لے سب بھیس جیسی کے

نکتۂ سوم ؎

سرک اجھر ہور مندر مارسے ہور جے اس منہ ندیاں بائے
مانک موتی سکھ سنگارا لئے سب بھیس پیا کا سارا

نکتۂ چہارم سے

کبھیں سو لیاوے بھیس اکاسا ہو کر چندا تارے باسا
دیہ الا لا تج بکھیرسے روپ انپڑے اپین ہیرے

نکتۂ پنجم سے

کبھیں سو ہووے اندھیاری راتا سانجہ تی کرلاوے دھاتا
ہو کر دیورا راتیں ساری لاکر جوت دکھاوے بھاری

نکتۂ ششم سے

مکھ پر بال بکھیر سو ساتھی چھپ کر ہووے رات سنگاتی
ولی سنبھال سو بکھرے کیسا دن ہو آوے سورج بھیسا

نکتۂ ہفتم سے

ان بھر ولی کھیلے میرے بھیس گئے ہیں میرے تیرے
پرکھ نار ہو آپیں آیا دیکھو بھیس او ناری لیایا

نکتۂ ہشتم سے

کھیل جدھیا بھر دیا کھیلے ہنس تل بھی کھیل نہ میلے
آپیں تلچے آپیں گاوے آپیں آپس بھاو دکھاوے

نکتۂ نہم سے

کبھیں تج بھرا بھیس لیاوے دھرنی ہو کر آپ بچھاوے
کر پریت ہو بھاری بیسے سرماں ہو کر نیوں بیسے

نکتۂ دہم سے

ایک سمند دہ سات کھاوے   وہنوس بادل مینہ ہو آوے
وہی سمندر کر بوند دکھاوے   ندیاں نالے ہو کر جاوے

نکتۂ یازدہم ؎

کبھیں سو مینہاں ہو جھڑ لاوے   کبھیں بوتی اوسے نہاوے
کاج بیچ ہنس آپیں کھیلے   نار پرکھ ہو وہی سو جھیلے ؎

مکاشفہ ؎

چاؤ اٹھیا اس مجھے میر ساتھی کی ہوں جگ بھیل ہو آؤں   کہیں سو راجا کہیں سو پرجا کہیں سو بندا آپ کہاؤں

نکتہ ؎

کہیں سو عاشق ہو کر راؤں کہیں عارف ہوئے بچھانوں   کہیں مع تقد کہیں محقق کہیں سو جانوں کہیں نجانوں

نکتہ ؎

بھیس بندے کے کر دس سو بندگی او بہا ہو ہو نماز گذار دں   ہوں حاجی ہوں کعبا آ ہوں آپیں آپس دیپ وار دں

نکتہ ؎

ہوئے بندے ہور ہوئے بنتاں یویں آپیں آپ کہا سوں   فرض کیتا ں ایہ ناں تم پر پیار کر دنگا کر سین تا سوں

نکتہ ؎

بھا و نماز جب لیاؤں کیر العلیس تن بول آپس سنوار دں   وضو غسل کرتا ہوں کیرا زیبا کپڑے بھر سنگار دں

نکتہ ؎

ستر عورت کر کا جھوں آپیں بہ سنگار دں نماز لاؤں   کعبا ہو کر آپ دکھاؤں سجدے کر کر نکلے لاسوں

نکتہ ؎

آج سو تیوں بھیس کیئے ہیں علم قدیم ہیں جیو نچھے گوئے   فرض نماز آپس پر کینی تس منہ تیرہ فرض سو جوئے

نکتہ ؎

اسمنہ بھلا ساز جو آہی سو جے شرطاں جانیں پیارا   حدث خبث نجیس پہلوں پاری یہ تن پاک کریجا سارا

نکتہ ؎

دوجی فریضہ اپنے کپڑے پاک نمازی پچھئے کہ ۔۔۔ تیجی شرط سو تھاں پاک جتے پڑدے قدم مقدار سہئے

نکتہ ؎

سجدہ کی بھی جو بیٹھے بھایو کھڑی پاک سو تھا نہاں ۔۔۔ سو کیوں حرج کچھی تھام نکیجے سیں نادے جہاں سو نا نہاں

نکتہ ؎

چوتھی شرط سو ستر عورتکی پن تو تسمنہ پکٹ ادا نہیں ۔۔۔ مردوں کو تن ڈھنپیا لوڑے دونٹے تیں تل گھونٹیں تائیں

نکتہ ؎

ہور جے بیبیاں ہج دیں اچھیلاں انہ تن سارا ڈھانپیا جونٹی ۔۔۔ دلے نڈھا پیں کہ ہور پانوں ہور تھیلیاں جہاں لگ ٹی

نکتہ ؎

مردونکے جے ستر عورت باندیوں کا بھی جانیں نیو یں ۔۔۔ پن ہاں باندیاں ڈھانپیں اتناں پیٹ ہور پیٹھ ندیکھی جیدیا

نکتہ ؎ ۔۔۔ اصیل عورت کے تن تکرسے جیری کینہیں عورت ناہاں ؛

چوتھا بھاگ کہلے جو اسمنہ ہیلیں ڈھانپنے جے اس تھاں ہاں

آگے نماز کی ہدایتیں ہیں۔ میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ شاہ علیجیو نے ایک آدھ مقام پر فارسی بحر میں طبع آزمائی کی ہے۔ بحر ہزج مربع سالم +

مکاشفہ درعقدہ ؎

بچاری بھولڑی کھا دو ۔۔۔ دور و ننتھی آپ کوں کادہو

نکتۂ اوّل ؎ پرم رنگ جیو جن ماہاں ۔۔۔ سو دیکھیں نانہ سہتا نہاں ۔۔۔ تنہوں من لو کے ہم کا نہاں

نکتۂ دوم ؎ لوکا کی بھوک کوں لوچھو ۔۔۔ گسائیں ساج ان سو جھو ۔۔۔ پرم کی بات کہچہ بوجھو

نکتۂ سوم ؎ جو جیوڑا پیو سوں لاگا ۔۔۔ ہئے جس نیہ کی آگا ۔۔۔ تنہوں کا لوچہ سب بھاگا

نکتۂ چہارم ؎ جو لوٹیں تربھرینا کہیں ۔۔۔ رونیں ہور دکھ سکھ جا ہیں ۔۔۔ تنہوں لے ناچتے آکہیں

نکتۂ پنجم ؎ بتولو بول کچھ کاچو ؛ ۔۔۔ جو لاگے پیار تم ساچو ۔۔۔ تمنہ بھی پینوں ہیں ناچو

نکتۂ ششم ؎ جنہوں من پرم کا بھٹکا تانہیں تل نیہہ کا کھٹکا سو جانے مرم کا لٹکا
نکتۂ ہفتم ؎ انہوں کی سیج شب لیس ہسلاتے پیوا نہ آس پاس مرے تب سوکہا تھ کس کس
نکتۂ ہشتم ؎ الٹی آنک کھیں لاگے سو تا یہ جیوڑا جاگے جو انکا بوگ بن بھاگے
نکتۂ نہم ؎ پرکہ بہی نادہ پڑ آویں سو سنتیں آپ کھو جاویں سو بیسے پان بنا ہواویں
نکتۂ دہم ؎ جو پانا پیو سنبھرائے پیا سوں پیار بڑ ہوائے پر اتس کینو کہوائے
نکتۂ یازدہم ؎ جو اپنے کنت بسرائے پر اتس آکھیا جائے بھلا سو پیو دکھلائے
نکتۂ دوازدہم ؎ ڈہوں جگ بانہ ہے کاجے ساروں ستر اج جراجے سنیں تن گیت سنہ باجے
نکتۂ سیزدہم ؎ جو بولیں لوگ بہترے کھلے ہیں کان جن کیرے سنے سب بادہ پیو میرے
نکتۂ چہاردہم ؎ باجوں سب بانہ دہ بولی نادوں اور بانس نرملی پوچھیں جن جیو پیو کھولی
نکتۂ پانزدہم ؎ بجنتر بانہ کو نانہیں کرے سب بادہ دہائیں جو لو بول ہے سب کائیں
نکتۂ شانزدہم ؎ جو گاویں گیت بہ تانوں سنیں لے پیو کے کانوں سہی کر بات تم جانوں
نکتۂ ہفدہم ؎ ہمارے لوک ہے سارے دیکھیں جب جیو کے پیارے تما ینہ جانو ہیں وارے
نکتۂ ہیژدہم ؎ نبی کی نین ات ماتی سلونی اور رنگ راتی کھلیں وے پیو دکھلاتی
نکتۂ نوزدہم ؎ جھنڈا پایا آج میں دیتا سورے پاؤں لگ بیٹھا دہریا ناہاتہ منجہ بیٹھا
نکتۂ بیستم ؎ جو ایسے پیوکوں پاویں اٹھیں ہور ہیر گل لاویں پھریں ہور وار نیں جاویں
نکتۂ تخلص ؎ سو لٹکن لٹکتا آئے لٹک گل یا نہ جب پا ہوئے
علی تب جانب گل لائے
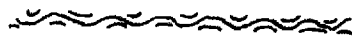
شیخ خوب محمد چشتی

گجرات کے رہنے والے ہیں۔ اور شیخ کمال محمد سیستانی کے مرید ہیں۔ ۹۸۶ھ میں تصوف کی ایک مثنوی خوب ترنگ نامی تصنیف کی۔ اور ۱۰۰۰ھ میں اس کی شرح بزبان فارسی لکھی۔ شرح کا نام امواج خوبی ہے۔ خوب ترنگ کی تاریخ تصنیف شعر ذیل کے دونوں مصرعوں سے الگ الگ برآمد ہوتی ہے۔ بلکہ دوسرے مصرعے سے دوہری تاریخیں نکلتی ہیں +

خوب محمدؐ کیئے بچار   چودہ گھاٹ اوس برس ہزار

اور شرح کی تاریخ اس شعر میں بیان کی ہے:

عدد شمار ز تاریخ شرح نعت محمدؐ   ہزار سال مکمل ز فکر خوب محمدؐ

دیباچہ میں کہتے ہیں

خوب کہیگا خوب ترنگ   سنتیں کچھ نہ کیجو ننگ   یوں انکار نہ کیجو دیکھ   جا یوناں تج یوں من لیکھ

کے یہ تو کہتا ہے خوب   دیکھو کے کہتا ہے خوب   پڑھے جو چھوکر داد قرآن   تو اس کوں کر جھوٹ نمان

مت بوجھیں یہ چھوکر داد   اس کا کیا یہ چھے برباد   جو بمقدر کنیں نہیں پائے   جو ہر تو کیا ہنالی کھائے

یہ تو جان بنا سنج نہوے   جے مقصود تجھے یوں کہے   یہ تو کہیا فلانے یار   ایسا بوجھ کرے انکار

جتنا طالب کوں بس ہوے   میں اس ٹھانہ کہیا ہے سوے   جیوں دل عرب عجم کی بات   سن بولے بولی گجرات

تیوں تر جان سو ہو جمع دل   کہوں مدد بن تھیں حل مشکل   ہیں مرشد تھیں سنیاں بیان   دے مرشد صاحب عرفان

جنہو منجے سکھلایا دین   جن تھیں منجہ دل ہوا الیقین   جیلانی بسطامی شاہ   بغدادی حسن چتر کلاہ

ہر ماضی پر محبت ایک   ہوں معتقد ہوا ان دیک   وارث محمدؐی ہر تھانوں   شیخ کمال محمد نانوں

کیا عروج مقام اقدم   اللّٰھم اغفر وارحم   ادن کوں تھا یہ علم کمال   ھذا العلم افواہ رجال

اوتھیں مَیں سنیا دن رات   اوس متہ یاد رہے کچھ بات   وہ جیوں منجکوں آئی زنگ   جمع کیئے تس تس دی ہنگ

خوب ترنگ اس دیا خطا   مدح رسول اللہ پات   یا اللہ رلے مدح رسول   اوسی دستی کر قبول

جیوں میری بولی منہ بات   عرب عجم مل ایک گھات   تیوں ہی کہو نگا کریں نٹ کھوٹ   آیا بول کیا نہیں چھوٹ

اینہاں شعر کا قصد نہ لیکھ   اینہاں مراتب کہوں سو دیکھ   ارض سما منہ جے نہ سمائے   وزن شعر منہ دے کیوں آئے

دوڑیا ہوں نظر دیکھی شان   دیکھ مراتب سوں آسمان   کل مراتب جز منہ لیا اول   کر نسخا تصنیف دکھاؤں

نعت میں کرتا ہوں سیر   یا اللہ تمم بالخیر   غلط نہ پکڑیں ہوں اجان   دُرِ کہوں سیتے توں من آن

جو کچھ خطا اس منہ تو پائیے   اسے سبی کر برائے خدا ئے   پن اتناں کہوں گو دیچیاے   مت ان سمجھے بول ہلائے

نسخہ کی تاریخ اس تھا نہ   پائے عدد ہر مصرے مانہ   خوب محمد کئے بچار   چودہ گھاٹا دیں سن ہزار

دو جا چاند چوتھا شعبان   دیس دوشنبہ کیا بیان

شیخ خوب محمدؒ اس زبان کو عربی و فارسی آمیز گجراتی کہتے ہیں لیکن در حقیقت یہ اُردو ہے۔ اگرچہ اس میں گجراتی زبان کا بھی پرتو موجود ہے۔ گجری بھی اسی کا نام ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب رسالۂ اُردو حصّہ بیست و ہفتم ۱۹۲۷ء میں رقمطراز ہیں:۔

جب یہی زبان دکن میں آئی اور اس میں دکنی لفظ اور لہجہ داخل ہوا۔ تو دکنی کہلائی۔ اور گجرات میں پہنچی تو اس خصوصیّت کی وجہ سے گجری اور گجراتی کہی جانے لگی۔ شاہ برہان صاحب جانم متوفی سنہ ۹۹۰ھ نے اپنے کلام میں کئی جگہ اپنی زبان کو گجری کہا ہے۔ مثلاً وہ کتاب حجت البقا میں فرماتے ہیں ؎

"جے ہو دیں گیان بچاری   نہ دیکھیں بھاکا گجری"

یعنی جو صاحب عرفان ہیں وہ گجری (گجراتی) زبان کا خیال نہ کرینگے"۔

فارسی و عربی الفاظ ان کے زمانہ سے پیشتر مقامی لہجہ اختیار کر چکے تھے اسی لیئے وہ ان کو مروّجہ لہجہ میں لکھ جاتے ہیں۔ مثلاً اوپر کے اقتباس میں

مصرع کو مصرے، نسخہ کو نسخا، درُست کو درُس رقم کیا ہے ؛

احمد دکنی

اُردو ادب کی تاریخ میں محمد قلی قطب شاہ ۹۸۸ھ و ۱۰۲۰ھ کا نام سنہری حرفوں میں لکھا جانا چاہئے۔ وہ خود اُردو اور فارسی کا زبردست شاعر تھا۔ اس کے ضخیم کلیات پر جو اٹھارہ سو صفحات پر شامل ہے ۱۹۲۲ء میں مولوی عبدالحق صاحب نے رسالۂ اُردو بابت ماہ جنوری میں ایک پُرمغز اور عالمانہ تبصرہ لکھا ہے علوم کی سرپرستی میں جس قدر حصّہ اس بادشاہ نے لیا ہے ابھی ہم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ کیونکہ اس کے عہد کے ذہنی کارناموں کی تاریخ ابھی تک مدون نہیں ہوئی ہے۔ اختیارات قطب شاہی جو اختیارات بدیعی (ایک طبی تصنیف) کی ضخیم تنقید ہے اسی بادشاہ کے حکم سے اطبا کی ایک جماعت نے تالیف کی ہے۔ جس کا اصل نسخہ راقم کے مجموعۂ کتب کے نوادرات میں سے ہے ؛

احمدؔ دکنی اسی بادشاہ کے دربار کا شاعر ہے۔ اور اس کے حکم سے اپنی تصنیف لیلیٰ مجنوں لکھتا ہے۔ احمد کے حالات زندگی سے ہم بے خبر ہیں۔ میرے مہربان اور مخدوم پروفیسر سیّد عبدالقادر۔ ایم۔ اے پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور کی وساطت سے احمد کی لیلیٰ مجنوں کے چند اجزا مجھ تک پہنچے ہیں۔ جن میں کل ۴۹ منتشر اوراق ہیں۔ باقی کتاب کا اکثر حصّہ غائب ہے۔ ان میں چودہ تصاویر اکبری دبستان کے طرز میں موجود ہیں۔ لیکن اکثر شکستہ و خستہ۔ یہ مثنوی خطِ نسخ میں لکھی گئی ہے اس کی تقطیع ۹×۵½ ہے۔ فی صفحہ گیارہ اشعار جلی قلم میں مرقوم ہیں۔ رسم الخط

میں بعض مقامی خصوصیات مشاہدہ میں آتی ہیں۔ جو زیادہ تر ہندی اصوات کے اظہار کے لئے وضع ہوئی ہیں۔ چنانچہ جیم فارسی برائے ہندی اور دال ہندی اور بائے فارسی کے نیچے بالعموم تین نقطے دئے ہیں۔ تائے ہندی پر چار نقاط اور کاف فارسی کے نیچے (بعض اوقات) تین نقاط دئے گئے ہیں۔

احمد سبب تالیف میں کہتا ہے :-

جو منج بخت کوں فتح یاور ہوا | سو منج بخت کا سیوک انبر ہوا
جو شہ آپ تھے آپ منج یاد کر | منجے غم کی بندگی تھے آزاد کر
دیتے امر علی کے یہ باغ لاؤں | جو پالوں لے شہ امرت نانوں
جو میں شہ کا امر سر پہ لیتا | نرت باغ لانے شتابی کیتا
بہوتیک پریشانی روزگار | اگرچہ منجے ہے ملامت سوبار
بہوتیک شغلاں ستیں رات دن | نتھی منج فرصت بھلا ایک بن
دلے آس دہر شہ کے فرمان پر | لگیا تن سنگار ن بہو تصہ دہر
دہریا عشق کی باس اس بن کے پھول | جو اس بس پہ جیوں بھنور جیکوں بھول
سو کچ عشقکوں اب جگت منج دکھاؤں | جو گھر گھر تے لیلیٰ و مجنوں اچاؤں
جو لیلے و مجنوں تھے بولوں پران | سو تازہ کروں اب انو کا پران
جو اس بن چمن پر تھے گئے پون | پون پاس تھے باس لے سرک بن
جو اس باغ پر شہ کا داغ ہے | سو باغوں میں یہ باغ شہ باغ ہے
دہنی باغ کا شہ ہیں باغبان | بھنور باغ کا کیوں بھوی آسمان
جو اس باغ مہکار تھے جگ بھرے | سہ سرمست کرتہ سیاں کوں ن ہرے
سو کچ شہ کوں یہ بن مبارک ہو | جو اس بن تھے ہر روز نو روز ہو
شہنشہ کے ارکان دولت جیکوی | مبارک انو پر بھی یہ باغ ہوی

جکوئی باغ کی باغبانی کرے ۔۔۔ سو اس باغ تھے شادمانی کرے
دہنی باغ کا باغباں کوں نواز ۔۔۔ بہو رحمت سوں کرے سرفراز
جو احمد کرے آس دہر بن سند گار ۔۔۔ سو اب شہ تھے پائے نتیں سند گار

مثنوی کے افتتاحیہ ابیات یہ ہیں ؎

اس اللہ کے ناؤں سوں حسب گت ۔۔۔ جو دانی دیاونت اس کی صفت
سراہنا سب اللہ کوں حسیم قرار ۔۔۔ جو جگ کا دہنی ہور پروردگار
جو دنیا میں کافر مسلماں کوں ۔۔۔ منگے من سو بخشے بہو مان سوں

شاعر نے حمد کے بعد تین مناجاتیں لکھی ہیں۔ میں دوسری مناجات سے کچھ اشعار حوالۂ قلم کرتا ہوں ؎

رحیمی سوں رحمت کرے سو رحیم ۔۔۔ کریمی کے سب گن دہرے سو کریم
سبہ کچہ کوں بھر دسو رحمت دہرے ۔۔۔ سبہ جگلوں انپڑے سو نعمت دہرے
بھلے ہور برُے پر کرم راکھتا ۔۔۔ برائی چھپا کر بھرم راکھتا
گنہ گار کے پاپ بھجن کرے ۔۔۔ گنہ بخش بخشش سوں پرسن کرے
نہ وہ کچھ کسی دہانہ حاجت دھرے ۔۔۔ جو عالم سب اس کی عبادت کرے
دلے سب جگت کوں ہدایت دکھاے ۔۔۔ کرم سات اپنے عبادت سکھاے
عبادت سے آپیں تو ہے بے نیاز ۔۔۔ سو ہے جن عبادت کرے سرفراز

کرے ایک نیکی تو دے دس ثواب
جو لوٹے زیادت تے پے دے بحساب

مصرع "جو عالم سب اس کی عبادت کرے" میں "جو" کاف بیانہ کا قائم مقام ہے۔ پنجابی اور دکنی میں بالعموم آتا ہے۔ مثلاً عبدالحکیم پنجابی کہتے ہیں ؎

یکے بیچارہ اب یوں کرکے فریاد ۔۔۔ جو یارب بھائیاں دی دیکھ بیداد

دیگر :ـ

کہا یعقوب جو فرزند میرا   تساں کھاوا چینڈ وجھگڑا اتے جھیڑا

اسی لیلیٰ مجنوں میں احمد ایک اور مقام پر کہتا ہے :ـ

جو پانی سیتیں جیونی سب جگت   جو طاناں ہوے سب جگت جاے گت

اسی طرح یہ شعر ـ

بولایا لکھن ہار سکیاں کوں   جو لیکھے کتابت بھوگیاں سوں

لیکن کاف بیانیہ اردو میں قدیم سے ہے۔ پرانے مصنف اس کو بشکل "کے" لکھتے ہیں۔ مثلاً شاہ علیجیو گام دھنی ـ

بے حد ثابت ہوئی جو ہے ہے اس منہ جگ بھی حد نجوے

کے وہ لطف سب لطف تھے ہے نجر نہ آوے فہم نہ ہچے

بعد میں فارسی املا اختیار کر لیا گیا۔ چنانچہ یہی احمد گویا ہے ـ

بہو عجز سوں آس احمد دھرے   کہ سائیں دکھن عجز رحمت کرے

فارسی اردو سے ہندوستان کی اکثر زبانوں ہندی گجراتی وغیرہ میں لے لیا گیا ہے۔ کاف بیانیہ کی سرگذشت کا ایک دلچسپ پہلو وہ ہے جب کہ بمبئی کے فاضلوں کے ایک دبستان نے اسے سنسکرت کے ماخذ سے استخراج کرنے کی کوشش کی تھی ؎
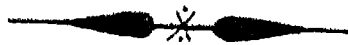
شیخ عثمان

غازیپور کے رہنے والے ہیں۔ والد کا نام شیخ حسن تھا۔ اور جہانگیر کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے "چترا ولی" نام کا ایک عشقیہ قصہ بزبان ہندی لکھا ہے۔ جو دوہوں اور چوپائیوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ اور تصنیفات بھی کیں چترا ولی ایک نہایت دلچسپ تصنیف ہے۔ اور اسی پر ان کی شہرت قائم ہے اس تالیف کے زوردار حصے وہ ہیں۔ جو چترا ولی کے محل اس کے حسن و جمال، بیان ہجر، اور بارہ ماسہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ شہزادہ کی تلاش میں مصنف نے جہاں مختلف ممالک اسلامیہ کا ذکر کیا ہے۔ اس میں انگریزوں کی طرف بھی ایک تلمیح ملتی ہے۔ جو ہندوستانی ادب میں بقول مصنف کامتا کو مبدی سب سے پہلی ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی شہر سورت میں اپنی کوٹھی ۱۶۱۲ء میں قائم کرتی ہے۔ اور ۱۶۱۳ء کی یہ تلمیح ہم کو مل جاتی ہے

ذیل میں چترا ولی کے اس حصہ سے جس کا عنوان "کنور ڈھونڈھ ہن کھنڈ" ہے بعض اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں :۔

جن پچھوں س کنہ پیانا پھلیس گا سو دیس ملتانا دیکھی سنگھی لوگ سیائیں ہیرا دن سیلے یہاں ٹیں

ہیرے سی ٹھٹہ نگر سوہاوا بہینگ ہرن یویں گنجاوا کابل ہیری مغ گل کر دیسا جہاں پو ہم تپی ہوئی زیسا

دیکھے سی دم سکندر کیرا سیام ہاہوئی سکل ندہیرا دیکھی سی کر دہی استھانا ہئی اندہ تیں پاہین جانا

حاجی سنگ ملی گیو مدینہ کا بہا گئے جو ساقنہ سینہ گا بغداد پیر کے نیرا جیہی نیچے نیہی سنگ ہیرا (امیر)

استنبول، مصر پونی ہیرا گا لدا خ لہو کنہو سہی پھیرا دکہن دیس کچھے پگو دھارا چلانا کی سولنک پھارا

پھیلے ہی گے ہیرین گجراتا سندہی لوگ سو کھ راتا گیو جام جین کچھی ہوئی لوگ مسر پیٹ کھی سب کوئی

بلندیپ دیکھا انگریزا جہاں جابے نہیں کٹھن کریجا ادنچ نیچ دہن سنیت ہیرا مدبراہ بھوجن جن کیرا
جہاں جائی ادہن بندرساجا لگا سنگ چڑھی گیہو جھاجا

شیخ بہاء الدین برناوی خاتم التارکین

آپ مخدوم شیخ فرید الدین برناوی مہاجر مکہ متوفی ۹۸۷ھ کے پوتے اور جانشین ہیں۔ مسلمانانِ ہندوستان میں صرف دو شخص فن موسیقی میں یگانۂ روزگار مانے گئے ہیں۔ امیر خسرو اور مخدوم بہاء الدین۔ امیر اس کا دیباچہ ہیں اور مخدوم اس کا تمت ہیں۔ مخدوم کے حالات اب تک گوشۂ گمنامی میں رہے ہیں۔ فقیر اللہ نے راگ درپن میں البتہ ان کا مذکور کیا ہے۔ میری اطلاع کا ماخذ کتاب چشتیہ ہے۔ جو مخدوم علاء الدین ثانی کی یادگار ہے چنانچہ یہ چند سطور اسی سے منقول ہیں:-

"قاضی عارف برناوی نے حرف شناسی اور ہجا خوانی کرائی۔ ملا انور بہت کی سے کتابی تعلیم حاصل کی۔ بعد میں شیخ اللہ داد پانی پتی آپ کے معلم تھے۔ میراں سید عبد الشکور سے نیمۂ شرح عقاید پڑھی۔ اسی زمانہ میں ایک عربی قصیدہ لکھ کر استاد کی خدمت میں پیش کیا۔ تحصیل علمی کے بعد ریاضت و مجاہدہ میں مشغول ہو گئے۔ نماز سحر کے بعد شکار کے بہانہ سے جنگلوں میں نکل جاتے۔ اور تیس تیس کوس جنگلوں میں پھر لیتے۔ ابتدا میں تیر سے شکار کھیلتے رہے بعد میں بندوق اختیار کر لی۔ ان نواح میں آپ ہی پہلے شخص ہیں جس نے بندوق سے شکار کھیلنا اختیار کیا۔ شکار ہو کا؟

بے حد پسند تھا۔ جد امجد کے مکہ معظمہ جانے کے بعد تمام دنیاوی اشیاء مثلاً
جاگیر و قریات۔ انعامات و وظائف۔ اثاث البیت۔ اجناس و متاع۔ ہتھیار
مویشی۔ گھوڑے وغیرہ کو ترک کر دیا۔ اسی بنا پر آپ خاتم التارکین کہلائے سیر
سفر کے بے حد شائق تھے۔ دکن گجرات۔ کنبھایت۔ جونپور۔ پٹنہ بہار۔ پنڈوہ
سرہند۔ لاہور۔ پٹن۔ اجودھن۔ ہانسی وحصار وغیرہ وغیرہ کی سیاحت کی۔
ہند کے ہر بڑے شہر میں ان کے دوست و احباب موجود تھے۔ اکبری و جہانگیری
امرا سے رسم و راہ تھی۔ ان دونوں سلاطین سے ملاقات کی ہے۔ موسیقی کے
ساتھ ان کا تعلق عشق کی حد تک تھا۔ جکری۔ خیال اور چٹکلہ۔ قول و ترانہ۔
سادرہ۔ دھرپد۔ بشن پد وغیرہ میں انہوں نے اشعار لکھے ہیں۔ یوں تو تینوں
زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ لیکن ہندی میں اکثر لکھتے تھے۔ ساز خیال و ساز
کھٹرس کے موجد ہیں۔ انہوں نے گمنام رہنا پسند کیا۔ اسی لئے کوئی تخلص
اختیار نہیں کیا۔ چنانچہ ان کا کلام دوسروں کے نام سے مشہور ہو گیا +
یہاں بعض نمونے کتاب چشتیہ سے لے کر ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں:۔
برائے بارش:۔

کاہے لے بدرا ناں برست کاہے تھی ناہن گرجت کاہے ناں جھڑ لاوت
کاہے تھی برکھا رت تیوت برمن من جتیوت کاہے تھی ناں گھور گھورتا وت

چتر و ساتیر دیے اُما ہو دا تا میکھ کہا دت   گر بن تیا کو ٹا جم گسٹ نہیں ادل بدل لے آوت

دیگر ؎ ان نینن کا یہی بسیکھ ؎   ہوں تجھ دیکھوں توں منجھ دیکھ

خیال ؎

کیسیں کی ہمُرو نو ہ من چنچل نوکہوں کہو ڈولی۔   اود، تیک یک باد کرت رہے پاہے کاج نبولی
آنک للاری لکھی تو نینئے مینی لیک کا تھٹ کو کھولی   جے اسنہر کنبے بدھنا تن کی سدا کلولی

(سادرہ) جہانگیر اور خرم کی جنگ کے وقت کہا ؎

اے آے بھائی جیتا مصاف ساہن سرتاج — جس ری تو طانت نت راج

خیال برائے شفا ؎

ٹھاکر گرو کچھو چیت نہ دھری — جین انپرادہ اپرادہی کرے
دھا چھین وگی کی بیدن اپنی دھا نفیں کہن میں ہر

خواجہ خضر کے لئے ؎

دائم حیات کائم کرامات ملاکات نعمت پاؤ نہم — ندی نیر دُرم بھاری بہیر بھرت مرہت تہونہا تہا ری تم پُم
رحم کیجے کرپا تھیں دیجے کاکھوں زاوری سم — تم کہواجہ کہدرے عنبر الیاس رہ دو وہاس ما جگت بیں الگم

برائے طلب لقائے سلطان الاولیا ؎

کاری کاج تھاری ہیں تو تھکت بھیو کر بھتیرو — آج بھاگ جاگ پڑے ہمارے پرسن درسن ماپت نیرو
اننداے انند دھاموڈکہ سیہ موش گیئو سو ہرو — تربت بھیئی تپت سب ناسی ولیا چرن لگ ما نتھو میرو

بارش بند ہونے کے لئے ؎

اُے من ما نیوری بدرانیکی بھانت جُر جُر آئیو — نیکی میں گھٹالی آتو نیکھیں گرج سنایو
نیکھیں نیکھیں نیں تو ہنس ہنس جھرلا یو

ان کے دوست داس گھنوں بیراگی نے اپنی وفات کے وقت شیخ کی خدمت میں ذیل کا پد بھجوایا تھا ؎

اے من نام پائیں ماتیں نفیں دکھ سکھ بھاے — یہ جو کچھو کو سپنو سو دیکھنت جاے رے یہ جاے
جے بچن ست کرن کی ہے تی میں کہی سنائے
داس گھنوں جیوں جل بل زنگن جل میں جل ہو جاے

مولانا محمد افضل جھنجانوی پانی پتی

میرٹھ کے قریب جھنجانہ یا جھنجھنہ ایک پُرانی بستی ہے۔ عہد ماضی میں ایک مردم خیز قصبہ تھا۔ اور بعض مشاہیر وہاں سے پیدا ہوئے ہیں۔ شیخ عبدالرزاق اور شیخ عبدالقادر متوفی سنہ ۹۴۰ھ جو مشہور اہل اللہ ہیں۔ اسی بستی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور شیخ صوفی دانشمند جنہوں نے علوم ہندیہ تحصیل کرکے اُن کے تراجم اکبر کے لئے فارسی زبان میں کئے۔ اسی قصبہ کی گود میں پلے ہیں۔ محمد افضل کا شمار اسی سرزمین کے نونہالوں میں کیا جاتا ہے +

ہم اُن کے حالات سے قطعاً تاریکی میں ہیں۔ پس اسی قدر جانتے ہیں کہ ایک دوازدہ ماہہ یا بکٹ قصہ کے اردو میں مصنّف ہیں۔ میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں :-

محمد افضل، افضل تخلص، از قدیم است کہ رام ہندو بچہ گوپال نام بود کہ بر او عاشق شدہ حسب حال خود بارہ ماسہ عرف بکٹ کہانی گفتہ کہ اکثر کھتریاں و گاینان مشتاق او می باشند نصفے فارسی و نصفے ہندی دارد۔ لیکن قبولیت داد الٰہی است بر دلہا اثر میکند از دست :-

پڑی ہے گل میں میرے پیم پھانسی — مرن اپنا ہے اور لوگوں کی ہانسی
مسافر سے جنہوں نے دل لگایا — انہوں نے سب جنم روتے گنوایا

اُن کے زمانہ کی نسبت اسپرنگر نے اپنی فہرست میں محمد قائم چاندپوری کے تذکرہ کے حوالہ سے اتنا لکھا ہے کہ :-

افضل، عبداللہ قطب شاہ سے جو ۱۰۲۰ھ میں تخت نشین ہوتا ہے پیشتر گذرا

ہے۔ اس کی تعلیم معمولی حیثیت کی تھی۔ صوفیانہ شعر کہتا تھا۔ اور ایک بکٹ کہانی
لکھی ہے جس کا ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتبخانہ میں محفوظ ہے ۔

قایم نے افضل کا جو زمانہ دیا ہے۔ اس میں بظاہر ایک غلطی معلوم ہوتی ہے
وہ یہ ہے کہ عبداللہ قطب شاہ درحقیقت ۱۰۳۵ھ میں تخت نشین ہوتا ہے۔ نہ
۱۰۲۰ھ میں جو محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کا سال ہے۔ اس کی یہی صورت
ہو سکتی ہے کہ یا تو قایم نے محمد قطب شاہ کے نام کے بجائے عبداللہ قطب شاہ
یا ۱۰۳۵ھ کی جگہ ۱۰۲۰ھ لکھدیا۔ یہ امر بھی تعجب خیز ہے کہ قایم محمد افضل کے زمانہ
کو جو خود اُس کے اپنے بیان سے ایک ہندوستانی شاعر ہے۔ ایک دکنی بادشاہ کے
عہد کے ساتھ مضاف کر رہا ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں رائج ہونے
سے پیشتر اُردو شاعری چونکہ دکن کی سرزمین کے ساتھ وابستہ تھی۔ اس لئے ہمارے
تذکرہ نگار اپنے ذہن میں غیر دکنیوں کو بھی دکنی ہی تصوّر کر لیا کرتے ہیں چنانچہ
شیخ سعدی کو جو ہندوستانی ہیں۔ دکنی فرض کر لیا گیا ہے ۔

علی قلیخاں والہ داغستانی نے اتفاق سے محمد افضل کا تذکرہ ریاض الشعرا
میں شامل کر لیا ہے۔ جو ہمارے شاعر کے حالات پر بالکل مختلف روشنی ڈالتا ہے
والہ کا بیان ہے کہ محمد افضل پانی پت کے باشندہ ہیں۔ جو فضائل و کمالات ظاہری
و باطنی سے آراستہ اور عشق و فقر کی چاشنی سے شیریں کام تھے۔ ہندی اور فارسی
میں نہایت اعلیٰ شعر کہتے تھے۔ اور نثر نویسی میں مقبول خواص و عوام تھے۔ معلّمی
ان کا پیشہ تھا۔ اور طلبہ کی ایک کثیر تعداد اُن کے حلقۂ درس میں داخل تھی۔ بہتوں
نے اُن سے فیض اٹھایا۔ بڑی عمر میں آ کر کسی ہندو عورت کے دام عشق میں گرفتار
ہو گئے۔ اور ایسے وارفتہ ہوئے کہ تمام زہد و عبادت و تقویٰ کو خیرباد کہدی۔
اور مسجد و مدرسہ کے بجائے کوچۂ دلدار کا طواف کرنے لگے۔ اس عشق و وارفتگی

کے ایام میں مولانا نے عاشقانہ غزلیں کثرت کے ساتھ لکھیں ہیں۔ ایک غزل کا مطلع یہ ہے :۔

عالم خراب حسن قیامت نشان کیست
در رہ کدام فتنہ گراست و زمان کیست

شدہ شدہ مولانا کے عشق وجنوں کی خبر عورت کے رشتہ داروں کو لگ گئی۔ اور غریب عورت مفت میں بدنام ہوگئی۔ بیچاری نے باہر نکلنا ترک کر دیا۔ حتیٰ کہ تہوار کے موقعوں پر بھی گھر سے باہر قدم نہ رکھتی۔ مولانا دیدار یار سے مایوس ہوکر کوچۂ یار میں اور بھی جم کر بیٹھ گئے۔ بالآخر عورت کے رشتہ داروں نے تنگ آکر اسے متھرا اپنے عزیزوں کے پاس بھیج دیا۔ جب حضرت کو معلوم ہوا۔ کہ ان کا مطلوب متھرا بھیج دیا گیا ہے۔ روتے پیٹتے اس طرف کا رخ کیا۔ اور متھرا پہنچ کر تلاش یار جاری کر دی۔ تقدیر سے ایک دن یہ عورت اپنی ہمجولیوں کے ساتھ باہر سیر کو گئی تھی۔ سامنے سے قبلہ مولانا تشریف لا رہے تھے۔ آپ دیکھتے ہی آگے بڑھے اور یہ شعر پڑھا :۔

خوشا رسوائی و حال تباہے مرا ہے و آہے و نگاہے

خدا جانے وہ عورت ان کے شعر کا مطلب سمجھی یا نہیں۔ لیکن اس نے مولانا کو بڑی گرما گرم داد دی۔ طیش میں آکر کہا "مولوی تجھے شرم نہیں آتی کہ منہ پر سفید ڈاڑھی لگاکر ایک جوان عورت کی محبت کا دم بھرتا ہے" مولانا شرمائے تو بہت۔ لیکن عشق کا بھوت اُن کے سر سے نہیں اُترا۔ پری کو شیشے میں اتارنے کیلئے فریب کا ایک ایسا جال تیار کیا کہ جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا یعنی ڈاڑھی منڈوا دی۔ زنار گلے میں ڈال لی اور برہمن کا بھروپ بھر کر ایک مندر کے پجاری کے شاگرد بن گئے۔ دن رات برہمن کی سیوا کرتے۔ اور علوم ہندی کی تحصیل میں مشغول رہتے

طبیعت بھی اخاذ تھوڑے ہی دنوں میں ہندی میں حیرت خیز ترقی کر لی۔ برہمن نے انہیں مندر میں اپنا نائب مقرر کر لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب برہمن کا انتقال ہوگیا مرتے وقت انہیں اپنا جانشین مقرر کر گیا۔ مولوی نے چند ہی روز میں عوام کے قلوب پر ایسا اثر ڈالا کہ سب ان کا کلمہ بھرنے لگے۔ اس مندر میں سال میں ایک مرتبہ میلہ بھرا کرتا تھا جس میں مستورات بھی خاص طور پر شامل ہوا کرتی تھیں۔ جب میلہ کا دن آیا اور عورتیں نذر و نیاز لیکر جوق جوق پوجا کیلئے مندر میں داخل ہونے لگیں۔ مولانا کی مطلوبہ بھی اپنی نذر لیکر آئی اور جب اپنی باری میں مہاراج کے قدم چومنے کیلئے جھکی۔ آپ نے اس کو روک دیا اور کہا ہمیں بھی پہچانتی ہو۔ عورت نے سر اونچا اٹھایا۔ مہاراج کو نگاہِ غور سے دیکھا اور پہچان گئی۔ لیکن یہ امر اس کی فہم سے باہر تھا کہ ایک مسلمان مولوی ہندو مندر میں بیٹھ کر پوجا کرا سکتا ہے۔ سہمی اور گھبرائی ہوئی ان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ بالآخر بولی کہ آپنے مجھ جیسی ناکارہ عورت کے لئے بے حد مصائب برداشت کئے ہیں۔ گذشت آنچہ گذشت لیکن آیندہ کے لئے وعدہ کرتی ہوں کہ میں آپ کی تابعدار بن کر رہوں گی۔ آخر وہ عورت مسلمان ہوگئی۔ اور مولانا کی اہلیہ بن گئی۔ مولانا نے ۱۰۳۵ھ میں انتقال کیا +

میں والہ کے اس بیان کو میر حسن کے بیان پر ترجیح دیتا ہوں۔ اس لئے کہ اوّل تو والہ میر حسن سے اقدم ہے۔ دوسرے محمد افضل اپنی بکٹ کہانی کے خاتمہ میں یہ شعر لاتے ہیں ؎

بیا دِ دلربا خوش حال می باش گئے افضل گئے گوپال می باش

میر حسن کے نزدیک گوپال اس ہندو بچہ کا نام ہے جس پر مولانا عاشق تھے۔ اس توجیہ سے یہ شعر بے معنٰے بن جاتا ہے۔ میری مراد آخری مصرع سے ہے

والہ کے بیانات کی روشنی میں گوپال خود مولانا کا نام قرار پاتا ہے یعنی ان کی زندگی کے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جب وہ برہمن بنکر مندر کے پجاری بن جاتے ہیں۔ اور گوپال نام اختیار کر لیتے ہیں۔ اس سے شعر کے معنے بالکل روشن ہو جاتے ہیں۔ قائم کا بیان ہے کہ افضل عبداللہ قطب شاہ کے دور سے پہلے کے آدمی ہیں۔ والہ کا بیان اس کا بھی موید ہے یعنی عبداللہ قطب شاہ ۱۰۳۵ھ میں تخت نشین ہوتا ہے۔ اور افضل اسی سال انتقال کرتے ہیں +

ہمارے مورخین کا یہ عقیدہ ہے کہ شمالی ہند میں اردو شاعری ولی کی آمد اور محمد شاہی دور تک وجود میں نہیں آئی تھی۔ لیکن محمد افضل کے دوازدہ ماہہ کی موجودگی میں ہمیں اس عقیدہ میں ترمیم کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ محمد افضل پر ہی کیا منحصر ہے۔ اگر باقاعدہ تلاش کی جائے تو افضل کے ساتھی اور بھی ملیں گے۔ ہمارا خیال ہے کہ اُردو میں تالیف و تصنیف ہند کے ہر صوبہ میں کسی نہ کسی شکل میں ضرور موجود تھی۔ یہ اور بحث ہے کہ وہ لوگ دلّی کے روزمرّہ میں نہیں لکھتے تھے یا جذبات میں فارسی کے متبّع نہیں تھے اور ہندی طرز میں لکھتے تھے۔ اُن کے اوزان ہندی تھے اور عورت کی طرف سے خطاب ہوتا تھا۔ بہرحال ملک میں اُردو میں رسائل لکھے جانے کا رواج تھا۔ غیر تعلیمیافتہ طبقہ میں یہ تالیفات مقبول تھیں۔ مذہبی مسائل قصے تصوّف کے مسائل۔ تعویذ گنڈے۔ اور وظائف بلکہ منتر جنتر تک اِس میں موجود تھے لیکن آج یہ چیزیں ہماری نظروں سے کیوں نہیں گذرتیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ہماری وہی ناقابل معافی بے پروائی ہے۔ جس کے اثر میں ہم نے اسلاف کے علمی و دماغی کارناموں کے ساتھ نہ صرف بے رحمانہ بلکہ مجرمانہ سلوک روا رکھا ہے۔ شیکسپیر اور ملٹن۔ گولڈ اسمتھ اور ٹینی سن کی آندھیوں نے ہمیں اندھا کر دیا ہے۔ ہم انگریزی ادیبوں اور شاعروں کے حالات سے واقفیت رکھنے

ہیں۔ لیکن اگر واقف نہیں ہیں تو اپنے وطن کے باکمالوں سے۔ انگریز اور انگریزی پرستی کی لہر ہم میں اس قدر دوڑ گئی ہے کہ ہم اپنے وطن کی ہر شے سے نہ صرف احتراز کرتے ہیں۔ بلکہ نفرت کرنے لگے ہیں +

محمد افضل کی بکٹ کہانی درحقیقت ایک بارہ ماسہ یا دوازدہ ماہہ ہے۔ جس میں ایک فراق دیدہ عورت اپنے خاوند کی جدائی میں اپنی سکھیوں یعنی سہیلیوں سے خطاب کرکے اپنی بیتابی اور درد جدائی کی داستانِ الم سناتی ہے۔ اور جیسا کہ ہمارے ملک میں بارہ ماسوں کا دستور ہے ہر ہندی ماہ کے عنوان کی ذیل میں اپنا قصۂ غم ایک دلگداز پیرایہ میں دوہراتی ہے۔ اس کی زبان دکنی سے بہت مختلف ہے اور صاف ہے۔ اس نظم میں فارسی بندشیں اور ترکیبیں جا بیجا باندھی گئی ہیں۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو دکنی سے غیر حاضر ہے۔ ایک مصرع کی بندش آدھی فارسی میں ہے اور آدھی ہندی میں۔ حتیٰ کہ افعال وضمائر فارسی سے بھی بے تکلف کام لیا گیا ہے۔ بعض امثال یہاں سپردِ قلم کرتا ہوں:۔

چہ سازم چوں کنم کس کن پکاروں　　جتن کیا عشق کے غم کا بچاروں

دیگر ؎

جنوں در ملک جاں جھنڈا اگڑا یا　　سمجھ اور بوجھ کا تھانا اوٹھایا

دیگر ؎

چو شد مدت پیا کے سنگ رہتے　　مرم با یکدگر کہتے و سنتے

دیگر ؎

چہ می بینم کہ منگل گا دتی ہیں　　مرے گھر ناریاں سب آوتی ہیں

ذرا ضمائر متصلہ کی استعمال ملاحظہ ہو:۔

؏ "نہیں جز وصل کا سوکھا نہالم" (دیگر) "کہوں کیا اب مرکا نسش ما گہہ لینا"

دیگر :- ملے آگر چھٹے جانم جلن سوں

بلکہ فارسی کا اثر اس سے بھی زیادہ گہرا ہے۔ یعنی لفظ "دھوم" ہندی ہے۔ اس پر یہ قاعدۂ فارسی شین اضافہ کر کے حاصل بالمصدر دھومش بنالیا۔

اٹھا کر گھر منے دھومش مچائی متاع صبر تنکیں دل لوٹائی

فارسی کا ایسا اثر میر جعفر زٹلی کے ہاں بھی بہت غالب ہے۔ اس قدر فارسیت کے باوجود یہ نظم جذبات کے لحاظ سے بالکل ہندی ہے۔ اس میں ہندوانہ زندگی کا مرقع پیش کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ ہندو تہواروں۔ ہولی۔ دوالی اور دسہرہ کا مع ان کے لوازمات کے مذکور ہے۔ ہولی کے گیت گائے جاتے ہیں رنگ کی پچکاریاں ہاتھوں میں ہیں۔ دف اور مردنگ بجائے جاتے ہیں۔ سرمنڈل پھڑک رہا ہے گلال اور عبیر اڑایا جا رہا ہے۔ دوہرے اور غزلیں گائی جاتی ہیں۔ کاگا قاصد ہے۔ کوئل کوکتی ہے اور پپیہا پیہ پیہ کی پکار لگاتا ہے۔ جوگن کا بھیس۔ برہمن کا پوتھی دیکھنا۔ ٹوٹکے کرنا وغیرہ وغیرہ یہ تمام ہندی جذبات ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ محمد افضل کی یہ نظم ہندوؤں میں جیسا کہ میر حسن کا بیان ہے۔ زیادہ مقبول رہی ٭

از دوازدہ ماہ محمد افضل

سنوں سکھیو بکٹ میری کہانی پھٹی[1] ہوں عشق کے غم سوں نمانی

نہ مجھ کو سوکھ دن نہ نیند راتا برہوں کی آگ سیں سینہ جراتا

تمامی لوک مجھ بوری[2] کہیں ری نزد گم کردہ مجنوں کہیں ری

---

[1] بھئی۔ [2] باولی ٭

نہیں اس درد کا دارو کسی کن — پھئے حیراں سبھی حکماء ذوفن

اری جس شخص کوں یہ دیو لاگا — سیاناں دیکھ اوس کوں دور بھاگا

اری یہ ناگ جس کوں ڈنگ لاوے — نپاوے کاورو جیو را کوا وے

اری یہ عشق ہے یا کیا بلا ہے — کہ جس کی آگ میں سب جگ جلا ہے

کہ جس کے بیچ یہ آتش پری ہے — وہی دن رین سلکت ہے مرے ہے

وہی جانے کہ جس کے تن لگی ہے — برہو کی آگ تن من میں دکی ہے

بوائیکی نہیں جس شخص کوں پیر — چہ داند درد دیگر را اے بیر

پھٹی پور تی برہوں بیر اک سہتی — جلے جیو را مرا نت آگ سیتی

چہ سازم چوں کنم کس کن پوکاروں — جتن کیا عشق کے غم کا بچاروں

نہیں یکدم مجھے دن رین میں چین — اندھیری ہو چلی رو دو نت مری نین

جنوں در ملک جاں جھنڈا گدایا[1] — سمجھ ار بوجھ کا تھا تا او ٹھایا

او ٹھا کر گھر منیں وہوش مچا ہی — متاع صبر تسکیں دل لوٹا ہی

کیا مجھ دستگیر آں شاہ بیداد — چہ سازم چوں کنم فریاد، فریاد

پیالا عشق کی مے کا پلایا — کیا بے خود مجھے مجھ سوں بھولایا

گدا ہو کر پھروں گھر گھر و بازار — کبھو ہوئے کہ پانوں بھیکھ[2] دیدار

بہت مدت کہی کرتے گدا ہی — پیا کے وصل کی تب بھیکھ[3] پاہی

پیا نے کر پکڑ کر سوں لگا ہی — تمامی آگ تن من کی بوجھائی

چو شد مدت پیا کے سنگ رہتی — مرم با یک دگر سنتی و کہتی

تپہ چپایہ عشق نے بر من اوٹھایا — فلک دشمن مری پھیچ لگایا

مرا سکھ دیکھ اوس کوں حسرت آہی — نہادہ بر دلم داغ جدائی

---

[1] باولی، [2][3] بھیک،

بکٹ قصتہ نپٹ مشکل کہانی　　دیوانی کی سنوں سکھیو کہانی
ملن پاچھی[1] بچھڑنا ن بھی کٹھن ہی　　کہو اب زندگی کا کیا جتن ہی

ساون

چڑا[2] ساون بجیا مارو نگارا[3]　　سجن بن کون ہے سانجی ہمارا
کہنا کاری ادمد چھاتی سوں آہی　　برہوں کی فوج تے کینی چڑاہی[4]
پپیہا پیہ پیہ نس دن پوکارا　　پوکارت دادر و جھینگر جھنکارا
اری جب کوک کویل نیں سونا ہی　　تمامی تن بدن میں آگ لاہی
اندھیری رین جگنوں جگ مگاتا　　اری جلتی اوپر تیں کیا جلاتا
سونی جب مور کی آواز بن سوں　　شکیبا زدل شدہ آرام تن سوں
پھٹی جل تھل پھبیا سر سبز عالم　　نہیں جز وصل کا سوکھا تہا لم
ہندولی جھولتی سب ناریہ سنگ　　حسد کی آگ نی جارا مرا انگ
چلا ساون دگر ساجن نہ آہی　　اری کن سوکنی تونی چلاہی

بھادوں

سکھی بھادوں نپٹ بھوتی پڑپڑی　　تمامی تن بدن میرا جری ری
سیہ بادر چھاروں اور چھاہین　　لیا مجھ گھیر پیہ[5] اجھوں نیا ئیں
پھوہن پڑنی لگی اور راعد[6] کر جا　　تمامی تن بدن جیو جان لرجا[7]
کہنا کاری کی اندر بیچ چمکی　　جری جیہورا اکن سوں بہ لرچی
اکیلی دیکھ نس کاری درادی　　تمامی رین دن برہوں ستادی

---

[1] پیچھے، [2] چڑھا، [3] نقارہ، [4] چڑھائی، [5] پیہ، [6] رعد، [7] لرزا

پیا پردیس جا ہمکوں بسارا — سنجانوں کیا کنہ دیکھا ہمارا
کتھا غم کی اومد چھاتی سوں آہی — اری دو نین نیں برکھا دکاہی
اری نس دن بتاؤ بوچھ ہاری — خبر پیہ[1] کی نیا ہی ہای ہاری
جری پوتھی بہمن سبہ مرگئی ری — پھٹی کب کاک اودو ٹھک رہی ری
کہو پیہ کی خبر پوچھوں کسے جای — لکھوں پتیاں کسی دیوں ہای ری ہای
خدارا ای صبا ہیں حال میرا — پیا کوں کہو[2] کری تک ایک پیرا
دہل رحلت کا بھادوں نے بجایا — اچھوں لک ساورا پردیس چھایا

اسوج

سنوں سکھیو کہ رت آسوج آہی — پیاری کی خبر اب لک نہ آہی
کہو کیسی جیوں پیہ باجھ ناری — جنہی روتی کٹی ہی عمر ساری
لکھوں پتیاں لیے لے کاک لیجا — سلونی سانوری سندر پیا پا
کتا کن جب پیارا پیہ آدی — توجہی دیکھی مہر کری بولا دی
سلام از طرف این غمخوار کیجو — پکن کوں پرس پاتی ناتھ دیجو
اری یہ کاک باتیں سوکھ نمانی — مرم دل دردمندوں کا سنجانی
پیا بن سیج ری ناکن پھٹی ری — ہسن کھیلن کی سب سے وہ بوہ دکھی ری
دہسرا[3] پوجنی کہر کہر سکھی ری — کرم میری سنجانوں کیا پری ری
اری سبزک پیا کے باغ جا کر — اپسکوں[4] بیوفا سہتی لو کا کر
کہواری سنگ دل تب مکھ دکھایو — تیری مکھ سے اگر اک قول پاید
کہ گھر جا برہنی کوں گل لگا وو — پکر بیہاں پلنگ اوپر بٹہا وو

---

[1] پیہ، [2] کہو، [3] دسہرہ، [4] خود کو، +

کہ تیری برہوں میں ڈن رین روتے　　بغم سبہ جو بنا تجھ باجھ کھوتے

تم اوراں سیں پیاری سوکھ کرتے ہیں　　ہمن ہی برہنی سو دکھ بھرتے ہیں

دیا پردیس جا سوکن تھیں راج　　پھولایا کہر تہیں تجھ نین میں لاج

تو جہی ای سنگدل کیسی پری چپ　　جری جت آہ سوں جل تھل دوادیں

اری ظالم نداری خوف ربکا　　قیامت ہی کہری کر فکر تب کا

ڈرا کر توں ز آہ دردمنداں　　کہ می سوزد ز آہش سنگ سنداں

سکھی اس سوچ میں سبہ عمر جاتی　　سبھو سیں غم پیاری کا ستاتی

کہ ہوتے جلکتے کو ہی اس سجن سوں　　سنی دل سوں کبھی دیکھی ہمن کوں

سکھی آسوج رت جلتی رہی ری

پیا بن برہنی جلتی رہی ری

محبوب عالم عرف شیخ جیون

شمالی ہندوستان میں محمد افضل کی تحریک اُردو نظم میں کسی تنہا واقعہ کی کڑی نہیں ہے۔ بلکہ بعد میں اور لوگ بھی اس کی تقلید کرتے ہیں۔ یہ تحریک پہلے پہل ہریانی زبان میں شروع ہوتی ہے۔ جسے اجانب باتگڑو کہتے ہیں۔ ہریانی زبان مشرق میں اُردو اور شمال میں اُردو اور پنجابی مغرب میں پنجابی اور راجستانی اور مشرق میں راجستانی زبانوں سے محصور ہے۔ اور جوداوری۔ فتح آباد۔ رہتک ہانسی۔ حصار۔ کلانور۔ جھم۔ گہانا۔ نارنول۔ وغیرہ شہروں میں کسی قدر اختلاف کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ اس علاقہ کا مغربی حصّہ بالکل غیر آباد تھا لیکن فیروزشاہ نے دریائے جمنا و ستلج سے نہریں کاٹ کر اور کئی نئے شہر آباد کر کے اس کو بہت سرسبز بنا دیا تھا۔ اس سرزمین میں جھجھر کو بھی شامل سمجھنا چاہیئے۔ ہریانی زبان اُردو کے نہایت قریب ہے۔ کیونکہ دہلی کے قرب کی وجہ سے اِن اطراف میں مسلمانی اثرات ہمیشہ غالب رہے ہیں +

شیخ جیون گیارہویں صدی میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے حالات زندگی سے ہم ناواقف ہیں۔ اسی قدر معلوم ہے کہ سیّد میراں بھیکہ چشتی صابری متوفی ۱۱۳۱ھ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ چنانچہ ان کے خلفا کی فہرست میں شیخ جیون کا نام بھی ملتا ہے۔ اسپرنگر نے شیخ جیون کی مصنفات کے مفصلۂ ذیل نام دئے ہیں[+]

(۱) فقۂ ہندی (۲) محشر نامہ (۳) دردنامہ (۴) خواب نامۂ پیغمبر (۵) دہیر نامۂ بی بی فاطمہ خاتون۔ ان میں سے نمبر اول فقۂ ہندی شیخ جیون کی تصنیف نہیں ہوسکتی۔ اِس کے مالک کوئی عبدی ہیں۔ جو پنجاب سے علاقہ رکھنے

ہیں +

یہاں صرف دردنامہ کے مختصر سے تبصرہ پر قناعت کی جاتی ہے۔ دردنامہ ایک بڑی کتاب ہے جس میں پونے تین ہزار کے قریب اشعار ہیں۔ اس کی زبان رائج الوقت اردو سے بہت مختلف نظر آتی ہے لیکن جس وقت یہ کتاب تصنیف ہوتی ہے اس وقت اس کی اور دہلی کی زبان میں بہت کم فرق ہوگا +

سب سے بڑا فرق اس کی ماضی مستقبل اور مضارع کے صیغوں میں ہے۔ یہاں یہ زبان اردو اور ہریانی دونوں زبانوں کی تقلید کرتی ہے۔ مثلاً:۔

عرض اور بھی ہم جو تجھ سے رکھاں کہاں نانہ تجھ سے تو کس سے کہاں

اردو میں ایسے موقع پر رکھیں اور کہیں لاتے ہیں۔ اور یہ شکل بھی ہریانی میں موجود ہے۔ اسی طرح ماضی کی مثال:۔

مصرع تہیں میرے پیچھے بہت دکھ پڑاں (یعنے پڑے)

اردو کی لام ہریانی میں رے سے اور ڑے ڈال سے بدل جاتی ہے۔

تلوار = تروار، ڈال = ڈار، پڑھینگے = پڈھانگے، بڑائی = بڈائی، گڑا = گڈا

پڑھنا = پڈھنا، چڑھنا = چڈھنا +

الفاظ میں حرفِ دوم علت بہت نمایاں ہے۔

رکھ = راکھ، بکری = باکری، کل = کالھ، دکھ = دوکھ = الکھٹی = ایکھٹے

لگا = لاگا، اتزا = اوتزا +

غنہ کثرت سے مستعمل ہے۔

نئے = نیں، تو = توں، کوچ = کونچ، پچاس = پنچاس، سنی (ماضی) = سنیں، کو = کوں، مانے = مانیں +

ہائے مخلوط التلفظ بہت موقعوں پر خارج کردی گئی ہے۔

بھی = بی، ابھی = ابی، جبھی = جبی، باہر = بار ۔

دردنامہ کا افتتاحیہ ہے :-

چھوں میں پہل نام رحمٰن کا ۔ نہوں گیان میں ہیان سبحان کا
صحی ایک کرتار وہ پاک ہے ۔ کھڑا جس کی قدرتے افلاک ہے
وہی ہے جو کرتار عالم خدا ۔ نرنجن نرنکار سب سے جدا
جنے ایک پلک میں کیا یہ جہاں ۔ وہی توڑدے پھر خودی اور گمان
کیا جن تکبّر دہنی پاک سے ۔ پڑا عاقبت خاک پرناک سے
تکبر سے شیطان رانا گیا ۔ فرشتے سے وہ دیو دانا گیا
تکبر خودی کی نھی نسترونیں ۔ براہیم نبی سے جو مردود نیں
دیا مغز بیچ ڈانس جب کیا نی ۔ لگی لاکھ پاپوش سر پر گھنی
بنایا ارم بہشت شداد نیں ۔ لگائے بہت درم بیداد نیں
چلا بہشت کوں وہ بناگندان ۔ غضب کے فرشتے نیں کھینچے پراں

فارسی اور عربی الفاظ کے استعمال میں مصنّف ان کے اصلی تلفظ کی پروا نہیں کرتا۔ بلکہ مقامی لہجہ میں لکھتا ہے۔ مثلاً فاطمہ کو فاطماں اور طاق کو تاک لکھتا ہے اور پاک اُس کا قافیہ ٹھہراتا ہے۔ لوک کا قافیہ شوق لایا ہے۔ عکرمہ کو عکرماں لکھکر اکڑماں کا ہم قافیہ بنایا ہے۔ ہراول کو ہرول اور گرز کو گرج اور صحیح کو صحی لکھتا ہے۔

محبوب عالم کے کلام میں خاصہ حُسن اور رَوانی نظر آتی ہے۔ میں واقعہ اُحد کے چند اشعار یہاں نقل کرتا ہوں ۔

ہوئے پھر مقابل قریشوں کے تب ۔ نبی اور اصحاب ایک بار سب
عکاسہ طرف داہنی کوں کھڑا ۔ ابوسلمہ بائوں طرف پر پڑا

کیا سعد وقاص عبیدا ہرول　　کیا اور مقداد کوں جب چنڈول
ہوے آپ رمیان کی فوج میں　　نبی خاص مقبول رحمان ہیں
کھڑی فوج کفار کی بھی طیار　　کرے داہنی خالد آکر پوکار
ہوا طرف بانو یکے حب عکرماں　　کھڑا تیر تروار لے اکرٹ مال
مقابل ہوا عمر سفیان شتاب　　چلا اور بیٹا ربیعہ خراب
ہوئی صف جو دونوں طرف سے تیار　　پوکارے چھٹوں طرف سے مار مار
ترنگوں کی پھر تنگ کھینچی لگام　　بھئی تنگ اُس جنگ کی دہوم دام
دہما دم گھما گم ہوئی پھیر کر　　لیا ایک نے ایک کوں گھیر کر
کہیں برچھیاں ترچھیاں ہاتھ میں　　ہوئے مرد کی مرد جب گھات میں
کرے سیل کی ریل ادت کھیل کر　　لیا مرد نیں مرد کوں ہیل کر
شپاشپ چلے تیر سپے تیر زدر　　کھپاکھپ ہوئی پار سنجوہ پھوڑ
لگے گرج بھاری گرج شور کر　　کمر توڑ ڈالی پنٹ زور کر
پٹی دہار تلوار ادت آب دار　　جیسے پار صابن ہوسے لوہ تار
لڑائی کٹی اک قیامت اٹھی　　قیامت کی اس بات چھاتی پھٹی
کہیں مست گھومیں صحابی کھڑے　　کہیں گھاؤ کھاتے قریشی پڑے
مسلمان اصحاب نیں تیر کر　　لیا مار کفار کوں چیر کر
گئے بھاگ کافر چلے کھائے ڈر　　اٹھی (کذا) گیت جب نا ربان گا بکر

رسول اللہ کی وفات پر مصنف نے حضرت عائشہ و حضرت فاطمہ و شیخین کی طرف سے مرثیے لکھے ہیں۔ جو بالکل غزل کی شکل میں ہیں۔ لیکن وہ انہیں دوہرے کہنا ہے چنانچہ حضرت عائشہ کا دوہرا حسب ذیل ہے ؎

سکھ چین کے گھر سو دتی لاگا کلیجے تیر اب　　دکھ نین بھر بھر دو نی بھاری پڑی ہی پیڑ اب

روروکر دن ہوں تاریاں کس کوں سناؤں حال یہ — کیا سی لگی اب مرم کی دیہی گئی ہے چیر اب
جانی بنا کویل بھئی جبرجبر سبی جوں کویلا — تن ہاں لگی ہے لوکٹی دل کا گیا دلگیر اب
نس دن پوکا رڈل اکلی پیوبن سبھی تن بیکلی — آنسوں جھراں ناری بھراں نینو رہا نا نیر اب
میری ہوئی ہیں نین کٹ بنسی لگی ہے جھانجک — تڑپھوں پڑی بیکل کھڑی کیسے دہر نین ہیر اب
پیوچاہ چاہے جیو یہ پیوبن نہیں کچھ جیو نا — جیکوں تجوں بیکیوں لہوں سانچی اٹھی ہے پیر اب
پک پک پڑی تھک تھاک گئی ٹوٹا تنک ناہیں رہا — محبوب عالم نیہہ کی پاؤں پڑی زنجیر اب

حضرت عمرؓ کا دوہرہ یہ ہے ۔

محمدؐ یاد ناچوکوں پڑا دن رین کرلاؤں — کھڑا فریاد ماں کوکوں محمدؐ سا کہاں پاؤں
محمدؐ نیہہ کی پھانسی گئی گرما نہ سے ہانسی — گئی ہے ٹوٹ کر پھانسی کسے یہ حال کھلاؤں
لگن لاگی نپٹ گاڑی محمدؐ بیت نیں یادہی — یہی ہے جیو ماں ٹھادی محمدؐ نا نونت گاؤں
محمدؐ کہہ محمدؐ کہہ پکاروں میں سدا اللہ — پھروں گھر گھر یہی کہہ کہہ محمدؐ نانوں پہنچاؤں
کروں ہا ہا محمدؐ بن سہوں بپتا پڑا انس دن — گئے سب چین ہر رم ہیں کسے دکھ بات بتلاؤں
نہ سنگی ہے نکو ساتھی پھٹی اس درد ماں چھاتی — پھٹی تن کی سبھی ٹاٹی محمدؐ یا جہ من پاؤں

عجب محبوب عالم تھا نہایت خوب پالم تھا
مرانت پرت پالم تھا رہا ہے بیٹھ کس ٹھاؤں

میر جعفر زٹلیؒ

پچھلے تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر کیا ہے اور اردو شعرا میں مانا ہے لیکن حال کے تذکرہ نویسوں نے ان کے نام پر پردہ ڈال دیا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے یہ کہکر اُن سے دامن چھڑایا ہے کہ زٹل کا بھروسہ کیا۔ لیکن اُردو کی تاریخ میں ان کے خاردار و داغدار مضامین کے باوصف میر جعفر سے اعراض نہیں کر سکتے اس لئے کہ ہندوستانی اردو نگاروں میں ان کا نمبر بہت پہلے ہے ان کا اور ولی کا ایک زمانہ ہے۔ اس لئے دہلی میں ولی کے متبعین سے ان کا زمانہ اقدم ہے۔

میر جعفر اصل میں نارنول کے باشندے ہیں۔ اور سید عباس کے فرزند ہیں۔ جن کا پیشہ دکانداری تھا۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی اور میر جعفر کی ولادت ایک ہی سال کے واقعے ہیں۔ اُن سے پہلے دو بہنیں ہو چکی تھیں۔ اور بعد میں اُن کے چھوٹے بھائی صفدر ہوے۔ میر کی کم عمری میں ان کے والد کے انتقال کا واقعہ پیش آیا۔ چچا نے جن کا نام میر سرور تھا سرپرستی کی۔ مکتب میں تعلیم پانے کے بعد ملازمت کی تلاش میں نکلے اور شہزادۂ کام بخش کی فوج میں سواروں میں ملازم ہو گئے۔ چونکہ اورنگ زیب کا اکثر زمانہ دکن میں گزرا۔ اس لئے یہ بھی کام بخش کے ساتھ وہیں رہے۔ ان کا سال وفات کسی نے نہیں لکھا۔ لیکن اُن کے کلیات مطبوعۂ لکھنؤ ۱۸۴۸ء کی ایک سُرخی سے معلوم ہوتا ہے کہ فرّخ سیر نے ان کو قتل کروا دیا تھا +

میر جعفر فحش گوئی میں عبید زاکانی کے خلف ارشد معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ تو طبیعت کی افتاد اور کچھ ان ایام کی بتنذل اخلاقی حالت نے ان کو اس رنگ

میں رنگ دیا۔ ہجویں انہوں نے کم لکھی ہیں اور وہ بھی ضرورتاً لکھی ہیں۔ تاہم ان کی زبان درازی اور بیباکی میں کوئی شک نہیں۔ ان کے قلم سے راجا سے پرجا تک کوئی نہیں بچا۔ وہ نہ شہزادوں سے خائف تھے اور نہ خانوں سے جس نے انہیں چھیڑا۔ نقصان اٹھایا۔ مشہور نو زٹل ہیں لیکن کلام کو خداداد قبولیت حاصل تھی اسی لئے دنیا اُن سے کنیاتی تھی۔ ان کی زبان سے عورتیں بھی نہیں بچیں عالمگیر اگرچہ نہایت ثقہ اور متین بادشاہ تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے اُس کی انتہائی سنجیدگی اور متانت کی تلافی کے لئے ایک ہی وقت میں دو زبردست ہزال اور فحش گو فارسی اور اُردو زبانوں میں پیدا کر دیئے۔ ایک یہی ان سطور کے موضوع اور دُوسرا نعمت خاں عالی ۔

قمر النسا بیگم نے میر صاحب کو تیس روپیہ انعام دیئے جانیکا حکم دیا۔ بیگم کے دیوان فتح علی خاں نے پانچ دبکر ٹالنا چاہا۔ میر صاحب اس پر بگڑ گئے۔ دیوان صاحب کی ہجو الگ لکھی اور روپیہ الگ وصول کیا۔ خانجہان خان بہادر کوکلتاش عہد عالمگیر کے مشاہیر امراسے ہیں۔ میر نے ان کی خدمت میں ایک قرآن مع ایک عدد قصیدہ پیش کیا۔ اور قرآن شریف کے ہدیہ اور قصیدہ کے صلہ کیلئے عرصہ تک منتظر رہے لیکن کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہوا۔ آخر میر نے تنگ آکر خان والا شان کی ہجو لکھی۔ ایک امیر نے ان کو پانچ اشرفیاں انعام دلوائیں۔ اس کے دیوان خدایار بیگ نے اشرفیاں دبا لیں۔ میر کو خبر لگی۔ خدایار پر برس پڑے اس ہجو کے آخر میں فرماتے ہیں ؎

جو کوئی مجھ اوپر شفقت کرے	جگت بیچ اس کی خدا پت رکھے
نہ ایں ہجو از راہ حرص و ہوا ست	دلآزار را ہجو کردن رواست
بیا جعفرا کنوں شکایت مکن	زموذی و راضی حکایت مکن

میر کے قلم سے عالمگیر کے فرزندوں میں کوئی بھی نہیں بچا۔ اِن شہزادوں کی آپس کی رقابت نے دکن کی مہم کو ایک نہایت پیچیدہ اور کٹھن کام بنا دیا تھا۔ محمد معظم کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

تخستیں کلاں نزکہ برکھنڈ کرد ہمہ کار و بار پدر بھنڈ کرد
چناں لوٹ شد بستی بھگ نگر نہ غار ماصفا ماند نہ ما کدر
چہ بنکے بدستِ خود آورده داد مگر از بہشتش اساسے نہاد
جہاں ہوے ایسا کاپچھن کپوت لگے خلق کے منہ کو کالک بھبوت

اور محمد اعظم شاہ کے حق میں کہتے ہیں ؎

دگر شاہ اعظم ہمہ کند در برسوائی انداخت کار پدر
بخو شد امن دخپوره ساختہ بہ للّو پتو کار در باختہ
فرستد ایناں بشب پان پھول ملا کر کیا کام سب خاک دھول
ازیں اختلافش کہ گیرد خراج کہ دھنگ بھنگ گشت است للّو کا راج

محمد اکبر کے لئے کہتے ہیں ؎

چہارم پسر ڈومنی کا جنا

خود شہزادۂ کامبخش پر بھی میر نے ہاتھ صاف کیا۔ خیریت اسی میں گذری کہ نوکری سے موقوف کر دیے گئے۔ میر اپنی اس غلطی کو مانتے ہیں اور پشیمان بھی ہیں :-

ازہجو آں سلطان خود کردی پریشاں جانِ خود درماندہ بے بال و پر کہہ جعفر اب کیسی بنی
با بادشہ تیں بیر کی سر کی خدا نے خیر کی تا حال ہم داری حذر کہہ جعفر اب کیسی بنی
وہ ذوق ہر دم کا کہاں وہ عطر بیگم کا کہاں درخاک شد آں کر و فر کہہ جعفر اب کیسی بنی

عالمگیر نے "امجد خاں" کا خطاب ایک امیر کو دیا۔ میر نے اس واقعہ کی تاریخ "جعل سگ" نکالی جس سے ۱۱۱۳ھ برآمد ہوتے ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ میر اورنگ زیب کا

ہمیشہ نہایت ادب سے ذکر کرتے ہیں۔ اس کی زندگی میں نیز وفات کے بعد بھی اس کا احترام کرتے رہے۔ اگرچہ ایک آدھ جگہ اس کو للو کہہ گئے ہیں تاہم کوئی ہجو مقصود نہیں ہے اس کی وفات پر جو ہندوستان کا نقشہ بگڑا ہے اور رعایا پر ایک عالمگیر بے اطمینانی اور بے چینی چھائی ہے اس کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں ؎

کہاں اب پایئے ایسا شہنشاہ ۔۔۔ مکمل اکمل و کامل دل آگاہ

رکت کے آنسوؤں جگ روتا ہے ۔۔۔ نہ میٹھی نیند کوئی سوتا ہے

صدائے توپ بندوق است ہر سو ۔۔۔ بسر اسباب بندوق است ہر سو

دوا دو ہر طرف بھاگڑ پڑی ہے ۔۔۔ بچہ در گود سر کھٹیا دھری ہے

کٹا کٹ و لٹا لٹ ہست ہر سو ۔۔۔ جھٹا جھٹ و پٹا پٹ ہست ہر سو

بہر سو مار مار و دھاڑ دھاڑ است ۔۔۔ اوچل چال و نبر خنجر کٹار است

ازاں اعظم وزیں سوئے معظم ۔۔۔ جھڑا جھڑ و دہڑا دھڑ ہر دو باہم

بہ بینم تا خدا از کیست راضی ۔۔۔ بخواند خطبہ بر نام کہ قاضی

محمد معظم کے دور میں میر نے ایک رسالہ اخبار دربار معلّٰی کے نام سے لکھا ہے جس میں اوّل دربار کے فرضی وقائع بیان کئے جاتے ہیں اور پھر ان کے متعلق شاہی احکام صادر ہوتے ہیں۔ میر نے یہ شاہی احکام اکثر اوقات ضرب الامثال کی زبان میں ادا کر دیئے ہیں۔ اس طرح ہمیں کسی قدر اس عہد کی ضرب الامثال سے واقف ہو جانے کا موقع مل جاتا ہے۔ میں بعض یہاں نقل کرتا ہوں۔ اکثر وہی ہیں جو آج بھی رائج ہیں ۔

"(۱) چوم چھاڑ ابھاری پتھرا (۲) تجھے پرائی کیا پڑی تو اپنی آپ نبیڑ۔ (۳) ہارا حاکم ضامن چا ہے۔ (۴) اندھے کی جورو کا خدا رکھوارا (۵) دُم جو پکڑی بھیڑ کی وارا ہوا نہ پارا۔ (۶) باندر کے ہاتھ ناریل۔ (۷) باسی لٹے

نہ کوتا کھائیے (۸) ٹھالا بنیا پنیری تولے۔ (۹) ماں پر پوت پتا پر گھوڑا ٭ بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا ٭ (۱۰) بہرے آگیں گا ونا اور گونگے اگے گل ٭ اندھے آگیں ناچناں بتیبنوں ال بل ٭ (۱۱) دبی بلی چوہے پاس کان کترا وے (۱۲) گدھوں کھایا کھیت پاپ نہ پن۔ (۱۳) داتا کی ناو پہاڑ چڑھے۔ (۱۴) مارے منہ طباخ سے اگے دہرا نکھاے (۱۵) ترت دان مہا پن (۱۶) اوکھلی میں سر دینا دھکوں سے کیا ڈرنا (۱۷) کہاویں بیویں محمود کے اور آویں مسعود کے۔ (۱۸) پاسا پڑے سو داؤ راجا کرے سو نیاؤ۔ (۱۹) اٹھا نمڑا اور پوچا سٹکا۔ (۲۰) جیسا بوشے ویسا اوپے (کذا) (۲۱) خار شتی کتے مخمل کی گدّی اور اس پر بانانی جھول (۲۲) چار دن کا چاندنا اور پھر اندھیری رات"

اس رسالہ کے متعلق ایک حیرت خیز واقعہ یہ ہے کہ اس میں عالمگیر ثانی متوفی ۱۱۷۳ھ اور شاہ عالم ثانی متوفی ۱۲۲۱ھ کے زمانوں کے بعض واقعات درج ہیں۔ مثلاً احمد شاہ درانی۔ سورج مل جاٹ اور مرہٹوں کا دہلی میں ہنیلا وغیرہ اب یہ ناممکن ہے کہ میر عالمگیر کے جلوس کے سال ۱۰۶۹ھ میں پیدا ہو کر بارہویں صدی کے اختتام تک زندہ رہیں۔ حالانکہ ان کی عمر ساٹھ سے کچھ اوپر بتائی جاتی ہے جس حساب سے انہیں فرخ سیر ۱۱۳۱ھ کے زمانہ میں انتقال کرنا چاہیئے۔ اس صورت میں یہی خیال کیا جا سکتا ہے کہ میر کے کسی فرزند معنوی نے میر کی وفات کے بعد بھی اخبار دربار معلّٰی کو جاری رکھا ٭

جب میر ملازمت سے برطرف کر دیئے گئے۔ اُن کا ملازم ان کا تمام اندوختہ لے کر بھاگ گیا۔ میر نے اپنے دل کا بخار نثر میں اس طرح نکالا:۔

"درعین وقت بیکاری و چنیں ناداری غنی ازلی و متقنی دہنیہ و چہ غبنہ چگونہ نفرے بے پدرے ما چہ خرے فرصت وقت را یافتہ۔ متاع کثیر و قلیل را گرفتہ

بگوئندۂ نخ بید۔ قولہ تعالیٰ یَفْعَلُ اللہُ مَا یَشَاءُ وَیَحْکُمُ مَا یُرِیْد۔
مثلاً موسے پرسوورے ۔ مثلاً ۔ جیسے کوڑہ میں کھاج ۔ مثلاً ۔ بلکہ بے خرچی
میں آٹا گیلا ۔ بیا جعفر مجوش ومخروش نشنیدۂ کہ گفتہ اند ۔"
جب فرخ سیر تخت نشین ہوا۔ اس کے سکہ پر یہ شعر کندہ کیا گیا ؎

سکہ زواز فضل حق بر سیم وزر پادشاہ بحر و بر فرخ سیر

میر کی طبیعت بھی جولانی پر آئی۔ آپ نے اپنے انداز میں اس سکہ کو یوں سجایا:۔

سکہ زد برگندم و موٹھ و مٹر پادشاہ پشتہ کش فرخ سیر

میر تقی میر نے لکھا ہے کہ میر جعفر ایک روز میرزا بیدل کے ہاں گئے۔ اور
فتوح کی امید میں یہ مصرع پڑھا ؎

چہ عرفی چہ فیضی بہ پیش تو ہیچ

میرزا بہت برہم ہوے اور کچھ دلوا کر ٹال دیا +
میر حسن بیان کرتے ہیں کہ میر جعفر ایک دن میرزا بیدل کے گھر گئے۔
بیدل اس وقت فکر شعر میں مشغول تھے۔ کچھ توجہ نہ کی۔ میر زیادہ انتظار نہ کر سکے
پوچھا۔ قبلہ وہ مصرع کیا ہے جس کے دوسرے مصرع کی تلاش ہے۔ بیدل نے
کہا وہ مصرع یہ ہے ؎

لالہ در باغ داغ چوں دارد

میر نے سنتے ہی بے تامل کہا ؎

چو نکے سبز زیر . . . دارد

بیدل بہت خفا ہوے۔ اور کچھ دے کر پیچھا چھڑایا +
میر جعفر کے کلیات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانہ میں
اردو اور فارسی میں گنگا جمنی پیوند دئے جانے کا دستور تھا۔ اور زبان کی وہ

شاہراہ جو بہ تقلید دکن عہد محمد شاہ میں قایم ہوئی ہے۔ اس وقت تک طیار نہیں ہوئی تھی۔ ان کا کلیات اگرچہ مختصر ہے تاہم اس میں ہم سینکڑوں عجیب و غریب الفاظ پاتے ہیں جو آج متروک ہیں۔ ثقہ و سنجیدہ مضامین پر انہوں نے بہت کم ہاتھ ڈالا ہے لفاظی میں نظیر اکبرآبادی سے کم نہیں ہیں۔ ان کی طباعی اور ذہانت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ زبان اُردو کا ایک بڑا ذخیرہ ان کے کلیات میں موجود ہے ✤

میر اپنے تمسخر کی لہر میں اکثر اوقات ہندی الفاظ کو عربی بند میں دے دیتے ہیں۔ مثلاً:۔

"چوں گھڑگھڑاہٹ الرعد فی الغمام وکڑکڑاہٹ البرق فی الہرام بر سر است وہنگام گھٹا گھور صبح و شام شور دارد و موریہ دوام و آوازِ لرزۃ العمارات
وگڑپڑۃ الکھنڈرات ولوٹ الجھبرو البوچھاڑ فی المنظر است و دل وحشت منزل
علی الغچ پیچ ؛ الکیچ کھاچ کو چھائے چھچھی اگین اکراہ میور زد"

یا فارسی کے مطابق ہندی افعال کی تصریف کر دیتے ہیں۔ جیسے:۔

"(۱) نہ ہلدنہ ٹلدنہ جنبدز جا (۲) مثل تو نباشد بجہاں اے فتنہ خوباں
ٹلکندۂ مٹکندہ بہ رفتار جو ہے سو"

یہ طرز اور زبانوں میں بھی موجود ہے۔ طرزی نے اسے فارسی میں اختیار کیا ہے اور سولہویں صدی کے انگریزی شعرا کے کلام میں ایسے نمونے کثرت سے ملتے ہیں۔ جن میں انگریزی اسماء و افعال کو لاطینی زبان کی تصریف کے مطابق برتا گیا ہے ✤

یہاں کسی قدر کلام کا نمونہ حوالۂ قلم کیا جاتا ہے:۔

نہ سوسکھ سیج راحت میں سدا رہ زود طاعت میں ۔۔۔ اجل بھی ہوگی ساعت میں کہ آخر خاک ہو جانا
جنہوں کے لاکھ تھے گھوڑے سدا زربفت کے جوڑے ۔۔۔ انہوں کو موت نے توڑے کہ آخر خاک ہو جانا
جنہوں گھر جھولتے ہاتھی ہزاراں یہ ین دن سیاتھی ۔۔۔ تنہوں کو خاک اب کھاتی کہ آخر خاک ہو جانا

مگر جب موڑ کر چلتے عطر سب دیہہ پر ملتے ؛؛ دیکھو اب خاک میں رلتے کہ آخر خاک ہو جانا
جنوں کے لال تھے ہیر سدا مکھ پان کے بیڑے تنہوں کو کھا گئے کیڑے کہ آخر خاک ہو جانا
سدا جو پہنتے ململ محل میں باجتے مندل گئے وہ خاک میں رلل کہ آخر خاک ہو جانا
لٹکتی باندھتے پاگاں محل میں رنگ اور راگاں وہاں ہیں بیٹھتے کاگاں کہ آخر خاک ہو جانا
لذت کا کھاوتے کھانا پہرتے ریشمی باناا اُنہوں کو موت نے بھانا کہ آخر خاک ہو جانا

ہزاراں شہر کے راجا جنو مکھ چاند سے لاجا
نقارا موت کا باجا کہ آخر خاک ہو جانا

در بیان نوکری :-

بشنو بیاں نوکری جب کانٹھ ہووے کھوکھری جب بھول جاوے چوکڑی یہ نوکری کا حظ ہے
ہر روز اٹھ مجرا کریں در کار یک صد گر پڑیں بے شرم آپس میں لڑیں یہ نوکری کا حظ ہے
ہر صبح ڈھونڈیں نوکری کوئی نہ پوچھے بات ہی سب قوم ڈھوویں لاکڑی یہ نوکری کا حظ ہے
چوکی لکھیں اور حاضری کھاون نپاویں باجری تسپر چلاوے ناظری یہ نوکری کا حظ ہے
راکھے سپاہی کھات کو چوکی دلاویں رات کو کوئی نہ پوچھے ذات کو یہ نوکری کا حظ ہے
صاحب عجب بیداد ہے محنت ہمہ برباد ہے ایدوستاں فریاد ہے یہ نوکری کا حظ ہے
ہم نام کو اسوار ہیں روزگار سے بیزار ہیں یار وہمیشہ خوار ہیں۔ یہ نوکری کا حظ ہے
یک تیر بے پیکاں نگر دروے نہ سوفار و نہ پر نوط نماندہ در کمر یہ نوکری کا حظ ہے
دربار دیکھا خان کا بیڑا نپایا پان کا زر کا نہ پھر امکان کا یہ نوکری کا حظ ہے

انقلاب زمانہ :-

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے
نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھاوَن میں وفاداری محبت اٹھ گئی ساری، عجب یہ دور آیا ہے
نبولے راستی کوئی عمر سب جھوٹھ میں کھوئی اتاری شرم کی لوئی، عجب یہ دور آیا ہے

خوشامد سب کی یں رکی چہ بیگانہ چہ زن گھر کی ؛ ملاحے بات سب ہر کی عجب یہ دور آیا ہے
نفر کی جب طلب ہووے نفر باہر کھڑا روے میاں گھر میں پڑا سووے عجب یہ دور آیا ہے

یہ واضح رہے کہ اشعار بالا میں ردیف پر قناعت کی گئی ہے اور قافیہ کا استعمال نہیں ہوا ہے۔ محبوب عالم کے دوہروں کی بھی یہی خصوصیت ہے۔ نظموں کا یہ دستور پنجاب میں بہت عام تھا۔

سیّد اٹل نارنولی

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ میر جعفر زٹلی کے بھائی ہیں۔ اگر سگے بھائی نہیں ہیں تو روحانی ضرور ہیں۔ ان کا ایک رقعہ کلیات جعفر زٹلی میں محفوظ ہے اس رقعہ کے ملاحظہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اور میر جعفر کا مذاق ایک ہی رنگ کا ہے اور زٹل اور اٹل میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ وہو ہذا:-

"رقعۂ سیّد اٹل کہ از نارنول نوشتہ بمیر جعفر در دکن فرستادہ بود"

"پناہ بڑائی و چوڑائی میر جعفر زٹلی بڑے بھائی ہر روز از یاد حق سکھی باشد۔ از سیّد اٹل بعد از ہک جہار بسیار او رمنو ہا ربیشمار او جھل و مخفی نماند کہ پیر پریت ہموطن داومنگ ملاقات و اشتیاق آں از حد پر گھٹ نپیٹ بیروں و از جہت اندیشہ بنہایت افزوں لیک بموجب آں کہ کُلُّ اَمرٍ مَرہُونٌ بِاَوقَاتِہَا حوالہ نمودہ دوا بجھر می نگارد کہ بعضے بدبختاں کا فرکھٹّھ دلی بوجہ مزید غشہ در جوی خودی چوں غوک از ندی ٹرٹر می کردند و اکھاڑ پچھاڑ کردہ در نارنول ٹھیکا ٹھاہ بودم و بعضے ٹڑوں و چرچوں از برائے ایں نپٹ مہربان از دہان ... قشان

چوں ... پڑپڑ بر زبان می آوردند۔ نظم ؎

زٹل تیری جعفر جہانگیر شد زٹل گفتن اندر توئی میر شد

امید کہ خود دریں بلیۂ ہادی بودہ از خط و کتابت بھول جانا روا نباشد۔ بیت ؎

نام حق روز و شب پکارا کر خط کتابت کو بھی بچارا کر"

اس قطعہ کا جواب میر جعفر نظم میں دیتے ہیں۔ جو یوں شروع ہوتا ہے :۔

سنو اے سخنداں برادر عزیز اٹل نار نولی توئی باتمیز

اسی جواب میں زٹل ذیل کا شعر بھی لکھتے ہیں ؎

منم کمتریں بندہ شاگرد تو شب و روز دریاد و در ورد تو

جس سے شبہ ہوتا ہے کہ کہیں زٹل اور اٹل ایک ہی بھروپ نہ ہو۔

غزل ذیل سید اٹل کا نمونۂ کلام ہے جو ایک بیاض نوشتۂ عہد محمد شاہی سے نقل کی جاتی ہے ؎

رخسار پر بہار سجن رونق چمن یا گل گلاب کا کہوں یا لالہ یاسمن
یا حقۂ جواہر و یا درج در کہوں یا غنچۂ گلاب کہوں یا کہوں دہن
گیسوئے تابدار ہیں یا ناگ ہے بھونک یا زلف مشک رنگ ہے یا نافۂ ختن
با قد خوش خرام چلے جب لٹک لٹک شمشاد اور صنوبر جسم کھاوین چمن
چوں ماہتاب دی او کرتا ہے جھمک جھمک یا آفتاب گشتہ درخشندہ در گگن
بیداد گر ستمگر ظالم عجب عجب گہ مہربان و گاہ غضبناک و خندہ زن
بر توسن کرشمہ سوار است نازنیں سید اٹل زیادۂ دیدار او مکن

(از بیاض پرتاب سنگھ ساکن موضع آدر عملہ پرگنہ راہون۔ دوآبہ بست جالندھر بست و نہم شہر جمادی الاوّل ۱۱۵۹ھ جلوس والا ے محمد شاہ بادشاہ غازی)

فارسی لُغات سے اُردو کی قدامت کی شہادت

اکبرِ اعظم کے عہد میں فارسی خوانیکا رواج از سرِ نو تجدید پاتا ہے۔ اس عصر میں علوم و فنون نے وہ ترقی کی جو گذشتہ ایام میں نامعلوم تھی۔ فیروز شاہ تغلق کی وفات کے بعد ۷۹۰ھ سے لیکر اکبر کے جلوس ۹۶۳ھ تک کا زمانہ ہندوستان میں فارسی کے لئے عہدِ تاریک کا حکم رکھتا ہے۔ اس زمانہ میں بہت کم تصنیفات ہوئیں اور نہ کوئی چوٹی کا مصنف یا شاعر پیدا ہوا۔ یوں تو فارسی کا ستارہ اس زمانے سے پیشتر بھی گہنانے لگ گیا تھا۔ خلجیوں میں علاء الدین محمد شاہ ۷۱۵ھ کا زمانہ انقلاب خیز ہے۔ اس کا عہد زمانۂ ماسبق کے اثرات کی بنا پر اگرچہ علم و فضل کے علمبرداروں سے خالی نظر نہیں آتا۔ اور علما و فضلا۔ ادیب و شعرا کا جمگھٹا پایۂ تخت میں موجود تھے۔ لیکن بادشاہ بذاتِ خود جاہلِ مطلق تھا۔ اور پرستارانِ علم سے اس کو کوئی الفت نہ تھی۔ حتیٰ کہ اُس نے اپنی اولاد تک کو جاہل رکھا۔ اور محل میں اُن کی پرورش ہوتی رہی۔ اس کے قواعد و ضوابط جاسوسی کی سختی نے رعیت کے دلوں میں پڑھے لکھوں سے نفرت پیدا کر دی تھی۔ لوگ نویسندوں کو بیٹی دینا تک ناپسند کرتے تھے۔ شاعروں، مورخوں، ادیبوں اور عالموں کی اس کے دربار میں آمد و رفت رہی لیکن بادشاہ کو اس جماعت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ یہ لوگ اُس کے نزدیک دربار کی رونق اور نمایش و نمود کے سوا کسی مصرف کے نہ تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آخر عہد علائی سے تعلیم یافتہ طبقہ کی تعداد گھٹنے لگی۔ اور عوام الناس میں تعلیم کا ذوق و شوق کم ہو گیا۔ علوم کی بیرواجی کے ساتھ ساتھ فارسی پر بھی زوال آگیا تغلقوں نے کسی حد تک اس تنزل کی روک تھام کی۔ لیکن فیروز شاہ کی وفات پر

کامل اندھیرا چھا گیا۔ فیروز شاہ کے جانشینوں خضر خانیوں۔ لودھیوں اور سوروں کا زمانہ فارسی کے لئے نہایت بدفال تھا۔ بالخصوص پٹھانوں کا جو فارسی کے دشمن مطلق تھے۔

شیر شاہی عہد کے پٹھانوں کے ذکر میں اخوند درویزہ اپنے مرشد سیّد علی ترمذی کے یہ الفاظ نقل کرتے ہیں:۔

"بحکم آنکہ جہل و سختی بر افغاناں غالب است تا ہر کہ برزبان فارسی نطق و تکلم کند اورا دشمن میگیرند"۔

ان ایّام میں دیسی زبانوں کی طرف عام توجہ ہو گئی تھی۔ مذہب و تصوّف اور شاعری کا سب سے زیادہ چرچا تھا۔ برج، اودھی اور قنوجی کے بعض مشہور شاعر اسی زمانہ میں پیدا ہوئے۔ دنیا مذہب و تصوّف کے پیچھے دیوانی ہو رہی تھی۔ اور ہر قسم کے شیاد بشرطیکہ ان میں لسّانی و طبّاعی موجود ہو۔ ایک نیا فرقہ اور نیا مذہب بنانے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ مداری وجلالی فرقے۔ مہدویوں کی تحریک۔ کبیر پنتھی دادو پنتھی۔ ستنامی اور نانک پنتھی اسی زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ قصّہ مختصر نئے مذہب بنے۔ نئے فرقے اُٹھے اور تصوف پھلا پھولا۔ لیکن فارسی ہندوستان میں ٹھٹھر گئی۔

علمی لحاظ سے ان ایام میں اگر کوئی کام ہوا ہے تو یہ ہے کہ طبیبوں نے طب یونانی کو ہندوستانی فضا کے مطابق ڈھالا۔ عربی و فارسی ادویہ کے اسما کو ہندی اسما کے ساتھ مطابقت دی۔ درحقیقت یہ ایک نہایت مفید کام تھا جو اس عصر کے اطبا نے کیا۔ اس کے ماسوا جیسا کہ دَورِ تنزل میں دیکھا جاتا ہے شرح نگار پیدا ہوئے اور اسی ضرورت نے فرہنگ نگاروں کی جماعت پیدا کی۔ یہاں چند الفاظ انہی لغات نگاروں کی بابت کہنا چاہتا ہوں۔

ہندی فرہنگ نگاروں میں سب سے مقدم مولانا فخرالدین مبارک غزنوی قواس یا کمانگر ہیں جو علاءالدین خلجی ۶۹۵ھ و ۷۱۵ھ کے عصر کے مشہور و معروف شاعر ہیں ضیاءالدین برنی اور فرشتہ دونوں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ ہندوستان میں ان کا فرہنگ نامہ فارسی لغات کا سنگ بنیاد ہے۔ ہماری نظر میں اس کی اہمیت یوں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ فارسی الفاظ کی تشریح کرتے وقت بعض موقعوں پر مصنف نے ہندی الفاظ بالخصوص دواؤں اور دیگر اشیا کے نام بھی دے دیئے ہیں۔ میں یہاں بعض الفاظ نقل کرتا ہوں :-

اظفارالطیب کے لئے کہتے ہیں :-

"ہندش وکہ ونکہ گویند" دوسرے معنے لکھتے وقت کہا ہے : "بیاری ناخن بریاں۔ ہندش نکھہ نامند"

ابرنیساں کے واسطے کہتے ہیں :-

"اہل ہند آنرا باراں سواتی نامند و آں ابتدائے زمستان و انتہائے برشکال است"۔

برسنو :- "مرغیکہ ہندش بھکراج گویند"

تاک :- "ہندش چھیکا نامند"

چغوک :- "قبرہ یعنے مانورک و بہندوی منترہ گویند"

کت :- "تخت ہنداں باشد میان بافتہ"

فاقلہ :- "سایہ پرورکہ ہندش نیری گویند"

ہفوش :- "چیزیست خوردنی کہ برنج ترکردہ میکوبند و در جامہ بستہ بالائے آب گرم در آونختہ مہر کردہ و مغدائے در آں سوراخ کردہ میدارند۔ از بخار آں پختہ میشود۔ ہندش بھاکہ نامند (منقول از موید الفضلا)

میں انہی نمونوں پر اکتفا کرتا ہوں جن میں سے نصف آج ہم نہیں سمجھتے۔ مولانا کی تحریک اس قدر مبارک ہوئی کہ ان کی تقلید میں اور لوگوں نے بھی فرہنگیں لکھنی شروع کیں چنانچہ مولانا رفیع المعروف بہ حاجب خیرات نے ۷۳۱ھ میں دستور الافاضل اور ملا رشید برادر جد جامع شرف نامۂ منیری نے زفان گویا۔ قاضی بدرالدین محمد دہلوی نے ۸۲۲ھ میں اداۃ الفضلا ۸۷۳ھ میں محمد بن داؤد شادی آبادی شارح خاقانی دانوری نے مفتاح الفضلا۔ مولانا ابراہیم بن قوام فاروقی نے رکن الدین باربک شاہ ۸۶۴ھ و ۸۷۹ھ کے زمانہ میں شرف نامۂ منیری۔ مولانا محمود بن شیخ ضیا نے ۹۱۶ھ میں سکندر لودھی کے نام پر تحفۃ السعادت وغیرہ تصنیف و تالیف کیں۔ ان کے علاوہ طب حقائق الاشیا۔ قنیۃ الطالبین از قاضی شاہ۔ موائد الفوائد۔ لسان الشعرا۔ فوائد الفضلا۔ لسان الشعرا بھی اہم تالیفات ہیں۔ جن کے زمانوں اور مصنفین سے ہم ناواقف ہیں۔ ہماری دلچسپی کا سامان جو ان فرہنگوں میں ہے یہ ہے کہ ان میں سے اکثر مصنفین نے فارسی الفاظ کی شرح کے وقت ان کے ہندی مرادفات بھی دیدئے ہیں۔ اور یہ التزام قریب قریب تمام مصنفین نے کیا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ ان ایام میں ہندی کی طرف ایک عام رجحان ہوگیا تھا وہ ہر غیر معمولی لفظ کا ہندی مرادف دیدیتے ہیں۔ اگر موجود نہیں ہے تو وضع کر لیتے ہیں۔ یہ عمل طبی تالیفات میں زیادہ تر مشاہدہ میں آتا ہے۔ میں اس کو کسی قدر واضح کرنا چاہتا ہوں۔ زبان کی ارتقائی تعمیر میں ایک اصول یہ بھی ہے کہ وہ دوسری زبان کے الفاظ کو یا تو بعینہ لیلیتی ہے یا اُن کا ترجمہ کر لیتی ہے۔ اس کی مثال میں لفظ "اذان الفار" ہم لیتے ہیں۔ اذان الفار ایک بوٹی ہے جس کے پتے زمین پر پھیلے ہوتے ہیں۔ شاخیں باریک ہوتی ہیں۔ اور پتوں کی شکل چوہے کے کانوں کے مشابہ ہوتی ہے۔ اس شباہت کو دیکھ کر حکما نے اس کا نام اذان الفار رکھدیا

فارسی والوں نے اس کا مرزنگوش کر لیا۔ فارسی میں مرزن چوہے کے معنوں میں آتا ہے جب حکما کو ہندی میں اس لفظ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تو انہوں نے وہی اصول اختیار کر کے اس کا ترجمہ "موساکنی" کر لیا۔ اب موساکنی اپنے پانسو سال بیشتر ہندی میں مستعمل ہو رہا تھا۔ متاخرین یا تو یہ ترجمہ بھول گئے یا کسی اور مصلحت کے زیر اثر موساکنی کو "چوہہ کنی" کہنے لگے۔ اسی طرح اظفار الطیب ہے۔ جسے فارسی میں ناخن پریاں اور ہندی میں جٹھیہ کہر اور نکھ کہتے ہیں۔ یہاں ناخن کی رعایت تینوں زبانوں میں موجود ہے۔ اسی قیاس پر بصاق القمر کا ہندی ترجمہ "چندر کانت" کیا گیا۔ بصاق لعاب و کف دہن کو کہتے ہیں۔ کانت کے معنے مجھے معلوم نہیں لیکن قیاس چاہتا ہے کہ بصاق کا ہم معنے ہوگا۔ اسی قیاس پر "منزو گربہ" اور "حاذ گربہ" کا ترجمہ "بلائی لوٹن" اور "بلی لوٹن" کیا گیا ہے۔ زبد البحر فارسی میں کف دریا ہندی میں سمندر پھین اور پنجابی میں سمندر جھگ اسی اصول پر مبنی ہے۔ اس قسم کی بیسیوں اور مثالیں بتائی جا سکتی ہیں۔

یہ امر یاد رہے کہ یہ فرہنگ نگار جس چیز کو ہندی کہتے ہیں وہ نہ برجی ہے نہ پنجابی۔ نہ راجستانی اور نہ بنگالی و گجراتی۔ ہندی سے ان کی مراد یہی اُردو ہے جو اس عہد کے مسلمانوں میں بالعموم رائج تھی۔ اس نے ان بعید زمانوں میں بھی اس قدر ترقی اور وسعت اختیار کر لی تھی کہ پنجاب۔ بنگالہ۔ گجرات اور ہندوستان میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اس کی دلیل ہمارے پاس یہ ہے کہ مذکورۂ بالا فرہنگ نویس باوجودیکہ مختلف مقامات ہند سے تعلق رکھتے ہیں کوئی مالوہ کا ہے۔ کوئی بنگالہ کا۔ اور کوئی پنجاب کا۔ جہاں مختلف زبانیں بولی جا رہی ہیں۔ اور ان لوگوں کا اپنے اپنے وطن کی زبانوں سے واقف ہونا بھی لازمی ہے۔ لیکن اپنے لغات میں وہ وطنی زبانوں کے الفاظ نہیں دیتے بلکہ اسی عام زبان کے جو تمام ملک کے

مسلمانوں میں مشترک تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ الفاظ ان تمام لغات میں عام ہیں۔ یہ خیال نہ کیا جائے کہ چونکہ فرہنگ نویس ایک دوسرے سے نقل کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ الفاظ ان لغات میں عام ہو گئے ہیں۔ اس خیال کی تردید نہایت آسانی سے کی جاسکتی ہے +

اِن ہندی الفاظ کے ذخیرہ میں بعض ایسے الفاظ بھی نظر آتے ہیں۔ جو اگرچہ اصلاً فارسی ہیں۔ لیکن فارسی والوں نے ان کو متروک قرار دیدیا ہے۔ مگر چونکہ اُردو میں برابر استعمال ہوتے رہے ہیں۔ اس لئے فارسی خوانوں نے ان کا شمار ہندی الفاظ میں کر لیا ہے۔ یا بعض وجوہ سے ہندی ہیں انہوں نے دُوسرے معنے پیدا کر لئے ہیں۔ بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جو فارسی خوانوں نے ہندوستان میں ایجاد کیئے لیکن فصحا نے ان کو تسلیم نہیں کیا۔ اور فارسی سے خارج کر دیئے گئے۔ مگر چونکہ عام رواج میں تھے اس لئے انہیں ہندی تسلیم کر لیا گیا۔ یہاں چند مثالیں دی جاتی ہیں :۔

انگشتانہ لازمی طور پر فارسی لفظ ہے۔ جو انگشتوانہ سے بنا ہوگا۔ وہ لوہے کی ایک ٹوپی ہے جس کو درزی سوئی کے زخم سے محفوظ رہنے کی خاطر سیتے وقت انگلی میں پہن لیا کرتے ہیں۔ ایرانیوں نے اس کے لئے اور لفظ وضع کر لئے۔ مثلاً "انگشت دان" اور "آہن آشیان" وغیرہ۔ اب آخری لفظ کی تشریح میں صاحب مویدالفضلا کہتے ہیں

"در ہندی انگشتانہ گویند" +

ظاہر ہے کہ اس ہندی سے مصنف کی مراد بھاشہ واودھی زبانیں وغیرہ نہیں ہیں۔ بلکہ اُردو جس کا قدیم نام ہندوی ہے گویا اُردو بولنے والوں میں یہ لفظ اس کثرت کے ساتھ استعمال ہو رہا تھا کہ فارسی خوانوں نے اس کو ہندی تسلیم کر لیا +

لفظ "کاس" کی شرح میں مصنف مذکور کہتے ہیں :۔

"کوزہ گرد و پہن بر مثال کشت از چوب و سفال وجز آں کہ زیر بغل آب برند۔ اکثر

درویشاں و نباناں دارند"

وہ اس تشریح پر قناعت نہیں کرتے بلکہ آخر میں اضافہ کرتے ہیں کہ :۔

"اہل ہند آنرا کچکول گویند"

ہم جانتے ہیں کہ کچکول فارسی لفظ ہے۔ وہ فارسی میں جب بھی مستعمل تھا۔ اور اب بھی۔ لیکن چونکہ کچکول ان کے زمانہ میں اُردو بولنے والے کثرت سے استعمال کرتے تھے اس لئے انہوں نے اس کو اُردو کا لفظ مان لیا ۔

یہی مصنف "بارگیر" کے معنے بیان کرتے وقت کہتے ہیں :۔

"در قنیۃ الطالبین بمعنے ہودج است کہ آنرا عماری نیز گویند و ہند امباری"

عماری عربی لفظ ہے۔ جاہلوں نے بگاڑ کر اس کا امباڑی بنا لیا۔ اُردو میں آج بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے ۔

ایک اور لفظ "قلاب" کی شرح میں تحریر کرتے ہیں :۔

"کنیزک۔ ہندش بردہ گویند"

مصنف موصوف بددل کے معنے ہندی میں "کاہل" بتاتے ہیں۔ حالانکہ کاہل عربی میں سست کے معنے دیتا ہے لیکن اُردو میں وہ بزدل اور نامرد کے مفہوم میں آنے لگا اس کی تائید دکنی ادبیات سے ہوتی ہے جس میں کاہل فی الواقع بزدل کے معنے دیتا ہے چنانچہ محمد ابن دکنی :۔

توہم اک باگ کو مارین یو س مل   ہموں کو کیا نیں بوجھے ہو کاہل

صاحب موید الفضلا خیزران کے ذکر میں لکھتے ہیں :۔

"چوبے است، ہندش بیت گویند"

بیت درحقیقت فارسی بید کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس طرح پلید سے پلیت اور مدد سے مدت بنے ہیں علیٰ ہذا القیاس رو پاک ہے جسے اردو میں رومال کہتے ہیں۔ اس لفظ کی ترکیب فاؤسی ہے

مگر ایرانی اسے تسلیم نہیں کرتے۔ یہی حالت لنگی کی ہے ۔

اب جس زبان میں انگشتوانہ کو انگشتانہ۔ کاس کو کچکول۔ عماری کو انباڑی۔ روپاک کو رومال۔ کنیز کو بردہ۔ خیزران کو بیت۔ پلید کو پلیت۔ مدد کو مدت۔ اور لنگ کو لنگی کہا جاتا ہے۔ اُردو کے سوا وہ کوئی اور زبان نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ہمیں یقین کر لینا چاہیئے کہ اُردو ان ایام میں موجود تھی۔ اور ہندوستان کے ہر صوبہ میں جہاں جہاں مسلمانی اثرات تھے بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اور تغلقوں کے دَور سے پیشتر ہی مکمل ہو کر ایک حالت پر قائم ہوگئی تھی۔ سیدوں اور پٹھانوں کے دَور میں جب دیسی زبانوں میں شاعری کا چرچا ہوا۔ اُردو میں بھی گجرات و دکن میں شاعری شروع ہوگئی۔ ان ایام میں جو اس زبان کی ترقی کی رفتار دیکھی جاتی ہے۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ اگر مغلوں کا حملہ ہندوستان میں خلل انداز نہ ہوتا تو اُردو بہت جلد سرکاری اور درباری زبان بنجاتی اور اس میں تصنیفات و تالیفات کا سلسلہ جیسا کہ دکن و گجرات میں دیکھا جاتا ہے شروع ہو جاتا لیکن مغلوں کی آمد نے اس زبان کی بڑھتی امیدوں کو دو ڈھائی صدی کے لئے ملتوی کر دیا۔ ایرانی عنصر جو امرا اور عمال کی صورت میں پھیل گیا۔ اس نے ایک مرتبہ اور فارسی کے ٹمٹماتے چراغ کی بتی اکسا دی اور تیل ڈال دیا۔ اور ملک میں ایک مرتبہ اور فارسی کا دَور دَورہ ہوگیا ۔

میں یہاں مذکورۂ بالا لغات سے ان ہندی الفاظ کے نمونے سپردِ قلم کرتا ہوں لیکن یہ یاد رہے کہ مَیں نے ان کتابوں کو شرف نامۂ احمد منیری کے سوا بچشم خود نہیں دیکھا ہے۔ کیونکہ یہ تمام کتابیں قلمی اور نایاب ہیں۔ اور اسلاف کے ذہنی و عملی کارناموں سے ہماری بے خبری ایک ایسا پردرد افسانہ ہے۔ جس کے دوہرانے کی مجھ کو یہاں فرصت نہیں۔ ملک میں ایک بھی کام کا کتب خانہ نہیں۔ ہمارے محترم معاصر جب کہ لاکھوں روپیہ انگریزی کتبخانوں کے بنانے میں صرف کر دیتے ہیں۔ مشرقی کتابوں

اَور مشرقی کتب خانوں کے لئے ایک پیسہ خرچ کرنے کے لئے طیار نہیں جن بزرگوں کے ہاں بدبختی سے یہ کتابیں مقید ہو گئی ہَیں وہ زر وزاری کی پروا نہیں کرتے۔ اَور اُن کے دکھانے تک کے روادار نہیں۔ نہ خود ان سے فائدہ اٹھانے کے اہل ہَیں اَور نہ دوسروں کو ان سے افادہ کا موقع دیتے ہیں سمجھتے ہیں ہمارے بزرگوں کی یادگار ہَیں لیکن جس مجرمانہ غفلت سے بزرگوں کی یہ یادگاریں رکھی جاتی ہَیں۔ ناگفتہ بہ ہے دیمک اور چوہے ان کو چاٹتے ہَیں۔ اور جب وہ چیزیں دنیا کے کسی مصرف کی نہیں رہتیں۔ کنوؤں میں پھینک دی جاتی ہیں۔ دریاؤں میں بہا دی جاتی ہَیں۔ یا نذر آتش کی جاتی ہَیں۔ اور یہ آخری حشر ہوتا ہے ان بزرگوں کی یادگاروں کا۔ خدا رحم کرے ہماری اس جہالت پر جس کی طفیل ہزاروں نسخے سالانہ برباد ہو رہے ہَیں ٭

اگرچہ اصل لغات میری نظر سے نہیں گذرے ہَیں لیکن کتاب مؤید الفضلا ۹۲۵ھ جس کو نولکشور نے چھاپ دیا ہے۔ میرے زیر نظر ہے۔ اسی کی سند پر مَیں نے فرہنگ نامۂ قواس کے بعض الفاظ گذشتہ سطور میں نقل کئے ہیں۔ اور اسی کی سند پر ادات الفضلا۔ زفان گویا اور قنیۃ الطالبین سے استفادہ کیا ہے۔ شرف نامۂ احمد منیری اور ریاض الادویہ سے براہ راست استفادہ کیا ہے۔ لیکن مجھ کو شبہ ہے کہ مؤید الفضلا میں کسی غیر مصنف نے ہندی الفاظ کی قدیم شکلوں کو بدل کر موجودہ یا اس کی قریب شکلوں میں لکھ دیا ہے۔ مثلاً۔ گھرگت کا گرگٹ یا گکھری کا گگڑی بنا دیا ہے ٭

ادات الفضلا از قاضی بدر الدین دہلوی تالیف ۸۲۲ھ

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
اسکوب	چھت	آفتاب پرست	گھرگت	اولنج	لہسورہ
آزخ	ماسہ	ابذ	بھال	آونگ	ملگنی

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
ادات	مور	نابول	تنبول	تخم کتاں	السی
تلی	بھاندی	دراے	گھنٹی	•	•

زفان گویا از مصنفات ملا رشید (پدر ابراہیم) برادر جد جامع شرف نامۂ منیری ✤

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
آہن ربا	کانک	ارنب	برہبن	اظفار الطیب	جٹھیہ کھر
اسرب	سیسا	آبرود	بالچھڑ	آس	مورلر
استرش	پھال	تختۂ استرش	ہل	یادبر	پھرکی
بوق	بھیر	بادرو	ہری	پیازک	لوند
پرنگ	پتیل	پالادان	ہانکہ	پنجپایہ	کیکرہ
جوزبوا	چاہپسل	جوبلیں	اونتی	چغندر	دیدس
چارمغز	اکروٹ	چکاچک	چکر	حرزون	ستکہ
خیارچنبر	باندرپوری	خرچکوک	بھنپل و کچری	درخت سفتہ	بھنور

قنیۃ الطالبین قاضی شہ ابن باب

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
آسیب	دہکھہ	اسفاناخ	پالک	الہد	ہندی
انتحار	ساجی و کھار	انبیر	سنداسی	ابہل	ہوبیر کنکول مرچ
ام غیلاں	جوانسہ	ابہفان	ترمرا	آذرگوں	سورج مکھی
اوبیش	سانتھ	بجدب	پلیٹھیا۔ کھندہ	بنج	بیلخ دہاتورہ
بونیمار	بگ و بگلا	بیدانجیر	ارندہ	بادرنگ	بادبھرنگ

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
باطن	سہجنہ	بلطان	چولائی	پلپل	پپلی و مرچ
پوپل	سپاری	پابدام	پاسی	پرازوہ	بیڑا
تغارہ	کھترہ	تختۂ گوی	لٹو۔بھونیرا (بھونرا)	شجیب کافور	کاکڑا سینگی
جمرج	جاکلہ	جبود	تاڑ	جامۂ غوک	کائی
جعدہ	بھنگرہ	جبہ	جوگ درپ	جنبیہ	کتاری
چشپیرہ	چینچنہ	خلۂ چوب	کروال	خراد	کویل
خر	گدھا	خزیر	بھوبھل	خرف	نکھہ۔نکھوتری
خریق	سرسوں	خار مغیلاں	ککر	دلھل	ہلہلہ
دوامہ	لٹو۔بھورہ	دبہ	کوپا	•	•

شرف نامۂ احمد منیری ۸۶۲ھ و ۸۷۹ھ از ابراہیم قوام فاروقی

یہ کتاب غنیۃ الطالبین مذکورۂ صدر سے اقدم ہے۔ اس کے مؤلف مولانا ابراہیم فاروقی بنگالہ کے رہنے والے ہیں۔ اس فرہنگ کی تالیف میں انہوں نے زفان گویا۔ ادات الفضلا۔ فوائد الفضلا۔ اصطلاحات شعر۔ لسان الشعرا۔ لغت فرس اسدی۔ مواثد الفواد۔ صحاح۔ تابع الاسامی۔ بتیان عجائب البر والبحر۔ عجائب البلدان۔ تاریخ طبری۔ تحفۃ العراقین۔ رسالۂ النصیر۔ برمک نامہ۔ روضۃ الانوار۔ نفحۃ الریحان۔ فاتحۃ القلوب۔ دیوان الادب۔ اجمال حسینی۔ وغیرہ سے امداد لی ہے۔ اس کے علاوہ زندہ لوگوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ مثلاً امیر زین الدین ہروی المخاطب بہ فتح خاں جو اس عہد میں ملک الشعرائے بنگالہ تھے۔ اور محمد شیرازی اور شیخ واحدی وغیرہ *

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
آسا	جنبھوائی	آہن ربا	چوبک	الوا	کھوکنوا
آسیب	دہکہ	آفتاب پرست	گھراگیت	آہن جفت	بھالہ
اردی بہشت	چیت	اولنج	لسورہ	آزرخ	مسّا
اسپناخ	پالک	انگزدانگوزہ	ہینگ	اشترخوار	جواسہ
آکار (باغبان)	کویری	آہک	چونہ	استرنگ	لکھمنان
آونگ	ملکتی	ارزن	چینہ	آلستہ	موتہہ
بنارنج	سوکن	بادبرہ بادفرہ	لٹوہ	بلادر	بھلاوہ
بندش	گگالہ	بنوماش	منگ	بناغ	ککری
برزکسا (چیتان)	بھیلی	بساک	سہرہ (سہرا)	پورک	کھنکھندی
بھرک	کرہ (گرہ)	بشنگ	نہالی	بان	سہجنہ
تکران	کلرچینی (کھرچیا)	پاخہ	بھجوا (بچھوا)	پتنک	گھن
پنج پایک	کیکرہ	پزگان	نہال	پاتلہ	کراہی
پلہ	پلاس	پیچہ (املاب وعشقہ)	اکاس بیل	تختہ بند	پتی
ترزک	حمولا	تورک	لولی	تسمہ	پاتی
تنشی	ساہی	جامۂ غوک	سوال	جوال	لون (گون؟)
جالی	پیلو	چغندر	گانگلو	چارمغز	اکھروٹ
جلانک	کیبردرہ	چوملین	اونی	چتربہ	بلائی
جغانہ	سرمندلی	چوبہ	بیلن	خاکستر	راکھ
خشکامار	جلندھر	خربوزہ : سوآ	گادر	خزدوک	کیبردرہ
خیک	پکھال	خردزہ	رائی	خفتان	آنکھ (انگا)

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
خرزہرہ	کنتر	خرفہ	لونک	خرہ	کھل
دردک	گرہی (گرہ)	دولنگ	دساہل	درخت سفید	کھتورا
دغدغہ	کدکدی (گدگدی)	دیوچہ	جوک	درلے	گھانتی
روناس	مجیتھ	راسو	نیول	رشاشہ	پھوہوی
رقے	کھنکار	زرت	جوار	زرنباد	کچور
زغبیر	السی	زاک	پھٹکری (پھٹکری)	زغنک	ہچکی
زلہ	جھیکر	زوالہ	پیرہ	سرنج	کچھالہ
سنج	کچھالہ	سراغوچ	کونجی	سرند	سوال
سوسمار	گوہ	سلیک	گھُن	سنبل	چھر
سدان	نہالی	سارہ	رسوت	سفتہ	ہنڈی
شکرہ	کلوزن	سنقلی	کراہی	شب تاب	جگنی
شنبلیت	میتھی	شکنج	بکرھ	شود	شولی
شب بار	چواسہ	شنجار	ساجی	شنخک	ہچکی
شیردان	کھیری	شمہ	بلائی	طلق	ابہر
غلیج	کرکدی (گدگدی)	غسک	اودس	غنک	لاتھ
فلہ	پہوسی	قوئیج	باسور	قرامنر (قلانو)	چوکی
قرصک	برسولہ	کسیلا	کھیلا	کت	کھوت (کھاٹ)
کشک انجیر	گولہ	کنار	بیر	کشنیز	دھنہ
کاغ	جیکال	کاکل	بھانس	کان	کھان
کلتبین	سنداسی	کاژیرہ	کرلہ	کامہ (لیتھڑ)	سوالی

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
کلاده	انی	غلوله (حلوی)	لدوپندی	کلونه	کونجی
کلونده	گگری	کمان گرهه	غلول (غلیل)	گوره	بھنی
کوفته	پلهری	کاسنی	کہنی	گولانج (حلوی)	لاپر
گذر	گاجر	گز	جھاؤ	گوشخارک	کنالی
گردون	گدی	گبره	جکری	لهفت	گڈی
لوس	جھله	مشکین وفادار (پھول)	جولی (جوئی)	موز	کیله
مقناطیس	چومک	مندل	منڈله	مولو	سنگی
ماہچه	سولی	وشم	بهاپه	یاقوت سرخ	پدم

موید الفضلا ۹۲۵ھ

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
آفتاب پرست	کنول	آہن جفت	پھال	گوشت تیخ دہیہ	بجوریکا گوہ
آسرنج	سندور	ابجوج	اگر	انگزوانگوزه	ہینگ
اذان الفار	موساکنی	آبخور	گھات	آبار	سیسه
اسفر	ساہی	آہار	ماندی۔کلپ کھرپا	استنزار	مسور
اسپرمور	مورموہں	اسپرکاه	کاندل	اوبر	چینه
ارز	چانول	ابن عرس	نیول	اصل السوس	ملٹہی
اخیتوس	سالک	الماس	ہیرا	اشراش	سریش
الخموط	سناول	الوا	کنوار	آزاد درخت	بکاین
اسرنج	سندور	اولنج	لبسوره	ازخ	ماسه
آزاد	نم (نیم)	اجمود	کھوراجوائن	اسطوخودوس	دلہتوره

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
اشترخوار	جانواسہ	آشترنگ	لکھمنان	آونگ	ملکنی۔ الگنی
اسفیل	کندا	اساردن	ہیند مکر	اشلان	مورسوکھا
اشنہ	چلوہ	اجمودہ	جواین	آسمانہ	چھتہ
املہ	آنولہ	اہیانہ	تالو	افچہ	دہوکہ
ایلدانہ	ایلاچی۔ الاچی	اسرع	ہیرادوکھی۔ رنگپات	افرع	گنجہ
انابغ	سوکن	آک	آک۔ مدار	اکلیل الملک	اپیرک۔ گھموی
انک	سکاوسیسہ	اراک	پیلو	انارمشک	ناکیسر
انجزک	مروا	انجکک	کھیلا	اریان	جھینگہ۔ (مچھلی)
اشنان	چوکہ	انمیو	چھوہارا	انگورسیاہ	کالی داکھ
اشنوشیہ	چھینک	الوسیہ	جامن	السنتہ	موتھہ
آہنجہ	ہاتھ	انجزہ	انگن کے بیج	یارنب	سویا
بایونج	ایرم سار یسوتھل	بازیچ	پیبنگہہ	سنجار	بھاپ
بازیار	کسان	بلادر	بھلانواں	بزیار	جاوتری
بندش	گالہ	بنوماش	مونگ	بسباک	سہرہ
بکوک	چھجہ	بیانک	گوند	بشنگ	نہائی
بادرنگ	رام تلسی	بدول	کاہل	برہبین	لونیا کا ساگ
بکھان	کانتھی	بیخ سوس	ملٹھی۔ جیٹھی	بروزن	بازرہ
بافلہ	باکلا	ہاہیلہ	بہیڑہ	بوبیہ	دوناھروا
بوی	گندہ	بھارنگی	سوندہاکھر	پتنک	گھن
پاتلہ	کراہی	پاخرہ	اونبہ	پشہ خانہ	کھٹ چھپر۔ مسہری

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
تنگار	سہاگہ	تنبر	کری	نزنزک	ممولا
ترہ تیزک	بالم، چندسور	توزک	لوبیا	نقویم	پنرہ
تسمہ	پاتی	تانکی	دھنیہ	ثفار	رائی
جدحد	جھینگر	جنبیہ	جمدھر	چوخا	کنتھا
چقندر	گنگلو				

ریاض الادویہ ۹۴۶ھ از حکیم یوسفی۔

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
ابل	اونٹھ	شغال	سیال	راسو	نول
سرب	سکہ	اترج	بجورہ	سرگین گاو	گوبر
اوخر	گندپھل	نسیج العنکبوت	مکڑی کا جالہ	برنج	چاول
خرگوش	کرمہ	آزاد درخت	درخت نیم	اسفاناخ	پالک
آس	موریول	آنک	چھیلرہ	اظفار الطیب	نکھ
اشنان	لانی	انبج	آنولہ	انبہ	انب
بذر کرفش	اجمود	بذر الفرنج	اونبہ کا بیج	بذر الجزر	گاجر کا بیج
بذر البنج	خراسانی اجوائن	بذر الفجل	مولی کا بیج	بذر الکتان	السی کا بیج
بذر القشد	کھیرہ کا بیج	تخم خیار	ککڑی کا بیج	بذر الریحان	تلسی کا بیج
بذر الشبت	سوئے کے بیج	بسد	مونگا	بستان افروز	کلکا
بسیاسہ	جیوتری	ہندبانہ	کاسندہ	ہلیلج	بہیرہ
بلادر	بھلاوہ	بندق	ریٹھہ	بیض	آنڈہ
تربد	نسوت	تمر ہندی	آملی	توتیائے ہندی	تاریا تھوتھہ

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
پستان	چوچک	ثوم	لسن	جاورس	کنگنی
جدوار	نربسی	ملخ	تدی	جذر	گاجر
جزمانج	مائیں	جوزبوا	جیفل	جوز الماثل	دہتورا
جوز القی	بن پھل	حب النیل	عشق پیچاں کا بیج سمندر سوک	حب القطن	بنولہ
حب الملوک	جمال گوٹہ	خار خسک	گوکھرو	حضض	بنکرہ
حلبہ	میتھی	انگوزہ	ہینگ	نخود	چنہ
حمام (کبوتر)	پریوہ	تمار	گدھہ	حنظل	تمان
حنا	مہدی	گندم	گیہوں	خبازی	سونچل کا بیج
خیزر	روتی	خروع	آرند	خراطین	کیچوہ
خفاش	چمگودڑی	خیار	کھیرہ	خیارزہ	کھکھری
دارچینی	شنج	دالیاں	کوکری	دقاں	دہوآں
خون	لوہو	روغن کنجد	میٹھا تیل	مگس	ماکھی
طلا	سونہ	بادیان	سونف	راتینج	رال
مسکہ	ناہوں	زرنیخ	ہرتال	زرنب	سینتی
زعفران	کیسر	زنجبیل	سونٹھ	سیماب	پارہ
سانج	پنزج	ساج	سال	سپستان	لسورہ
کوکنار	بیر	سرطان	کیکڑہ	سعد	موتھ
سنخ الحیہ	کانچلی	سنگ پشت	پچھوہ	ماہی	مچھری
سنبل الطیب	چھر	گربہ	بلائی	موی	بال
شونیز	کلونجی	صدف	سیپ	صمغ	گوند

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
صندل ابیض	اوجلا چندن	صندل احمر	رکت چندن	پسخول	سپیہ
غوک	میدکی	طاؤس	مور	طباشیر	بنسلوچن
سپرز	تلی	سم بز	بھیدی بکری کھر	عدس	مسور
کنجشک	چڑیہ	عظم	ہاڈ	عفص (ماذو)	ماجوپھل
عقرب	بچھو۔ الخوبہ	عنب الثعلب	مکو	عود	اگر
غزال	ہرن	فاختہ	فندکی	موش	چوہیہ (چوہا)
ترب	مولی	فضہ	روپا	تخم کرفس	اجمود
فلفل اسود	مرچ	فوفل	سپاری	فوہ	مجیٹھہ
فیل	ہاتھی	قاقلہ	الاچی	قرنفل	لونگ
قسط	کتھہ	نیشکر	گنہ	قصب	بانس
قطن	روئیں	زاک زرد	کاہی	قلط	کلتہ۔ موٹھ
اشخار	ساجی	خارپشت	جنگلی چوہا	کبریت	گندہک
جگر	کلیجہ	کرفس	اجمود۔ کلادہ	کراث	گندنہ
کرکی	کونج	کرکدہ	گینڈہ	کرش	اوجری
کشنیز	دہنیا	کلیہ (گردہ)	بوکر	کہربا	کپور
شیر	دودھ	گوشت	ماہیرہ	قوچ	مینڈھہ
مروارید	موتی	الماس	ہیرہ	آب	پانی
مرزنجوش	مروہ	زہرہ	پت	سنبل ازرق	کوکل
نمک	لون	موز	کیلہ	جوز ہندی	ناریل جیبھری
نخالہ	بھوس۔ بورا	نمل	چینٹی۔ چیونٹی	نیلوفر	کول پھول
		ورد	پھول		

پنجاب میں اُردو

پنجاب میں اُردو" اُردو زبان کی تاریخ میں ایک نیا باب ہے، جس کا اب تک کسی نے مطالعہ نہیں کیا ہے۔ خود اہل پنجاب بھی عموماً اس سے بے خبر ہیں۔ اور اسی ناواقفیت کی بنا پر تی زمانا پنجاب میں یہ عقیدہ لوگوں کے دلوں میں قبولیت حاصل کر رہا ہے کہ پنجاب پر اُردو کا کوئی حق نہیں ہے۔ سکھ گردی کے بعد جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا دَور آیا۔ کمپنی کے انگریزی اَور ہندوستانی عہدہ داروں نے اس اجنبی زبان کو مدارس و دفاتر میں داخل کر کے رواج دیدیا۔ یہ رائے ان نوجوانوں کی ہے جن میں اور اَوصاف کے علاوہ وطن پرستی کے جذبات بیدار ہیں۔ یہ خیال کس حد تک غلط ہے! اوراق آیندہ کے مطالعے سے کافی واضح ہو جائیگا۔

حقیقت یہ ہے کہ اُردو جس طرح ہندوستان کے اَور صوبوں میں اسی طرح پنجاب میں برابر بولی اور سمجھی جاتی رہی ہے۔ پنجاب سلطنت اسلامی کا ایک جزو تھا۔ اور سلطنت کا صوبہ ہونے کی حیثیت سے اُردو کو یہاں اسی قدر دخل حاصل تھا۔ جیسا سلطنت کے اَور صوبوں میں۔ قدیم زمانہ سے یہ زبان اس صوبہ میں کم و بیش رائج رہی ہے۔

اُردو کیلئے اہل پنجاب کی طبعی مناسبت اَور قدیم اُردو پر پنجاب کا اثر دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اُردو پنجاب کے کسی خطہ یا ضلع کی زبان تھی۔ اس سوال کا کوئی قطعی جواب ہمارے پاس موجود نہیں۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ پنجابی اور اُردو میں ہندوستان کی دیگر زبانوں کے مقابلہ میں قریب ترین مماثلت موجود ہے۔ اُن کی صرف و نحو اہم قواعد و مسائل میں باہم مطابق ہے! اور ساٹھ فی صدی سے

زیادہ الفاظ اُن میں مشترک ہیں۔ مزید برآں جن امور میں یہ زبانیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان میں ہمیں اضافت کو بھی محسوب کرنا چاہئے۔ مثلاً اردو کی اضافت "کا۔ کے اور کی" کے بجائے پنجابی میں "دا۔ دے اور دی" آتا ہے اگرچہ تصریف میں دونوں زبانیں متفق ہیں۔ گویا کاف اردو کے ساتھ اور دال پنجابی کے ساتھ مخصوص ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو کی اضافت ایک زمانہ میں پنجاب میں رائج تھی اس کے ثبوت میں اگرچہ ہمارے پاس کوئی قدیم دستاویز موجود نہیں لیکن جب ہم پنجاب کے دیہات وقصبات پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بیسیوں موضعوں اور قصبوں کے نام کے ساتھ وہ جزو کلمہ بن رہی ہے مثلاً ڈسکا، فاضلکا امروکا، ٹھڈر کا، پٹھنکا، ویرکا۔ جاکے، جنڈوکے، خانکے، کالے کے، کاموکے، سجن کے، ابھوکے، باچھی کے، منجوکے، مریدکے، ساد سوکے، دھرکے، پیچو کی ملیاں، مُدو کی، اورکی، پتوکی، نارکی، خان کی، جھام کی، کیمو کی، رحیم کی چوہڑی وغیرہ وغیرہ اس قسم کے نام پنجاب میں کثرت کے ساتھ ملتے ہیں۔ یہ امر ظاہر ہے کہ جس تیزی سے زبان بدلتی ہے۔ اس تیزی کے ساتھ ملک کے جغرافیائی نام نہیں بدلا کرتے اس لئے ان مقامات کے ساتھ اردو کی اضافت کا موجود ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ اضافات پنجاب میں قدیم الایام سے ہیں اور ایک وقت استعمال میں آ رہی تھیں۔ لیکن جب موجودہ پنجابی کی لہر آ کر ملک پر چھا گئی۔ پرانی زبان کا شیرازہ بکھر گیا۔ یہ بھی یاد رہے کہ یہ اضافات نہ صرف جغرافیائی اسماء میں ملتی ہیں بلکہ اور الفاظ میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً پیکا = باپ کا گھر، اس کا مرادف پیکا نہیں لیکن پیہر ابھی تک بھی اردو میں مستعمل ہے۔ نانکا = ننھیال، دادکا = ددھیال۔ ان کی تصریف بھی ہوتی ہے یعنی پیکے، نانکے، دادکے۔

ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم اردو زیادہ پنجابی اثرات سے ہے یعنی آج جن

باتوں کی تشریح سے اُردو عاجز ہے۔ پنجابی زبان آسانی کیساتھ انکی تشریح کرسکتی ہے
اس قسم کی متعدد مثالیں گذشتہ اوراق میں دی جا چکی ہیں یہاں ایک اور مثال
دیتا ہوں :-

رسالۂ معراج العاشقین مولانا عبدالحق صاحب بی ۔ اے، آنریری سیکرٹری انجمن
ترقی اُردو نے تاج اُردوی قدیم میں شائع کیا ہے۔ یہ رسالہ حضرت صدرالدین سید
محمد حسینی گیسو دراز بندہ نواز متوفی ۸۲۵ھ کی طرف منسوب ہے۔ اور اُردو کا غالباً
قدیم ترین نمونہ ہے۔ اس رسالہ میں ایک فقرہ آتا ہے :-

"دوسرا تن ممکن الوجود۔ اس کا نگہبان اسرافیلؑ۔ نفس لوامہ، حواس خمسہ ممکن
کی آنک سوں غیر نہ دیکھنا سو۔ غفلت کے کان سوں غیر نہ سننا سو۔ وسواس
کے نک سوں بد بوئی نہ لینا سو۔ بخلی کی زبان سوں غیر نہ بولنا سو۔ مغروری کی
شہوت کوں غیر جاگا نہ دوڑانا سو۔ غفلت ہور غضب ان پانچہ خواص کا مراقبہ
کرنا۔ پیر کے ممکن کا مشاہدہ قائم کرنا۔ ذکر قلبی کر شریعت کے کا قسے میں پیلایا"

اس فقرہ میں مصادر کے آخر میں سو کا استعمال نہایت عجیب ہے اور اُردو زبان
اس کی تشریح سے قاصر ہے۔ اب اسی "سو" کا استعمال پنجابی میں آج بھی موجود ہے
جو ضمیر غائب کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ مثلاً "جانا سو" = اسے جانا (ہے)۔ "کیتو سو" =
اُس نے کیا (ہے)۔ یہی مفہوم مذکورۂ بالا فقرہ میں ہے۔ ان امور سے ظاہر ہے کہ
پنجابی اور اُردو کے تعلقات ایک دوسرے کے ساتھ بہت گہرے ہیں :-

شمالی ہندوستان میں جس میں دہلی بھی شامل ہے۔ اُردو کی قلمی یادگاریں
گیارہویں صدی ہجری سے زیادہ قدیم نہیں ملتیں۔ اور تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ
پنجاب میں بھی اسی صدی سے تالیفات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پنجاب میں مولانا
عبدی کی تصنیف رسالۂ نقہ ہندی سب سے قدیم ہے جو ۱۰۴۰ھ میں بعہد اورنگ زیب

عالمگیر دیکھا جاتا ہے عہدی کی تحریک ہمارا خیال ہے برابر جاری رہی تھی۔ لیکن
محمد شاہی دَور تک کسی اور تالیف کا سُراغ نہیں چلتا۔ ان ایام میں قصبۂ بٹالہ میں
شیخ محمد فاضل الدین کے ہاتھوں اس تحریک کو بہت تقویت ملتی تھی۔ ان کے
فرزند غلام قادر مثنوی رمز العشق کے مصنف ہیں۔ صُوفی حلقوں میں یہ مثنوی بہت
مقبول رہی تھی۔ نہ صرف اس کی شرح لکھی گئی ہے بلکہ اس کی تقلید میں فقیر اللہ
مثنوی درمکنون سنہ ۱۱۲۰ھ میں لکھتے ہیں۔ اور میاں نور محمد المعروف بہ میاں جھبیل ولد
میاں ہلتھو مثنوی فتح الرمز سنہ ۱۱۲۵ھ میں تصنیف کرتے ہیں۔

ریختہ کی طرز کی نظموں میں سب سے قدیم ریختہ شیخ فریدالدین گنج شکر متوفی ۶۶۴ھ
کی طرف منسوب ہے۔ علاوہ بریں ان کے بعض اُردو فقرے بھی ملتے ہیں۔ ان کے بعد
شیخ عثمان اور شیخ جنید اور منشی ولی رام کے ریختوں کی باری آتی ہے جو گیارہویں
صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں۔ بارھویں صدی ہجری کی متفرق نظموں میں زیادہ
تر صوفیانہ نظمیں داخل ہیں۔ جن میں سے اکثر حضرت غوث الاعظم کی شان میں ہیں
ایسی نظمیں چونکہ کثیر تعداد میں ملتی ہیں۔ اس لیئے میں نے صرف چند انتخاب کرلی ہیں
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو زبان زیادہ تر خانقاہ نشینوں کی گود میں پلی ہے۔
وجہ ظاہر ہے کہ ان بزرگوں کا تعلق زیادہ تر عوام الناس سے تھا۔ دیسی و پردیسی
اُن سے فیض کے طالب تھے۔ لوگ دُور دُور سے اپنی مرادیں لیکر ان کے پاس جاتے
تھے اس لیئے ملکی زبان کا جاننا اُس میں بات چیت کرنا اُن کے لیئے ضروری تھا۔
دوسرے صوفی پیشہ لوگ اکثر سیّاح اور جہانگرد ہوا کرتے ہیں۔ اور اردو ان ایام
میں ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں بولی جاتی تھی۔ اس لیئے سیاحوں، صوفیوں
اور سپاہیوں کے لیئے اس زبان کا جاننا ازبس ضروری تھا +

دیکھا جاتا ہے کہ یہ نظمیں اکثر اوقات الم خیز اور فریادمندانہ ہیں اور مصرع

۶ سنو پکار دکھی کی ایا شہ جیلاں

کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ ان زمانوں کے سیاسی انقلابات میں مضمر ہے جو پنجاب میں رُونما ہو رہے تھے۔ ان کے اوزان بسا اوقات ہندی ہیں۔ یا ایسے ہیں جو قدیم سے ہندی خوانوں نے فارسی سے لے لئے ہیں۔ قافیہ اُن میں چنداں ضروری نہیں ہے۔ اور مُربع و مخمس کی تشکل میں ہیں۔

تغزل، دہلی مرکز کے قیام کے بعد پنجاب میں دیر سے پہنچتا ہے جس کے اثر میں فارسی بحور و جذبات پنجاب کی نظموں میں رُوشناس ہوتے ہیں۔ اگرچہ ایہام گوئی جس پر دہلی کی ابتدائی شاعری کا دار و مدار تھا۔ یہاں کبھی کامیاب نہیں ہوئی۔ پنجاب نے اپنے ادبی تعلقات دہلی و دکن سے سیاسی مصائب کے باوجود برقرار قائم رکھے ہیں۔ سید بلاقی، ولی اورنگ آبادی، سراج دکنی، شاہ آبرو، فغان، اشرف وغیرہ سے یہاں کے باشندے نہ صرف واقف ہیں بلکہ انہیں اسی شوق و ذوق کے ساتھ پڑھتے ہیں جس طرح نظامی، سعدی اور حافظ کو پڑھتے ہیں۔ اس عہد کی بیاضیں ان شعرا کے کلام سے پُر ہیں۔ سید بلاقی کا مولودنبی بیحد مقبول تھا۔ اس کے کئی نسخے میری نظر سے گذرے ہیں۔ محمد افضل کا بارہ ماسہ کمال شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ اور ولی کا کلام بڑے اشتیاق کے ساتھ لوگ پڑھتے تھے۔

۱۱۸۹ھ میں رنجیت سنگھ کا دادا چڑت سنگھ بسنتی ندی کی جنگ میں اپنی بندوق کے پھٹنے سے مارا جاتا ہے۔ اور ہمیں سخت تعجب ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ نامدار خاں دت اس کا مرثیہ اردو زبان میں لکھتا ہے۔ سکھوں کی تاریخ میں اُردو صرف اسی موقعہ پر نمودار نہیں ہوتی بلکہ اس تاریخ سے دس سال بعد جب جے سنگھ (کنیہ مثل) کا اکلوتا فرزند گوربخش سنگھ عین میدان جنگ میں گولی کے زخم سے ہلاک ہوتا ہے (اس کی بیوی سدا کور نے اپنی بیٹی بعد میں رنجیت سنگھ کو بیاہ دی)

ہم دیکھتے ہیں کہ محمد غوث بٹالوی گوربخش سنگھ کا مرثیہ اُردو میں لکھتا ہے ٭

پنجابی شاعروں اور ناظموں کے متعلق جو اطلاع آئندہ اوراق میں درج ہے زیادہ تر عام شائقین کی بیانوں سے حاصل کی گئی ہے۔ اس لئے یہ اطلاع مختصراً ناکافی اور غیر متعین ہے۔ ان کے زمانوں کے متعلق بھی ضرورتاً قیاس و احتمال سے کام لیا گیا ہے ان کے تقدم و تاخر کی بابت بھی نکتہ چینی کی گنجایش ہے۔ اور یہ خامیاں اس لئے ہیں کہ اس خاص مضمون پر اطلاع حاصل کرنے کا بظاہر کوئی ذریعہ نہیں معلوم ہوتا۔ پنجاب میں بدقسمتی سے اس وقت کوئی جامع کتب خانہ موجود نہیں ہے اور نہ اب تک اہل پنجاب کو مشرقی کتب خانہ بنانے کا احساس ہوا ہے ٭

آخر میں چند کلمات ان بزرگوں کی زباندانی کے متعلق بھی کہنے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کے کلام کو جانچتے وقت ہمیں اپنے زمانہ کے معیار تنقید سے کام نہیں لینا چاہیئے اور یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ لوگ پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں جہاں اُردو مادری زبان نہیں ہے اور ایسے ڈیڑھ دو سو سال پہلے خود اُردو کا معیار مختلف تھا۔ میں مانتا ہوں کہ ان کے خیالات بلند نہیں ہیں اور نہ زبان بامحاورہ ہے۔ اور اکثر حالات میں پنجابی لہجہ غالب ہے۔ تاہم ان کے مطالعہ سے ہمارا مقصد شاعری سیکھنا نہیں ہے بلکہ صوبۂ پنجاب میں اردو کی نشو و نما اور اس کی ترقی کا مطالعہ کرنا۔ خود اُردو کے قدیم اساتذہ میں آج جو ہم دلچسپی لیتے ہیں وہ محض علمی اور تاریخی نقطۂ نظر سے ہے۔ ان بزرگوں کے واسطے بھی ہمارا نقطۂ نظر یہی ہونا چاہیئے۔ اس تمہید کے بعد پنجاب میں اُردو کا تبصرہ شروع کیا جاتا ہے ٭

شیخ فریدالدین گنج شکر متوفی ۶۶۴ھ

ساتویں صدی ہجری میں شیخ فریدالدین مسعود ایک عجیب و غریب ہستی ہیں۔ ملتان کے قصبۂ کھوتوال میں پیدا ہوئے اور ملتان میں تعلیم پاتے رہے۔ ممالک اسلامیہ میں سیاحت بھی کرتے ہیں مشہور صوفیوں سے ملاقات کرتے ہیں! اور دہلی جا کر قطب الدین بختیار کاکی اوشی کے مرید ہو کر پاک پٹن میں سکونت اختیار کر لیتے ہیں اور ۶۶۴ھ میں اسی مقام پر وفات پاتے ہیں۔ شیخ فارسی و پنجابی کے شاعر ہیں اور کچھ حصہ اُن کے کلام کا اب تک محفوظ ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اُردو بھی بولتے تھے۔ اس قسم کے ان کے کئی فقرے اُن کے سوانح نگاروں نے اتفاقیہ اپنی تصنیفات میں نقل کئے ہیں چنانچہ :۔

مولانا برہان الدین صوفی ابھی خورد سال ہی تھے کہ اُن کے والد شیخ جمال الدین ہانسوی مُرید شیخ فریدالدین کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی بیوی "مادرِ مومناں" شوہر کی وصیت کے مطابق اپنے فرزند خواجہ برہان الدین صوفی کو لے کر حضرت گنج شکر کی خدمت میں حاضر ہوئیں شیخ نے خواجہ برہان الدین کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اُن کی خورد سالی کا لحاظ نہ کر کے اپنی بیعت میں لے لیا۔ اس پر مادر مومناں معترض ہوئیں اور ہندی زبان میں بولیں :۔

"خوجا برہان الدین بالا ہے"

یعنی کم عمر ہیں۔ شیخ فریدالدین نے ہندوی زبان میں جواب دیتے ہوئے کہا :۔

"مادر مومناں! پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے"

یہ واقعہ میں نے سید محمد بن سید مبارک کرمانی متوفی ۷۷۰ھ کی تصنیف "سیر الاولیا"

سے نقل کیا ہے جس میں مذکورۂ بالا ہندی فقرات بلفظہ درج ہیں :-

ایک روز شیخ فریدالدین اپنے پیر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو وضو کرا رہے تھے۔ اتنے میں حضرت کی نگاہ اُن کے چہرہ پر پڑی۔ دیکھا کہ آنکھ پر پٹی بندھ رہی ہے آپ نے دریافت کیا۔ بابا آنکھ پر پٹی کیوں باندھ رکھی ہے بابا فرید نے ہندی زبان میں جواب دیا :-

"آنکھ آئی ہے"

شیخ نے جواب دیا :-

"اگر آئی ہے ایں را چرا بستہ آید" (جواہر فریدی ص ۲۰۵)

جن ایام میں بابا فرید گنجشکر سرسہ میں حضرت خواجہ عبدالشکور کے مزار پر آتے جاتے تھے۔ ایک دن سرسہ کے لوگ جنہیں یہ معلوم کرنیکا اشتیاق تھا کہ بابا مزار پر جا کر کیا کیا کرتے ہیں۔ اُن کے رستہ میں چھُپ کر بیٹھ گئے جب آپ کو معلوم ہوا ناراض ہوئے اور ہندی زبان میں فرمایا :-

"سرسہ سرسہ کبھی نرسہ" (جواہر فریدی ص ۲۷۵)

اِن فقرات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو زبان ساتویں صدی ہی میں اپنے امتیازی خط و خال نمایاں کر چکی ہے۔ یعنی اس میں وہ خصوصیات موجود ہیں جو اس کو ایک طرف برج سے اور دُوسری طرف پنجابی سے ممیز کرتی ہیں۔ "ہوتا ہے" نہ پنجابی ہے نہ برج اس سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ اہلِ پنجاب ان ایام میں اُردو بول اور سمجھ سکتے تھے۔

ذیل کی نظم بھی حضرت بابا فرید گنج شکر کی طرف منسوب ہے، جس کے لئے میں جناب سیّد نجیب اشرف صاحب ندوی اور سیّد عبدالحکیم صاحب ناظم کتب خانہ الاصلاح۔ دسنہ ضلع پٹنہ کا منّت پذیر ہوں۔ یہ نظم سیّد اشرف صاحب نے دسنہ لائبریری کے بعض

بوسیدہ اوراق قدیم سے حاصل کی ہے۔ جن پر حضرت بابا کے اقوال فارسی بھی درج تھے۔ اور ناظم صاحب نے ایک نقل نہایت مہربانی کر کے میرے پاس بھیج دی ہے۔

(وہو ہذا) ؎

وقت سحر وقت مناجات ہے — خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا — خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
بادم خود ہمدم ہشیار باش — صحبت اغیار بُوری (کذا برُی) بات ہے
باتن تنہا چہ روی زیں میں — نیک عمل کُن کہ وہی سات ہے
پند شکر گنج بدل جاں شنو — ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

پنجاب میں نظم سب سے پیشتر لکھی گئی ہے اور نثر نسبتاً کم ملتی ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ اس سلسلہ میں بہت کچھ ذخیرہ تھا لیکن موجودہ نسلوں کی عدم اعتنا سے اکثر حصّہ جو قلمی تھا برباد ہو گیا ہے۔ اور جو کچھ باقی ہے وہ بھی عنقریب برباد ہو جانیوالا ہے۔ مشرقیات سے اہل پنجاب کی عام بے پروائی نے ہمارے تلاش کے کام کو اور بھی مشکل بنا دیا ہے۔ پنجاب اگرچہ مسلمانوں کی اکثریت پر نازاں ہے لیکن یہاں کوئی ایسا کتب خانہ موجود نہیں ہے جو مسلمانی مخطوطات اور اُن کے ذہنی و دماغی کارناموں کا صحیح معنیٰ میں جامع ہو۔ ذیل میں جو مواد پیش کیا جاتا ہے۔ وہ اندکے از بسیار کا مصداق ہے۔
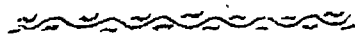
شیخ عثمان

پنجاب میں اُردو شاعری دکن سے بعد اور دہلی کے معاصر شروع ہو جاتی ہے ابتدائی نمونے بہت کم ملتے ہیں اور جس قدر ملتے ہیں۔ اُن میں تخلص موجود نہیں۔ قدیم نمونے زیادہ تر ریختہ کی شکل میں ہیں۔ اور ان میں فارسی بہت غالب ہے اور مقامی اثر بھی حاضر ہے ان نظموں کی بعض خصوصیات بھی ہیں۔ مثلاً اکثر مسمط طرز کی ہیں۔ قافیہ کی پابندی سے آزاد ہیں۔ اور ردیف پر قناعت کی گئی ہے۔ جیسا کہ میر جعفر زٹلی اور شیخ جیون کے کلام میں مشاہدہ ہو چکا ہے۔ یہ نظمیں ہندی اوزان میں بھی لکھی گئی ہیں اور فارسی اوزان میں بھی۔ الفاظ بعض اوقات پنجابی لہجہ میں تلفظ کیے گئے ہیں۔

ابتدائی نمونوں میں جو کم از کم گیارھویں صدی ہجری کی ابتدا سے تعلق رکھتے ہیں تمام غزل فارسی ہے صرف ردیف اردو ہے مثلاً ذیل کا ریختہ:-

عاشق دیوانہ ام آ ڈ پیارے حبیب — از ہمہ بیگانہ ام آ ڈ پیارے حبیب
اے نظرت آفتاب بر من مسکیں متاب — جان جگر شد کباب آ ڈ پیارے حبیب
اے دل و دیں جان من درد تو درمان من — ذکر تو سامان من آ ڈ پیارے حبیب
زاں لب شیریں شکر بار دو درد گہر — ساز مرا بہرہ ور آ ڈ پیارے حبیب
چند کشی کشتہ را عاشق آشفتہ را — بیدلم و بے نوا آ ڈ پیارے حبیب
وعدہ مہم انتظار یک نظرم وا گمار — عاشقم و خستہ وار آ ڈ پیارے حبیب
اے تو کس بیکساں مونس بیچارگاں — غمخور آوارگاں آ ڈ پیارے حبیب
حکم زا بندہ ام ز تو شرمندہ ام — زار و سر افگندہ ام آ ڈ پیارے حبیب

وقت شبا یم گذشت کار نیا مد ز دست   پشت زغمہا شکست آ ؤ پیا رے حبیب

دربدر و کو بکو نعرہ زناں سو بسو   دیدن تست آرزو آ ؤ پیا رے حبیب

روز و شبم انتظار دم بدمم بیقرار   دیدہ چو ابر بہار آ ؤ پیا رے حبیب

بدل عثمان غریب رحمت خود کن قریب   زانکہ تو ہستی مجیب آ ؤ پیا رے حبیب[1]

اس غزل میں ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو نے صرف انگلی پکڑی ہے آیندہ چل کر وہ پونچا بھی پکڑ لے گی۔ یہ ریختہ حضرت مجدد الف ثانی سرہندی علیہ الرحمۃ متوفی ۱۰۳۵ھ کے پیر بھائی حضرت شیخ عثمان جالندھری کی یادگار ہے۔ خزینۃ الاصفیا میں شیخ عثمان کا ضمناً ذکر آجاتا ہے لیکن اُن کا سنِ وفات نہیں ملا۔ اسی طرز کا ایک اَور ریختہ ہے جس کے مصنف کے حالات سے ہم واقف نہیں ہیں :۔

منم مشتاق دیدارت اری ٹک دو رکن گھونگٹ   بجان و دل خریدارت اری ٹک دو رکن گھونگٹ

نہ لیتی نیند مجھ آوے نہ تجھ بن بات مجھ بھاوے   ز فرداں رات دن جاوے اری ٹک دو رکن گھونگٹ

اگر تو یوسف ثانی وگر تو ماہ تابانی   اگر تو شاہ خوبانی اری ٹک دو رکن گھونگٹ

عجب رفتار تو داری عجب گفتار تو داری   چہ حسنت نادرے داری اری ٹک دو رکن گھونگٹ

---

[1] بوساطت مولانا عبد اللہ صاحب بانقابہ ۔
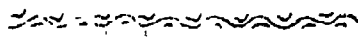
شیخ جنید

اسی قرن کے ایک اور بزرگ ہیں۔ ان کا اسم گرامی جنید ہے اور جماعت صوفیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے حالات زندگی نامعلوم ہیں۔ آیندہ نظم ان کی ہے:۔

دلا غافل چہ می خسپی کہ اپنی مچ تھیں ڈر ہیے ۔۔۔ جو روز مرگ در پیش است اتنی نیند کیوں کریے

چو دزد داند کمیں باشد کرے جو نینا ہنجارا ۔۔۔ نباشد سود یک چیتل گوائے مول بھی سارا

بدین دنیائے دہ روزی بڑائی کائی کیوں کریے ۔۔۔ اگر صد سال عمرت شد نہایت ایکدن مریے

چہ مغروری دریں دنیا سدا اس جگ نہیں رہنا ۔۔۔ ہمیں راہے کہ در پیش است سبھی اس پنتھ سے چلنا

کجا رفتند آں شاہاں کہ جن کی بارتھی ہستی ۔۔۔ گرفتند جائے در صحرا گئے سب چھوڑ کر بستی

کجا رفتند آں مرداں کہ بانکاں ٹوپیاں دھردے ۔۔۔ ہمہ در خاک خسپیند جنہاں تھیں سبھی تھیں ڈردے

کجا رفتند آں یاراں جنہاں تھیں جیونی تیرا ۔۔۔ چناں رفتند زیں عالم کہ کلھوتا کیا پھر تیرا (کذا)

کجا رفتند آں حوراں جنہاں کے نین تھے بانکے ۔۔۔ چناں بگذاشتند خانہ نہ پھر گھر بار دہر جھانکے

کجا آں ماہ رو خوباں جو مور کند لڈتے پاتے ۔۔۔ نہ نام و نے نشاں ماندہ سبھی گل گل بہے ماتے

کجا سوداگراں منعم جنہاں کے بار تھے تاندے ۔۔۔ کلالاں خاک شاں بردند گھڑے مکھ پار تس بھاندے

در آں وقتیکہ تو میری نہ دنیا کام تجھ آوے ۔۔۔ کسے کو داد و بخشیدہ وہی کچھ ساتھ بھی جاوے

نہ اینجا خویش کس باشد نہ کوسی یار کو یاری ۔۔۔ نہ کس مونس بود دیگر نہ بھائی باپ مہتاری

ترا در گور بسپارند پھر کر لوگ گھر آوے ۔۔۔ بیفتند با خدا کار ت نہ کوئی آوے چھڑکاوے

دراں درگاہ بے رشوت بنجانوں کیوں رہے پڑا

جنید امرد آں باشد کہ اس سیار تھیں ڈردا

ہندوستان کی طرح پنجاب میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو مشائخ کی خانقاہوں

ہیں سب سے پہلے پرورش پائی ہے اور گھٹنیوں چلنا سیکھتی ہے۔

منشی ولی رام

شاہجہان کے دور میں منشی ولی رام صاحب عربی و فارسی و ہندی میں شعر کہتے تھے۔ اور ولی تخلص کرتے تھے۔ دارا شکوہ کے مشیر خاص تھے۔ ان کی مثنوی ملقب بہ شش وزن مطبع نادرالعلوم میں چھپ چکی ہے۔ غزل ذیل اُن کا نمونۂ کلام ہے ؎

چہ دل داری دریں دنیا کہ دنیا سے چلانا ہے۔ چہ دل بندی دریں عالم کہ سر پر چھوڑ جانا ہے
چو ہنگام اجل آید بکارت کُلّہ نہ لکھ آید بچھائی کاہ کی تیری وہی تیرا بچھانا ہے
قباو چیرۂ رنگیں ہمہ از تن تو بکشایند دھینگے کفن کی چادر جو تیرا خاص بانا ہے
ہزاراں کھانا گرداری پر از حلوا پلا رنگیں دیویں دو مشت ارداوا جو تیرا خاص کھانا ہے
بہ مادر پدر فرزنداں برادر ہا کہ می نازی؟ وہی تجھ کو جلائیں گے جناں پر ہیت ٹھانا ہے
تو ہماں آمدی ایں جا شدی خود خانہ خاوند تو اپنے آپ کو بھولا کسی کو نا پچھانا ہے
شراب سرخ می نوشی اجل کردی فراموشی مرن کو دُور مت سمجھو عجب یہ ٹک بہانا ہے

طلب دیدار میدارم کہ روز اول شفاعتہا
بسا رو مت ولی راما کہ آخر رام راما ہے

(خزینۃ العلوم۔ درگا پرشاد نادر۔ مفید عام ۱۸۷۹ء)

مولانا عبدی

۱۱۷۰ھ میں "فقہ ہندی" نامی ایک رسالہ بعہد عالمگیر پنجاب میں لکھا جاتا ہے اسپرنگر نے فہرست کتب خانۂ اودہ میں اس کو محشر نامہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اس کتاب کا نام محشر نامہ نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ فقۂ ہندی۔ اس کا یہ خیال بالکل درست ہے لیکن وہ اس رسالہ کے ناظم کا نام محمد جیون عرف محبوب عالم متوطن جھجر بیان کرتا ہے اور خاتمہ سے دو شعر نقل کرتا ہے:۔

فقہ ہندی کو موماں انو زبان پر یاد   مسلہ آوے دین کا مول نہ ہووے فساد

سن ہزار چوتھے بیچ رمضان (کذا)   اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا تمام

اور شعر افتتاحی حسب ذیل نقل کرتا ہے:۔

اللہ مولا پاک ہے جو جگ سرجن ہار   جن دل یار صدق سوں سوئے اترے پار

میرے زیر نظر فقۂ ہندی (مملوکہ پروفیسر سراج الدین آذر۔ ام۔ اے) ہے۔ جو ۱۲۳۳ھ کی نوشتہ ہے۔ اس میں خاتمہ کا پہلا شعر اسپرنگر کے منقولۂ بالا شعر کے مطابق ہے اور شعر دوم یوں ہے:۔

سنہ ہزار چو ہتر بیچ ماہ رمضان تمام   اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہو انظام

مگر شعر افتتاحی یوں ہے:۔

حمد ثنا سب کوں خالق کل جہان   لایق حمد ثنا کے اور نہ کوئی جان

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسپرنگر کے سامنے دو مختلف رسالے ایک ہی جلد میں ساتھ بندھے ہوئے تھے جن میں فقۂ ہندی کا نمبر دوم تھا۔ اسپرنگر نے دونوں رسالوں

کو ایک سمجھا۔ اِس لئے ابتدائی شعر پہلے رسالہ کا دیا۔ اور قاتم، فقۂ ہندی سے نقل کر دیا۔ اِسی لئے اُس نے مصنف کے نام میں بھی غلطی کھائی ہے ۔۔
فقہ ہندی کا مصنّف عبدی ہے نہ کہ محمد جیون۔ عبدی کا نام اس شعر میں آتا ہے :۔

کیتے مسلہ دین کے عبدی کہے امین   فقہ ہندی زبان پر بوجھو کر و یقین

اِس کے علاوہ رسالہ کی زبان اس قدر پنجابی آمیز ہے کہ اس کو ہریانی زبان میں کسی طرح داخل نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس کا صحیح نام پنجابی اردو ہے ذیل کے اشعار سے ناظرین خود اندازہ لگا سکتے ہیں :۔

حمد ثنا سب بکوں خالق کل جہان   لائق حمد ثنا کیے اور نہ کوئی جان ؏
علم شریعت نال کے بھیجا پاک رسول   جو کچھ بھیجا رب نیں سب ہم کیا قبول
یا رب اپنے فضل سوں بیحد بھیج درود   نبی محمد مصطفٰے تجھ سوں ہو خوشنود
بھیجوں اوسکی آل پر اور اصحاب تمام   تس بھیجوں احباب پر بہت درود سلام
کیتے مسلہ دین کے عبدی کہے امین   فقہ ہندی زبان پر بوجھو کر و یقین
مطلب مسلہ پوچھنا فرض عین کے جان   عربی ترکی فارسی ہندی یا افغان
علم شریعت پوچھنا فرض عین کے جان   بالغ عورت مرد کوں جو ہوئے مسلمان
چار علم سب فرض ہے بوجھو کر قیاس   علم توحید نماز ہے روزہ حیض نفاس
تس کے پیچھے مومنا تہتر فرقہ جان   بہتر فرقہ دوزخی سو تبعہ شیطان
رافضی خارجی جبریہ مرجیہ بھی جان   جہمیہ قدریہ ہر یکے سو بارہ فرقہ مان
فرقہ بہشتی مصطفٰے اور اصحاب تمام   یہ فرقہ اسلام کا سنت جماعت نام
تس پر چار امام ہے چار رکن اسلام   ابو حنیفہ شافعی مالک احمد نام
سنی ہو دس چیز سوں یہ مسلہ کر یاد   تفضیل دے دو شیخ کوں دوستی دو داماد

دو امام پیچھے نماز کر دو قبلہ کو جان　　دو جنازہ پر نماز کر مسح دو موزہ آن
دونوں عید نماز کر اطاعت دو سلطان　　راضی ہو تقدیر پر دو گواہی جان
گناہ کبیرہ پوچھنا لازم کر کے جان　　اشتراک باللہ اور مارنا ناحق مسلمان
سحر کرنا اور بھاگنا بیچ غلبہ کفار　　عاق کرنا ماں باپ کا جو ہیں مسلم بیدار
کھانا مال یتیم کا بیاج کھانا جان　　نو ہیں کبیرا متفق اور زنا خمر پچھان

دو ہاتھ نکالے ہاتھ سوں جب آکھے تدبیر　　مسرنہ جہائی رفع کرلے صاحب تدبیر
چار انگلی کے فرق سوں حد بی دھر دو پانو　　جوتوں کھڑا نماز میں دیکھ سجدہ کی ٹھانو
دیکھ رکوع میں پانو کو سجدہ ناک تمام　　قعدہ بیچ کنار کو کاندہا وقت سلام
حی علی الفلاح تھاڈا ہووے امام　　قد قامت الصلوٰۃ شروع کرے امام
طرف قبلہ کر انگلیاں سجدہ کر بیچ ہاتھ　　مونڈرا بر بیٹھ کے راکھ رکوع کے ساتھ
گھٹنہ دھر بھی ہاتھ سر سجدہ کوں لیاؤ　　سر اوٹھاؤ بھی ہاتھ کوں پیچھوں گھٹنہ اٹھاؤ

اس تصنیف کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بعض فارسی افعال کا استعمال دیکھا جاتا ہے۔ جیسے :-

لب بینی کے بال لے سابے ناخن چین　　ختنہ چھوٹی ازار کر سنت جان یقین

دیگر ؎

استنجا سنت خاک سوں ڈھیلہ پتھر ساتھ　　چوب رُوئی اور برف سوں چونہ نمد ردات

دیگر ؎

عیدگاہ کی راہ میں پکار کہتے تکبیر　　پیچھوں دوگانہ عید کے قربانی واجب گیر

عبدی پنجابی میں بھی ایک شاعر گذرا ہے جو رسالۂ مہتدی کا مصنف ہے
اَیہ رسالۂ مہتدی اور فقۂ ہندی کی زبان میں قرابت قریبہ موجود ہے جس سے

میرا خیال ہے کہ دونوں رسالوں کا مصنف ایک ہی شخص ہے۔ مثلاً

فقہ ہندی ؎ مسلہ آویں دین کے مول نہ ہووے فسادٔ

دیگر ؎ کیتے مسلے دین کے عبدی کہے آمین

رسالۂ مہتدی ؎ آکھاں وقت سوال دے مول نہ تھیوے فسادٔ

دیگر ؎ واجبات نماز دے عبدی کہے آمین

دونوں رسالوں کا وزن بھی ایک ہے۔ اور جملوں کی ترکیب اور بندش بالکل پنجابی طرز میں ہے۔

ناصر علی سرہندی

آبِ حیات میں مذکور ہے کہ اُستاد ولی نے ناصر علی کو لکھا تھا ؎

اچھل کر جا پڑے جوں مصرعِ برق ۔۔۔ اگر مصرع لکھوں ناصر علی کوں

ناصر علی نے جواب میں لکھا ؎

باعجازِ سخن گر اڑ چلے وہ ؎ ۔۔۔ ولی ہرگز نہ پہنچے گا علی کوں ؎

پنجاب میں علی کی غزلیں ایک وقت میں بہت مقبول تھیں ۔ اور اب بھی پُرانی بیاضوں میں مل جاتی ہیں ۔ یہاں علی کے اُردو کلام کا نمونہ ایسی بیاضوں سے دیا جاتا ہے ۔ جو محمد شاہ کے عہد میں یا اُس سے چند سال بعد نقل کی گئی ہیں ؎

نین سے ساغر تمن کے بھیتر اچھوں لبالب مل پڑیگا ۔۔۔ ہوئیگی نرگس خجل چمن موں گلونکی انکھیاں میں گل پڑیگا

دو نین کا ری تمیں کی جانی حیران کرنی لوگوں کے تائیں ۔۔۔ خراب ہوگا تمام عالم جب ان نین موں کجل پڑیگا

تمن کے ابرو کماں دستی پلک سے جانو چو تیر ناوک ۔۔۔ نظر غضب کی نہ دیکھو ساجن کوئی بیچارا اوقل پڑیگا

علی ملامت تیرے سجن کی اگر زلیخا سنیگی کبھو

مصر میں سودا اگر ہوئیگا درم نہ یوسف کا مل پڑیگا

(از بیاض پرتاب سنگھ ۔ نوشتہ سنہ ۹ جلوس محمد شاہی)

سجن کے حسن کا قرآن پڑھیا ہے میں نظر کر کر ۔۔۔ نہیں پائی غلط لوس میں دیکھا زیر و زبر کر کر

ترے غم کا مجھے سر جن ہویا ہے کافیہ کافی ۔۔۔ شرح ملا دس میں سُوں سُستی ہے بس مدد کر کر

معانی اور بیاں بھیتر بدیع اس کو سمجھتا ہوں ۔۔۔ پڑھی ہے حسن تیرے کی مطوّل جیوں فکر کر کر

کلام العشق ہمنا کوں ثنا حکمت سوں منطق موں ۔۔۔ وگرنہ اس مطوّل کوں رکھا تھا مختصر کر کر

اصول اور ہندسہ کیں ایک پھیر تکمیل آئے یاراں ۔۔۔ ہدایہ عشق کا غالب ہویا مجھ پہ اثر کر کر

بگردِ روی ساجن کے ہویا پیدا خطِ مشکیں یا   یا ملکِ سلیمانی مگر موراں نکر کر کر آ
جرس تجھ کارواں کا سن علی آس شوخ بے پروا   کیا ہے یار ہستی کا وے لے عزم سفر کر کر

(از بیاض نوشتۂ محمد شاہ مرقومۂ ۱۱۶۱ھ)

دیگر ؎

چندر سے مکھ پہ خیالِ مشکیں نہ پٹ لبشوخی لٹک رہا ہے   عجب ہے یاراں کہ ایک ناگی بیا کے دمی اٹک رہا ہے
بتِ فرنگی بقتل ہمنا رکھے جو پرچیں جبیں دمادم   ہوا ہے جیونا جگت میں مشکل کہ تیغ ابرو سر کر رہا ہے
علی الفقر امقام جس کوں ہوا ہے حاصل ز وصلِ جاناں   چو چشم نرگس ہوا ہے حیراں وصول دلدار جھپک رہا ہے

(از بیاض پرتاب سنگھ؛ نوشتۂ سنہ ۹ جلوس محمد شاہی)

علی کا کلام فارسی ترکیبوں کی بنا پر محمد شاہی عہد کے شعرا کے کلام سے ممیز ہے۔ بگردِ روی ساجن۔ آس شوخ بے پروا۔ بتِ فرنگی بقتل ہمنا۔ چو چشم نرگس۔ چو تیر ناوک۔ ایسی بندشیں ہیں جو قدیم شعرای دہلی کے ہاں کمیاب ہیں۔ برخلاف اس کے پنجاب کے شاعر ایسی ترکیبیں لانے کے عادی ہیں ؞

شیخ ابو الفرج محمد فاضل الدین بٹالوی متوفی ۱۱۵۱ھ

بٹالہ سرزمین پنجاب میں ایک مردم خیز شہر ہے۔ میرزا نور العین واقف فارسی کے مشہور شاعر کا مولد و منشا یہی شہر ہے۔ بارہویں صدی ہجری میں اس شہر میں مشائخ کا ایک مشہور خاندان ظہور میں آیا۔ جس کے جدِ اعلیٰ شیخ ابو الحسن علی بغدادی معروف بہ بدیع الدین شہید حسنی جیلانی ہیں۔ آپ بسبیل سیاحت عراق سے ہندوستان وارد ہوئے اور یہیں رہ پڑے۔ عوام الناس میں عربی لباس کی بنا پر آغا کے نام سے مشہور ہو گئے۔ آپ کا مزار موضع سہاری من مضافات پنجاب ہے۔ آپ کے احفاد میں شیخ ابو الفرج محمد فاضل الدین بٹالوی نے خاص شہرت حاصل کی۔ آپ شیخ محمد افضل لاہوری کے مرید ہیں۔ بیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر تلاش معاش کی غرض سے شاہی لشکر کی شمولیت کی امید میں وطن سے نکلے۔ جب بٹالہ پہنچے۔ کچھ ایسے موانعات پیش آئے کہ شراکت لشکر کے ارادہ کو ترک کر کے یہیں رہ پڑے اور تصوف میں ذوق لینے لگے۔ آپ نے چالیس کتابیں اور رسالے اپنی یادگار چھوڑے[1]۔ ایک روایت[2] ہے کہ تصانیف کی تعداد ایک سو سے زائد ہے۔ اُن میں سے قصیدۂ خمریہ حضرت غوث الثقلین پر آپ کی عربی اور فارسی شرح اور ترجمہ مواعظ الرحمان کے نام ہم تک پہنچے ہیں۔ ۷ ذیحجہ ۱۱۵۱ھ میں بہتر برس کی عمر میں انتقال فرماتے ہیں "غم عام" تاریخ وفات ہے۔ آپ کے والد کا نام

---

[1] تذکرۃ الابرار غلام محی الدین بن عبد الکریم قادری پشاوری ۔

[2] بدر محی الدین صاحب کا خط (بحوالہ شرائف غوثیہ) از درگاہ فاضلیہ۔ بٹالہ ۔

سید محمد عنایت اللہ ہے جو عہد شاہجہان و عالمگیر میں سیالکوٹ۔ کشمیر۔ کابل وغیرہ مقامات میں متفرق اوقات پر قاضی القضاۃ رہے ہیں۔ اور خان بہادر کے خطاب سے سرفراز تھے۔ آپ نے عربی اور فارسی علوم کی تحصیل مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی کے نواسہ ابوالحسن فتح محمد اور میاں محمد غوث لاہوری سے کی تھی[۱]۔

حضرت محمد فاضل بھی اُردو میں شعر کہتے تھے۔ ان کا اور سید ولی اورنگ آبادی کا زمانہ تقریباً ایک ہے یہاں میں آپ کی ایک مناجات جو عربی اور اُردو میں ہے درج کرتا ہوں ؎

ناہیں مرا چھٹ تم کوئی انظر بحالی یا نبیؐ ‌ ‌ ہے رین دن غفلت پڑی انظر بحالی یا نبیؐ

اس فضل سوں راکھو مجھے من عزل درجات الصفا ‌ ‌ فریاد کرتا ہر گھڑی انظر بحالی یا نبیؐ

میں ہوں خرابی میں پڑا کا نطفل سوء الخلق حیف ‌ ‌ اس غم سنی چھاتی سڑی انظر بحالی یا نبیؐ

اس شرم سوں مجھ مکھ نہیں حتیٰ اری صنوء الصفا ‌ ‌ ہے مرگ بھی سر پر کھڑی انظر بحالی یا نبیؐ

بر تبع شریعت سوں رکھو حتی اکون بنور کم[۲] ‌ ‌ اس عشق سوں کر پھل جڑی انظر بحالی یا نبیؐ

در در لکھوں رو رو بھروں نقشاً بقصاً عاصیا ‌ ‌ افواج عصیاں سوں جھڑی انظر بحالی یا نبیؐ

راکھو نہیں راکھو نہیں لی لیس غیرک یا ملاذ ‌ ‌ ناہیں مرا چھٹ تم سنی انظر بحالی یا نبیؐ

بھولا ہوں میں بخشو نہیں لا نا خاذ دنی بالوزر ‌ ‌ جب محی دین بخشش کری انظر بحالی یا نبیؐ

فاضل بچا رے دین دن اشفع شفیع المذنبین

فریاد کرتا ہر گھڑی انظر بحالی یا نبیؐ

(از بیاض مملوکہ پروفیسر آذر)

۱؎ بدر محی الدین صاحب کا خط (بحوالہ شرائف غوثیہ) از درگاہ فاضلیہ بٹالہ ۔

۲؎ فارسی کا پرتو ہے جیسے نوجے از کاذگاں ۔

شیخ محمد نور

شیخ محمد فاضل کے پیر بھائی شیخ محمد نور ہیں۔ جو شیخ محمد افضل کے مرید ہیں۔ اُن کی ایک اُردو مناجات یہاں نقل کرتا ہوں ؎

بہر خدا تو اے صبا بغداد جا فریاد کر — دربار میراں شاہ کے کہہ تنتی مجھ سر بسر

ڈوبا ہوں غم کے چاہ موں کر فضل مجھ بہر خدا — تم بن مرا کوئی نہیں میں دست عاصی کا پکڑ

روتا ہوں اپنے حال سوں غفلت ستی حیراں ہوا — زحمت سوں مجھے مضطر کیا دیوو شفا خود کرم کر

تیرے مرید جو خاص ہیں اُن کے سگاں کا ہوں سگ میں — بہر خدا اور مصطفےٰ کر لطف کی مجھ[1] پر نظر

حق نے تو تجھے سرور کیا ولیاں ہیں تم سرتاج ہو — ہویا نکوئی نا ہووے تیرے جیہا[2] نا دن حشر

صد حیف مجھ عاصی تائیں تم سا ہووے میرا سائیں — دل کی سیاہی نا ادھے عالم کے تم ہو راہبر

مجنوں کے جس (کذا) مارے ہوئے وانیکے اگرے — مجھ اس لئے تجھ نام کی ہے ورد دل میں جان بہتر

تم سار کا جس پیر ہوا وسکوں نہیں پرواہ کچھ[3] — پاوے وہ جگ میں عافیت تیری نظر سوں سنگ زر

چاہو اگر مردے تائیں زندہ کرو اک پل منے — تم کی صفت میں[4] کیا کروں تم سا نہیں کوئی دگر

خواب کے ہرگز داب موں نکراں ستی مجنوں ہویا — مرنے میں کچھ باقی نہیں جینا ہیں تم کی آس پر

توت گئی[5] مجھ صبر کی ہے بیقراری روز و شب — تم سیں طلب آرام کی بار وہم مجھ کے دور کر

تم کی محبت دل مرا لیتا ہے اپنے دام سوں — حق سوں رجا دائم مجھے پاؤں میں دنیا دیں میں فخر

دیوے خدا توفیق گر تم کا اسم ہر دم پڑھوں[6] — تجھ اسم اعظم سے یہ مشہور ہے عالم بھتر

پوچھیا کہ تحقیق میں عالی تری درجات ہے — صدقہ علی حسنین کا آ فرق مجھ کے قادم دھر

---

[1] مجھ ۔ [2] جیسا ۔ [3] کچھ ۔ [4] میں ۔ [5] گئی ۔ [6] پڑھوں ۔

دامن لگیکی لاج تجھ سن عاجزی مجھ کی شہا — محفوظ کر دل جان سوں دو جگ کو آمیر خطر
دار مبارک لب ستی مجھ کا کہو خو فیض سوں — دل کی قساوت سب گوا روشن کرو سینہ جگر
عصیاں سوں میں غرقاب ہوں نیکی نہیں مجھ سیں موئی — تجھ پا یہی میں آگرا ہوں ناتواں بے بال و پر
کر کر تصدق نانو کے باطن مری کی لے خبر — رکھ شاد دنیا دیں موں مجھ نفس شیطاں کا نہ ڈر
حق کی حضوری بخش مجھ مجلس محمد[2] مصطفےٰ[1] — دہ قرب انبیا کر مجھے دو جگ ہوا[1] واں میں شاد تر
بن دیکھنے تجھ اے شہا زندگی میری برباد ہے — چہرا مبارک مجھ دکھا تجھ سوں فدا دل جان و سر
غم کی تباہی سے چھوڑا کر دفع مجھ سیں ہر بلا — توں بادشاہ دو سرا مشکل مری آسان کر
افضل سائیں نائب ترے میرے پھرانے[1] دست جی — برکت دونوں کے نام کی مجھ سیں گوا ہر شور و شر

میں ذرہ عاجز رات دن ہے ورد تیری مدح کا
واصل خدا کا کر مجھے بے رنج بے محنت ضرر

یہ خانقاہی اردو کے نمونے آج ہمارے کانوں کو نہایت عجیب معلوم ہونگے لیکن ہمیں تاریخی دلچسپی کی رو سے ان پر نگاہ ڈالنی چاہیئے۔ یہ تبرکات ایسے عہد کی یادگار ہیں جب کہ ابھی دہلی میں بھی سناٹا تھا۔ اور میر و سودا کی غزلخوانی شروع ہونے میں ایک عرصہ درکار تھا۔ ہمیں اس نظم کی بعض خصوصیات کو یاد رکھنا چاہیئے۔

کر فضل مجھ = مجھ پر فضل کر۔ میرا کوئی نہیں = میرا کوئی نہیں۔ ولیاں میں = ولیوں میں۔ تیرنے جیہا = تیرے جیسا۔ تجھ نام کی = تیرے نام کی۔ تجھ کے اوپر = میرے اوپر۔ تم سار کا = تم سریکا۔ تم کی صفت مہ کیا کردں = تمہاری صفت میں کیا کروں۔ تم کا اسم ہر دم پھڑدں = تمہارا اسم ہر دم پڑھوں۔ بن دیکھنے تجھ = تیرے دیکھے بغیر۔ مجھ دیکھا = مجھ کو دکھا۔ بعض الفاظ کا جو غلط تلفظ دیا ہے۔ مثلاً کرم۔ قدم

---

[1] ہووس ÷ [2] پکڑے ÷

وغیرہ پرانی اُردو میں اسی طرح بولے جاتے تھے ۔
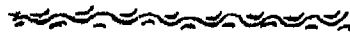
مُوسیٰ

اسی عہد کا ایک ترجیع بند دیا جاتا ہے جس کے مالک موسیٰ ہیں۔ ان کے حالات معلوم نہ ہو سکے ؎

ہم چرنوں لاگے آن تیرے جو پاویں درسن دان تیرے
دو جگ پر احسان تیرے سب بندہ ہیں سلطان ترے
سب وحش طیور انسان ترے لاگے ہیں وصیان اوگیان ترے
دہارے ہیں عرش نشان ترے ہیں صدقہ او قربان ترے
کر دل کوں بدر منیر میرے یا غوث الاعظم پیر میرے
دو جگ میں شکر شیر ہو تم یا داتا حضرت پیر ہو تم
رتبہ موں عرش منیر ہو تم دکھیا کے دہیرج دہیر ہو تم
سب ولیاں بیچ امیر ہو تم ہر اول اور اخیر ہو تم
قادر بہ ہر تقدیر ہو تم ہر شے موں بلا نظیر ہو تم
کر دل کوں بدر منیر میرے یا غوث الاعظم پیر میرے
تم محی الدین جیلانی ہو تم سانچے قطب ربانی ہو
تم سچے محبوب سبحانی ہو تم بر حق غوث صمدانی ہو
تم حوض کوثر کے باقی ہو ہر مشکل کی آسانی ہو
کر دل کوں بدر منیر میرے یا غوث الاعظم پیر میرے

میں عاجز تجھ دربار کھڑا　　کہتا تیرے دوار کھڑا
تجھ نام کا لے آدھار کھڑا　　کرتا ہوں بہ نستار کھڑا
رنجیدہ دل لاچار کھڑا　　کاندھے پر غم اسوار کھڑا
مجھ ساتھ کا کھیوا پار کھڑا　　یا پیر بہن پاپی دار کھڑا
کر دل کوں بدر منیر میرے　　یا غوث الاعظم پیر میرے

تم صحی پیراں سر پیراں جی　　تم سانچے حضرت میراں جی
تم کھولو بند اسیراں جی　　مجھ دکھ کی کاٹ زنجیراں جی
تم انکھیں[1] دیت بصیراں جی　　تم خوشی دیت دلگیراں جی
تم دھیرج دیت ادھیراں جی　　کیا ہند دکن ایراں جی
کر دل کوں بدر منیر میرے　　یا غوث الاعظم پیر میرے

نہیں عرضی مال منال کا ہوں　　آشفتہ تیرے جمال کا ہوں
مزدوی تجھ جاہ جلال کا ہوں　　شیدا تجھ قیل ارقال کا ہوں
میں بھوکا[2] تیرے وصال کا ہوں　　دیوانہ اسی خیال کا ہوں
میں منگتا اسی سوال کا ہوں　　میں عرضی اس احوال کا ہوں
کر دل کوں بدر منیر میرے　　یا غوث الاعظم پیر میرے

تو ہادی راہ ہدایت کا ہے　　تو معنے فیض کی آیت کا
حامی ہیں روز عنایت کا　　کافی ہیں کرم کفایت کا
ہیں داعی فضل رعایت کا　　والی ہیں عین عنایت کا
ہے سایہ تیرے رایت کا　　یہ شوق مجھے بغایت کا
کر دل کوں بدر منیر میرے　　یا غوث الاعظم پیر میرے

---

[1] آنکھیں ۞ [2] بھوکا ۞

تجھ نیہہ کی کنتھا سیتا ہوں　　کرتا سیں کپرلے بیتا ہوں
تجھ یاد کی پھکسیا کیتا ہوں　　اور خون جگر کا پیتا ہوں
تجھ نام لیئے سیں جیتا ہوں　　ہیں نیک عمل سیں بیتا ہوں
تجھ در کی ماٹی لیتا ہوں　　مکھ پر یہ خاک رلیتا ہوں
کر دل کوں بدر منیر میرے　　یا غوث الاعظم پیر میرے

تم غم مجھ دل سیں دور کرو　　یہ بات میری منظور کرو ؎
مجھ دشمن حیلکنا چور کرو　　آتش میں دل منثور کرو
سینہ کو یہ پر نور کرو ؎　　اعشق اپنے سوں معمور کرو
مے اپنی سوں مخمور کرو　　یہ بار ہمارا پور کرو
کر دل کوں بدر منیر مرے　　یا غوث الاعظم پیر مرے

ہم بیکس دیکھن آدر ترا　　مشہور جگت موں شور تیرا
پلکی موں باندھا چور ترا　　وہ چور ترا ہیں ڈہور ترا
القاب ہے بندہ چور ترا　　رکھتا ہوں ڈھیر اور زور ترا
ایماں ہے شکر معمور ترا　　..............
کر دل کوں بدر منیر میرے　　یا غوث الاعظم پیر میرے

مرپوٹ اوگن کی بھاری ہے　　مجھ لاگی آس تمہاری ہے
تجھ نام پر پوٹ اتاری ہے　　دیکھ ایسی مشکل ہماری ہے
مولیٰ تجھ درس پیکھاری ہے　　توں دستگیر ننتاری ہے
مجھ سوخت رین اندھاری ہے　　یا پیر مرے ابہ باری ہے
کر دل کوں بدر منیر میرے　　یا غوث الاعظم پیر میرے

(از بیاض پروفیسر آذر)

یہ نظم اگرچہ ہم مصنف کے عقائد سے متفق نہیں۔ سادگی جذبات و ادائے بیان کے لحاظ سے بلند پایہ رکھتی ہے۔ پنجاب میں حضرت شیخ عبدالقادر کے نام پر ایسی ہزاروں مناجاتی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ بارہویں صدی میں پنجاب کی سیاسی ابتری نے اور بھی ان کو فروغ دیا ہے۔ عالمگیر کی وفات کے بعد وہ دَور شروع ہو جاتا ہے جس کو ہم پنجاب کی تاریخ کے سیاہ ورق کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس عہد میں اس سرزمین پر آفتوں پر آفتیں ٹوٹیں۔ بلاؤں پر بلائیں نازل ہوئیں۔ سکھوں کی تاخت وتاراج۔ نادر کی آمد اور احمد شاہ دُرانی کے حملے ایسے واقعات ہیں جنہوں نے یہاں کے باشندوں کے قلوب کو یاس اور ناامیدی کی کے جذبات سے معمور کر دیا۔ قاعدہ ہے کہ مصیبت میں خدا یاد آتا ہے۔ لیکن خانقاہی اثرات میں پنجاب نے صرف حضرت غوث الاعظم کو یاد رکھا۔ اور انہی کا کلمہ اکثر پڑھا۔

حضرت غلام قادر شاہ متوفی ۱۱۷۶ھ

شیخ محمد فاضل کے فرزند اور جانشین حضرت غلام قادر شاہ ہیں۔ جو علم و عمل زہد و تقویٰ۔ ریاضت و مجاہدت اور حال و قال میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ آپکا لقب اہل اللہ ہے تصوف میں متعدد تصنیفات آپ کے قلم سے نکلی ہیں۔ جن میں سے صفاء المرآت کا ہم تک نام پہنچا ہے۔ شب یکشنبہ ۵۔ ربیع الثانی ۱۱۷۶ھ میں رحلت کی۔ فوت مخدوم آپ کی تاریخ وفات ہے اور غلام تخلص ہے۔

اُن کی اُردو مثنوی رمز العاشقین اُن کے والد بزرگوار کی زندگی ہی میں تصنیف ہو چکی تھی۔ کیونکہ اس میں انہوں نے اپنے والد کو خطاب کر کے بعض شعر لکھے ہیں۔ یہ مثنوی میر اثر کی مثنوی خواب و خیال سے جو ۱۱۵۹ھ کی تصنیف ہے۔ اقدم ہے۔ اس مثنوی کے دو نسخے میرے پاس ہیں۔

(۱) محمد جان کے قلم کا نوشتہ ہے۔ جو مصنف کے مرید اور سالے ہیں۔ اور مصنف کی زندگی ہی میں اس کی کتابت کرتے ہیں۔

(۲) ۱۲۰۴ھ کا نوشتہ ہے عنوان کتاب پر سنہری اور رنگین گلکاری ایرانی تقلید میں ہو رہی ہے۔ خاتمہ میں یہ عبارت درج ہے "نسخہ متبرکہ رمز العشق تصنیف حضرت غلام قادر شاہ قدس سرہ ساکن بٹالہ تمام گردید ۱۲۰۴ھ" دونوں نسخے خط نسخ میں ہیں۔ بارہویں اور اس سے پیشتر قرون کی اُردو تالیفات بالعموم خطِ نسخ میں ملتی ہیں۔ اور مسلمانوں نے گویا اس خط کو ہندی زبانوں کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ آج بھی پنجابی۔ سندھی اور پشتو زبانیں خط نسخ ہی

ہیں لکھی جاتی ہیں اگرچہ اُردو نے فارسی کی تقلید میں نستعلیق بعد میں اختیار کر لیا۔
اِس مثنوی کا وزن عروضی خالص ہندی ہے۔ پنجابی لہجہ کی تمام خصوصیات
اس میں موجود ہیں۔ اس مثنوی کی شرح شیخ کے پوتے شیخ ابو احمد محمد شاہ المتوفی
۱۲۲۷ھ نے لکھی ہے۔ اس کے متعلق صاحب تذکرۃ الابرار لکھتے ہیں:۔

"بر رمز العشق تصنیف جد بزرگوار خود بغایت شرح مرغوب پسندیدہ نوشتہ
و در کشف حقائق تصوف و بیان اسرار و اصطلاحات حضرات صوفیہ .....
... تعمق فراواں و تحقیق بسیار نمودہ"۔

رمز العشق میں عربی الفاظ کا استعمال کثرت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے
ایک وجہ تو اس کی یہ ہے کہ تصوف کی تمام اصطلاحات عربی ہیں۔ دُوسرے
حضرت غلام قادر شاہ صاحب خود عربی کے فاضل ہیں۔ اور اس زبان سے زیادہ
مزاولت رکھتے ہیں۔ ذیل میں مثنوی کا نمونہ عرض ہے:۔

افتتاحیہ ؎

وہی وہی نہ دوجا کوی	ہر گھٹ ہویا محمد ہوی
احد محمد ایک پچھانوں	ایک ہی دیکھو ایک ہی جانوں
حمد کہو اور بہت درود	فھو الحامد والمحمود
اوّل آخر باطن ظاہر	ناہیں اس سے کوئیو باہر
انا من نورہ سنو بیان	والکل نوری دہرو دھیان
سمجھ لیؤ اور بوجھو بات	ایک ہی ذات ہے ایک ہی ذات
سبھ بڑیائی اسے مسلّم	صلی اللہ علیہ وسلم
صلی اللہ علیہ و الہٖ	ومن اشتاق بنور جمالہٖ
سیما شیخی عبد القادر	نعم المولیٰ نعم الناصر

فاضل شاہ کا لے کر نام ۶ — سنوں حقیقت کہے غلام
دلسوں سنوں حقیقت ساری — ایک حقیقت سب موں جاری
آپ سنے ار آپ سنا دے — کیا کہے کچھ کہا نہ جاوے
وہی سمیع ، بصیر ، علیم — ناہیں اس کا کوئی سہیم ۶
کان ولم یکن معہ شیئًا — وھُوَ الآن کمَا کان کہیا
غیر کہاں ہے دیکھ پیارے — آپ ہی آپ ہے ہر ہر جاے

سات مراتب بوجھ پیارے — ہر ہر کے ہیں حکم نیارے
ست گرسوں توں کر تحقیق — ناں ہو ملحد ناں زندیق
فرق ار جمع موں فرق پچھان — پھر دونوں کو ایک ہی جان
بوجھ لیو تنزیہ کوں خوب — ناں ہو ملحد ناں محجوب
بھی تشبیہ کوں جانو نیک — پھر دونوں کوں جانوں ایک
ظاہر سوں ہے وحدت کثرت — باطن موں ہے کثرت وحدت
قدم وجوب کے سب اسماء — جانوں فاعل فی الاشیاء
ازلی ابدی ہیں درکار ۶ — نانہ معطل ناں بیکار
اس مشہد موں ہے مسجود ۶ — فہو القاصد والمقصود
یوں ہے سب اسماء کیانی — حادث جانوں اور نقصانی
اس مظہر ہیں راکع ساجد — فھو الطالب وھو العابد
بندے کا ہے طاعت کام — واعبد ربک سنوں کلام
کرو عبادت دن ار رات — شرک ار شک سوں ہوے نجات
کرو عبادت شرع آئین — حاصل ہووے نور یقین ۶

جس کوں ناہیں شرع گواہ ‏ ‏ جانوں اس کوں تم گمراہ
حق نے کہیا نور مبین ‏ ‏ شرع کوں بیچ کتاب متین
جس کوں حاصل ناں یہ نور ‏ ‏ طبع ہوا کا ہے مغرور
ناں ہو اس کوں قرب وصال ‏ ‏ شرع بنا ہے قرب محال

ازخاتمہ سے

دین دنی کا پشت پناہ ‏ ‏ والی میرا فاضل شاہ
قطب حقیقت شمس یقین ‏ ‏ نائب سید محی الدین
عارف کامل دل آگاہ ہے ‏ ‏ نورمحمد سرّ اللہ
اول آخر ظاہر باطن ‏ ‏ ہاتھ ہمارے اس کا دامن
ناہیں اس بن کوئی میرا ‏ ‏ اس کا ہوں مَیں اس کا چیرا
نا نہ کسی سوں مجھ کوں کام ‏ ‏ وہی ہے مولا وہی غلام
اپنے شہ کا لے کر نام ہے ‏ ‏ کہیا رمز العشق تمام
رمز العشق کوں جس نے جانا ‏ ‏ بیشک حق کوں دیکھ پچھانا
حمد کہوں ار بہت سلام ‏ ‏ اول آخر نیک کلام ہے
یارب صل علیہ وآلہٖ ‏ ‏ واجعلنی فی حبۃ آلہٖ
اللھم بنور جمالہٖ ‏ ‏ شرفنی بالحال وقالہٖ

آیندہ نعتیہ غزل حضرت غلام قادر شاہ کی تصنیف ہے۔ مَیں اس کے صرف چند اشعار پر اکتفا کرتا ہوں :-

سبہ دیکھو نور محمدؐ کا سبہ دیکھو نور محمدؐ کا ‏ ‏ سبہ بیچ ظہور محمدؐ کا سب دیکھو نور محمدؐ کا
وہ نقطہ علم ازل کا ہے وہ اول ہر اول کا ہے ‏ ‏ وہ مجمل ہر مجمل کا ہے سبہ دیکھو نور محمدؐ کا

وہ منشا سب اسما کا ہے وہ مصدر سب اشیا کا ہے ∗ وہ سر ظہور خفا کا ہے سب دیکھو نور محمدؐ کا
کہیں ظاہر ہو مشہود ہوا کہیں باطن ہو مستور ہوا ∗ کہیں ناظر ہو منظور ہوا سب دیکھو نور محمدؐ کا
کہیں کلمہ حق کا نور اللہ کہیں بیچ ہنگوڑے عبد اللہ ∗ سبحان اللہ سبحان اللہ سب دیکھو نور محمدؐ کا
کہیں شمع کہیں پروانہ ہے کہیں دانا کہیں دیوانہ ہے ∗ کہیں یار کہیں بیگانہ ہے سب دیکھو نور محمدؐ کا
وہ آپ ہی آپ عیاں ہوا کہیں کثرت کا ساماں ہوا ∗ ہر شان ہے وہ ہر شان ہوا سب دیکھو نور محمدؐ کا

کہیں غوث تمام کہایا ہے کہیں مولا نام دھرایا ہے
کہیں عبد غلام کہایا ہے سب دیکھو نور محمدؐ کا

شیخ نصیر الحق

شیخ فاضل الدین کے مرید شیخ نصیر الحق ہیں۔ یہ فارسی۔ ہندی۔ پنجابی اور اُردو کے شاعر ہیں۔ اُردو میں انہوں نے خصوصًا بے شمار نظمیں لکھی ہیں۔ نصیر اور نصیرا تخلص کرتے ہیں۔ مناجاتیں۔ توتا۔ بہنی اور کھردلی اکثر لکھتے ہیں۔ اِن کا کلام بہت ہے۔ میں صرف بعض مثالیں یہاں دیتا ہوں:

ایرے نصیرا وقت ہے یہ وقت پھرنا پائیے — سر کاٹ لے کر ہاتھ پر آگے پیا کے جائیے
صورت نہ سیرت مجھ منے کس راہ پیا کوں پائیے — فاضل سائیں ہے بوالفرج اُن کے تصدق جائیے
آتش پڑی ہیرے مرے اس عشق دھندوکار کی — بھنہ تن جلا کولا کیا صورت یہی انگار کی
بجلی پڑی مجھ غیب سیں اس ابر آتش بار کی — فاضل سائیں کو جا کہو یہ خبر اس بیمار کی
جھانکی دکھا او پیو کی کر کرم اس آزار پر — قربان کر سب جان و تن اس غوث قطب ابدال پر
جو نام سُن سُن کانپتے تھے یہ دہا مجھ آئیاں — ہے رے جیا اب کیا کروں تو جاں برہیاں دہائیاں
تلوار جمدہر سار کی لے تبر ترکش آئیاں — تجھ بن مرا اب کو نہیں لے شاہ فاضل سائیاں

جوگن بھئی میں لے پیا ہو ہو تیری پکارتی
فاضل سائیں بہچیا دیہو میرا تو بازی ہاردی

دیگر۔ مناجات تصنیف حضرت نصیر الحق ؎

یا غوث سیّد محی الدین لیتے خبر اس زار کی — کر کر تصدق پایوں کا جھانکی دیہو دیدار کی
ہاہڑے پڑے برہوں اگن جلنا پڑا مجھ رین دن — مجھ کوں بتا دو وہ سجن دیوے خبر دلدار کی
راکس برہوں جب آئیا اس ماس ہیہ چن کھائیا — اب ہاڈ کھاون تھائیا جو کہ ہے اس خونخوار کی
دیکھے بناں پیارے سجن کیونکر کٹھوں میں رین دن — لیاؤ مجھے دیوو کفن ہووے مکھہ جنجال کی

دیو و دکھائی اے پیا تم بن سکوں کیونکر جیا — بہوں مجھے بیکل کیا طاقت نہیں اس بہار کی
نس دن مجھے ہے رووناً رو رو مجھے جی کھووناً — یہ موکھ لہو سیں تھووناً نشتر لگی ہے سار کی
کب لگ یَں اس دکھ موں جیوں دل با زخنجر میں مُوں — سر کاٹ کر آگے دھروں کر بیٹھا اس دلدار کی
وہ پیو پیر راہ ہے سب جگ کا شاہنشاہ ہے — وہ محی الدین دی لخواہ ہے ہو خاک اس دربار کی
فاضل سائیں کرنا کرم جیہ نوں لگی کی کر شرم — لیا فے مجھے دیوڈ جرم جہاں کی دیلا دو یار کی

کہہ اے نصیر کیا کروں برہوں کی جکھ میں جل مرو لیا
جرتے نہ ہرگز دم بھر دل یہ تھورنا گفتار کی

شاہ مُراد

شاہ مراد غالباً اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں اُن کے حالات سے واقف نہیں۔ نمونۂ کلام ذیل میں عرض ہے ؎

اب کیا کہے کوئی رے جیا جیب آنکھوں سے پیا دور ہوا — تن لکڑی ہو جل راکھ بھیا یہ سینہ گرم تنور ہوا

وہ نور سجن کوں حسن تے دیا یہ چاند جو حسن کا حق نے دیا — یہ سورج ہے وہ آپ پیا پر نور ہویا مشہور ہویا

وہ قد پیا کا قامت ہے یا شعلہ نور کرامت ہے — یہ قد نہیں ہے قیامت ہے، وہ دل کوم پڑی ہے شور ہویا

تیرے مکھڑے پر اک خال پیا جس دیکھا گھر پامال کیا — یہ نقطہ ہے بسم اللہ کا جو مصحف پر مسطور ہویا

وہ خال لبوں پر زور پڑا جیوں پھل پہ عاشق بھونرا پڑا — یا زر پر آکر چور پڑا یا قند شکر پر مور ہویا

بن پانی چاہ معمور نہیں بن جانی دل مسرور نہیں — بن درد عمل منظور نہیں جو عاشق ہے مغفور ہویا

اس خاکی تن کوں جار کروں سر صدقے تیرے وار کروں — تجھ باج نہ دوجا یار کروں یہ نازک تن منظور ہویا

جس سر انا الحق جان لیا تس خون جگر کا چھان لیا — سر کھو کر جیو قربان کیا وہ چڑھ سولی منصور ہویا

وہ مجنوں آپی لیلیٰ ہے وہ یوسف آپ زلیخا ہے — وہ وامق آپی عذرا ہے مشتاق ہو خود مغرور ہویا

دن رات پیا بن سوتی ہوں ذہن تجھ بھر روتی ہوں — مکھ لعل شراب سے دھوتی ہوں نت دنیا مجھ دستور ہویا

ترے درسن کی مدماتی ہوں تری کاج سونت برلاتی ہوں — ترے گن کی مالا گاتی ہوں رگ تاراں تن طنبور ہویا

دن رات جو تیری چاہ مجھے یہ آگ برہ کی ناہ مجھے — نت جلنے ہیری ما نہ مجھے جل سر من تن کوہ طور ہویا

یہ شعر عجب اُستاد سوں ہے یہ لیر حسن آباد سوں ہے

یہ ریختہ شاہ مراد سوں ہے مقبول ہویا منظور ہویا

یہاں ایک ضروری امر کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اوپر میں نے جس قدر پنجابی اُردو نظموں کے نمونے دیے ہیں وہ

اس تحریک سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے جو بارہویں صدی کے ربع دوم میں دہلی میں ولی اورنگ آبادی کے دیوان یا خود ولی کی آمد سے تعلق رکھتی ہے۔ میر حسن کا بیان ہے کہ ولی عہد عالمگیر میں دہلی آئے۔ لیکن آزاد ۱۱۳۵ھ جلوس محمد شاہی اس کی آمد کا سال بتلاتے ہیں۔ میں آزاد کے بیان کو ترجیح دیتا ہوں۔ کیونکہ ولی کا محمد شاہ کے عہد میں دلی میں موجود ہونا خود ولی کے ایک شعر سے جو مولانا آزاد نے آب حیات میں نقل کیا ہے ثابت ہے ؎

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین　　جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

گویا بقول آزاد ولی ۱۱۳۵ھ میں دہلی میں وارد ہوئے۔ اور اس عہد سے دہلی میں اردو غزل گوئی عام رواج پاگئی ورنہ اس سے پیشتر شعرا کے لئے یا فارسی یا بھاشہ کا میدان کھلا ہوا تھا۔ جس میں وہ اپنی طبیعت کی صنعت گری کی بہار دکھاتے تھے۔ اردو میں غزل گوئی کی بنیاد اگرچہ ولی کے عہد سے بہت قدیم ہے۔ لیکن ہندوستان میں اولیت کا تاج ولی کے سر پر ہی رکھا گیا چنانچہ ہمارے قدیم تذکرہ نگاروں نے اسی کو اردو شاعری کا آدم مانا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں ولی کے طفیل اس قسم کی شاعری جو قدرتاً مسلمانوں کی طبیعت اور رجحان کے زیادہ مناسب تھی رواج میں آئی۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ تحریک بڑی سرعت کے ساتھ اس عہد کے تعلیم یافتہ طبقہ کے قلوب میں گھر کر گئی۔ کیونکہ اس شاعری کا دارومدار زیادہ تر فارسی جذبات پر تھا۔ اور فارسی خواں گھر گھر میں موجود تھے۔ درحقیقت اردو شاعری فارسی کا پرتو ہے فارسی کے تمام قواعد وضوابط عروض و اقسام شعر کو اس میں منتقل کر لیا گیا ہے۔ وہی بحریں ہیں۔ وہی ردیف و قافیہ کی پابندی۔ وہی خیالات و جذبات صنائع و بدائع تشبیہات استعارات و تلمیحات وغیرہ وغیرہ۔ لیکن پنجاب کی نظموں کے

گذشتہ نمونے کئی امور میں مختلف ہیں۔ اول تو ان کی بحریں زیادہ تر مقامی ہیں دوسرے ان میں اگرچہ ردیف کی پابندی کیجاتی ہے لیکن قافیہ کا لانا لزوم مالا یلزم مان لیا گیا ہے۔ پھر وہ جذبات میں فارسی سے مختلف ہیں۔ ہندی میں عاشق اکثر عورت ہوتی ہے۔ ان نظموں میں بھی یہی خصوصیت موجود ہے۔ وہ فارسی صنائع وبدائع وتشبیہات سے بالکل عاری ہیں۔ اور اس شاعری کا مدار ایہام پر نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم دلی اور اس کے پیرووں میں دیکھتے ہیں۔ ہم کو تعجب آنا چاہیئے کہ اردو کے لیئے دو مختلف مرکزوں میں دو تحریکیں ایک ہی وقت میں مصروف کار ہیں۔ لیکن ایک کو دوسری کے خبر نہیں ہے۔

اس صدی کے تیسرے ربع میں دہلی کی تحریک پنجاب میں پہنچ گئی ہے۔ اور مختلف نظموں میں ہم اس کا اثر دیکھتے ہیں۔ سب سے پیشتر جذبات میں اور زبان میں تبدیلی محسوس ہوتی ہے پرانے الفاظ اکثر متروک کر دیئے جاتے ہیں اور تکلف رفتہ رفتہ مذاق میں غالب آنے لگا ہے۔ قدیم سادگی برطرف ہو جاتی ہے اور طبائع میں میلان زیادہ تر تصنع کی طرف پیدا ہو گیا ہے۔ بحریں فارسی اختیار کی جاتی ہیں۔ اور ردیف وقافیہ کا التزام ضروری مان لیا جاتا ہے۔
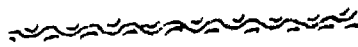
محمد جان

محمد جان حضرت غلام قادر کے مرید اور سالے ہیں۔ تصوف میں صاحب تصنیف اور فارسی و اردو میں شعر کہتے ہیں۔ یہی محمد جان مثنوی رمز العشق کے کاتب ہیں جس کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے۔ میں اپنے عزیز شاگرد سیّد ذکا، اللہ تھرڈ ایئر اسلامیہ کالج کا ممنون ہوں کہ انہوں نے چند اوراق محمد جان کی نظموں کے میرے لئے بہم پہنچائے۔

محمد جان سے پنجاب کی نظموں میں دہلی کا پرتو نظر آنے لگتا ہے۔ اور فارسی بحروں کا رواج ہو جاتا ہے۔ نمونہ کلام ؎

بلبل کی طرح دل کے جھجلانے کوں کیا کہیے ۔۔۔ زنجیر میں زلفوں کی پھنس جانے کوں کیا کہیے

رو رو کے عبث دل کے جلجانے کوں کیا کہیے ۔۔۔ بسمل ہو تڑپتا ہے مر جانے کوں کیا کہیے

کیا کام کیا دل نے دیوانے کوں کیا کہیے ۔۔۔ سر اپنے کوں ہر صبح پتھر سوں پٹکتا ہوں

کر یاد پیرو کی رو رو کے سسکتا ہوں ۔۔۔ دو نین دو دریا کر دن رین بھٹکتا ہوں

کیا کام کیا دل نے دیوانے کوں کیا کہیے ۔۔۔ کچھ کرنے ہو اسے یارو مجھ زار کی اب کاری

پلکوں کی خدنگوں سیں دلبر سے ہے ستمگاری ۔۔۔ دلبر کے جفا سیتی ہر وقت گھبرا ری

ہر صبح کا وہ رونا ہر شام کی یہ زاری ۔۔۔ کیا کام کیا دل نے دیوانے کوں کیا کہیے

کر یاد تیری صورت جی وارنے کرتا ہوں ۔۔۔ سر کاٹ کے گردن سوں تجھ پاؤں پہ دھرتا ہوں

تجھ تیغ تلے آکر دم ایک نہ بھرتا ہوں ۔۔۔ ہنستا ہوں خوشی سیتی پھر شوق سیں مرتا ہوں

کیا کام کیا دل نے دیوانے کوں کیا کہیے ۔۔۔ تجھ تیغ تلے کہہ تو سر اپنے کوں دھر دیجے

خونناب ہے آنکھوں کا ہر شام و سحر پیجے ۔۔۔ مرنا ہے لکھا سر پر کیا اور پہ دھر دیجے

قسمت موں لکھا ہوئے ہے دنیا موں سو بھر لیجے　　کیا کام کیا دل نے دیوانے کوں کیا کہیے
آ ذبح نہ کر ہم کوں ڈرا اپنے خدا سیتی　　کیا قتل غریبوں کوں کرتا ہے حیا سیتی
تن پر نئے ہی پڑتے ہے تجہ جور و جفا سیتی　　رو رو کے پر کھتا ہوں ہجراں کی بلا سیتی
کیا کام کیا دل نے دیوانے کوں کیا کہیے　　کیا پوچھتے ہو مجھ سیں غم یار کا کھاتا ہوں
کر لخت جگر اپناں آنکھوں سے بہاتا ہوں　　محبوب کے ہجراں میں دن رین لنگھاتا ہوں
گذرے ہے جو کچھ مجھ پر دلبر کوں سناتا ہوں　　سنتے ہوا رے یارو کچھ چشم مروت ہے
مرتا ہوں میں غم سیتی کچھ تجھ میں فتوت ہے　　خوں آنکھوں سیں جاری ہے کچھ مجھ میں نقوت ہے
کچھ میری کرو کاری کیا ایسی اخوت ہے　　کیا کام کیا دل نیں دیوانے کوں کیا کہیے
سنتا ہے محمد جان کیا گریہ و زاری ہے　　خاموش صفت ہوناں کیا بات پیاری ہے
وہ فضل کرے اپناں یہ بات نیاری ہے　　مغرور عبادت پر احسان شماری ہے
کیا کام کیا دل نے دیوانے کوں کیا کہیے

یہاں ایک نامعلوم شاعر کی غزل کے چند اشعار دیئے جاتے ہیں جن کے لئے گویا انشا اللہ خاں نے مصرع "بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے" لکھا ہے اس میں پہلا شعر بحر رجز میں۔ دوسرا رمل و رجز میں تیسرا رمل میں اور چوتھا رمل و رجز میں ہے۔ چنانچہ ؎

اس شمع رو کوں دیکھ کے دل جل کے دیوانہ ہوا　　تیری گرہ کا کیا گیا میں سب سیں بیگانہ ہوا
جے تجھے میوہ کی خواہش چل توڑینگے باغ میں　　تیری تو خاطر باغ میں انگور پیدا نہ ہوا
بیوفائی مت کرو لے لیئے صاحب جمال　　مثل مجنوں کے معاً سر مست دیوانہ ہوا
اے صنم تم مت نہ پوچھو بات میرے حال کی　　تیرے کناں کو دیکھ کر میں آپ فروانہ ہوا

اس نقص کے باوجود زبان میں بے حد اصلاح ہو گئی ہے۔

میاں احمد

غزل ذیل ایسی بیاض سے منقول ہے جو ۱۱۶۱ھ میں لکھی گئی ہے[5]

چوں شب گذشت صبح چرہی تب سمجھ پری — جاگن نہ ہوا ایک گھری تب سمجھ پری

جب مرگ کا پیالہ پیا آنکھ کھل گئی — جب کھاٹ پر چودیہ دھری تب سمجھ پری

تو شک نہالیوں سے مجھے فکر نا ہوا — جب ایٹ زیر سیس دھری تب سمجھ پری

جس وقت یار چھوڈ چلے ہم رہے نکو — منکر نکیر پوچھ دھری تب سمجھ پری

حساب کا جو وقت ہوا آنکھ کھل گئی — چیتی عمل کی آپ پر ہی تب سمجھ پری

عمر تمام گذر گئی عمل نا ہوا — جب عمر کی دو پہر ڈہلی تب سمجھ پری

احمد کوں (کذا) طرف کوئی نہیں جز خدا رسول
جب فضل پر امید دھری تب سمجھ پری

محمد

محمد بارہویں صدی کے منتصف دوم سے علاقہ رکھتے ہیں۔ مربع آیندہ انہی کا کلام ہے ؎

قربان خدا کے ہوں جس راہ دکھالا ہے
اور ہوش دیا مجھ کوں جس سیتی یہ بھالا ہے
محبوب مرا سند رسبہ جگ کا اوجالا ہے
اور عرش و فرش کے بیچ سب چیز سیں بالا ہے

دل اپنا میں خوں کر کر انکھوں سے بہاتا ہوں
اور خون جگر تا ئیں ہر آن میں کھاتا ہوں
فریاد و نغاں سیتی اک دھوم مچاتا ہوں
پھر یار نہ پوچھتا ہے یہ کونسا چالا ہے

آہوں سے مری بدری افلاک اوپر چھائی
سینے سے نکس آتش ہو برق عجب دہائی
نینوں سے برس بوندیں ہر نہر اچل آئی
اس عشق کی شورش کا کچھ راہ نرالا ہے

دن رات تڑپتا ہوں اس یار کی صورت کوں
آرام گیا مجھ سوں پوچھتا ہوں مہوت کوں
تا جاں سیں قدم کر کر جا یار کی مورت کوں
سر کاٹ دھردں آگے یہ طور سکھالا ہے

بن یار کے اب جینا دشوار نظر آوے
یا جان نکس جاوے یا اس کی خبر آوے
محبوب نہیں آتا کس طور صبر آوے
لاچار اگن لا کر جیو جان کو جالا ہے

اے شاہ مرے والی مرتا ہوں بنا تیرے
مجھ سار کے تجھ در پر کتنے ہی پڑے چیرے
الفت میں تیری برہن ہتی پاس مجھے گھیرے
پھر ہاتھ سیں گل لالے گر در پہ بہالا ہے

تم غوث جہاں کے ہو سکھ بخش تمہارا ہے
دکھیا ہوں پرا مرتا تجھ آگے پکارا ہے
دیدار دو اپنا تم ہجران سنے مارا ہے۔
نوکر ہوں تیرے در کا تیرا ہی سمبھالا ہے

تجھ طرف برا دیکھوں شاید کہ کرم ہووے
اس جلنے سیں چھٹ جاؤں دل جاں میری سکھ پاوے
دل ماتی سیں نکس آوے دکھ کو سبج دہووے
دنیا کے تعلق سوں یہ دیس نکالا ہے

یں کر توں محمد ایاس قصہ عجائب سوں — کس کیں نے کیا اور کا اس بابت غرائب سعں
پیر اپنے سبیں تعجا کر کر دور نوائب کوں — جن پیر کی صوت سوں یہ جگ کا اجالا ہے

(از بیاض پروفیسر آذر)

بُدھ سنگھ کا زمانہ بارہویں قرن ہجری کے نصف ثانی سے تعلق رکھتا ہے اس کی غزل ایسی بیاض سے نقل کی جاتی ہے جو ۱۱۸۱ھ سے قبل کی نوشتہ ہے وہو ہذا ؎

ڈھونڈا بہت سجن کو میں پایا نہیں ہنوز — ملیا رقیب سا تھ جو آیا نہیں ہنوز
از یک نگاہ ترچھی ہوا خاکسار دل — دامن کبھی اُوس کے ہاتھ لگایا نہیں ہنوز
شمشیر چشم کھینچ ڈراتے ہو کیا سجن — سر مہ کے سنگ سیں آپ دایا نہیں ہنوز
اس زلف پیچدار کیا پیچ پیچ دل ٭ — مار سیہ کوں ہاتھ لگایا نہیں ہنوز
بدھ سنگھ نہ ہو تو بیدل از اغماض نیم لب — گر ہے جواب صاف خط آیا نہیں ہنوز

بارہویں صدی کے ایک پنجابی سکھ سے اس سے بہتر نمونۂ شاعری کی توقع کرنا غالباً ہماری زیادتی ہوگی ۔
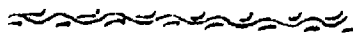
خفیہ بیگم

ایک دلچسپ پہلو اس عہد کا یہ ہے کہ عورتیں بھی اُردو میں شاعری کرنے لگی ہیں۔ ان میں خفیہ بیگم خفیہ تخلص والدۂ میر صابر ہیں۔ ذیل کی غزل انہیں کی یادگار ہے ؎

اتنا سخن ہے دل میں سمائی ہوجاویگی — جہاں منہ سے بات نکسی[1] پرائی ہوجاویگی

اب پھول سے جدا نہ کرو عندلیب کوں — فصل خزاں میں آپ جدائی ہوجاویگی

اس آرسی سے دور کرو زنگ کینہ کا — تب تو دلوں میں آکے صفائی ہوجاویگی

یا تو فغاں کریگی مری کوچہ اس سے اثر — یا آہ میری تیر ہوائی ہوجاویگی

میرے بلانے سے ترا کوچھ گھٹ نہ جاویگا — پر عاشقاں میں میری بڑائی ہوجاویگی

میرا خیال لوگوں نے پکڑا ہے آکے کیوں — ناحق کسی سوں میری لڑائی ہوجاویگی

اس دعویٰ میں تو خفیہ خدا کوں کھو نہ عبث میں

اس کی طرف تو ساری خدائی ہوجاویگی۔

---
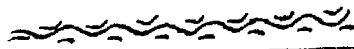
[1] ایک دن سودا کے ہاں میر سوز تشریف لائے۔ ان دنوں شیخ علی حزیں کی ایک غزل کا چرچا تھا جس کا یہ مطلع ہے ؎ میگر فتیم بجا تا سر راہے گاہے ❊ او ہم از لطف نہاں داشت نگاہے گاہے
میر سوز مرحوم نے اپنا مطلع پڑھا ؎ نہیں نکسے ہے مرے دل کی اپاہے گاہے ❊ اے فلک بہر خدا رخصت آہے گاہے ❊ مرزا سن کر بولے کہ میر صاحب بچپن میں ہمارے ہاں پشور کی ڈومنیاں آیا کرتی تھیں یا تو جب یہ لفظ سنا تھا۔ یا آج سنا ہے۔ میر سوز بیچارے ہنس کر چپکے ہو رہے ❊

(آبحیات)

میر صابر

میر صابر نے اس کا جواب دیا ؎

کب جانتے تھے تجھ سیں جدائی ہو جاویگی غم کی منادی دوکھ کی دوہائی ہو جاویگی
ہونے دے مجھ اپنا تصدق اب ایک بار کوچھ اس تھیں سوا پیارے تیری بھلائی ہو جاویگی
گر سینہ صاف ہو کھلے پنداں گلے لگو اتنے میں دل کی کامروائی ہو جاویگی
ابرو کی چین دور کر آخر سنو گے تم یہ ترشی ایک روز مٹھائی ہو جاویگی
دیکھو نگاہ قہر سوں آوے اگر رقیب اوس بیحیا کوں چشم نمائی ہو جاویگی
صابر یہ بات جس نے کہی آفریں اوسے جہاں منہ سی بات نکسی پرائی ہو جاویگی

مخمس ذیل بھی اسی عہد کا معلوم ہوتا ہے ؎

بات پر خوف ٹھگ لگا ہیگا راہ میں چور کا دباہیگا رین اندھار موں دغا ہیگا
یہ تجھے سونا خطا ہیگا جاگیو جاگنا بھلا ہیگا

جاگتے پر نہیں پڑے کوئی چور جاگتے پر نہیں کرے کوئی زور جاگنے کا نفع جو ہیگا زور
جاگنا خوب ہے خصوصاً بھور جاگیو جاگنا بھلا ہیگا

اے بٹاؤ تو بھے نہیں سونا سوتا پونجی ہاتھ سوں کھوتا پونجی پھر نا رہا ہاتھ میں ہوتا
بینجر اس سرا موں نہیں سونا جاگیو جاگنا بھلا ہیگا

اے مسافر تجھے ہی جانا دور ماندہ ہو کر تھکا ہیں چکنا چور اس سرا بیچ توں نہ ہو مغرور
نیند کے ہاتھ مارے گئے ہیں سو جاگیو جاگنا بھلا ہیگا

کون اس ٹھانو ہیں ہا ٹھیرا ڈاکہ ہے ہاتھ موں ذرا ٹھہرا پاہرو پر نہ بھول وہ لہیرا
پاہرو نہ دے ست اپنا گھیرا جاگیو جاگنا بھلا ہیگا

تیں جو کوچھ کرنا ہے سو کرلے آج　　پھر نہ لہراوے گا یہ تیرا راج　　اولٹ ماریں گے تیرے سرسوں تاج
اس وقت کیا رہیگا تیرا لاج　　جاگیو جاگنا بھلا ہیگا

کوچھ سمجھ بوجھ اے بیبر ناداں　　اپنی غفلت سوں تو نہ ہو شاداں　　رات کوں سنتا ہیں تو لپنے کان
دمبدم بولتے ہیں گشتی بان　　جاگیو جاگنا بھلا ہیگا

ساتھ تیرے رہیں فرشتے دو　　نیک و بد کرتا ہیں سو لکھیں او　　قبر میں پوچھوں گے فرشتے دو
اس وقت کیا جواب دیگا او　　جاگیو جاگنا بھلا ہیگا

رحمن

اگر مجھ باغ میں دیکھے تو بلبل در چمن لرزے　　میرے غم کی اگن سن کر سو دو زخ کی اگن لرزے
جنیو پہن کر گل میں کروں پھر بت پرستی میں　　مرا تا بیت کفر دیکھ کر یکبارگی برہمن لرزے
اگر مجنوں کی تربت پر گذر جا ؤں دیوانہ ہو　　جو میرے حال کو دیکھے تو مجنوں در کفن لرزے

اگر رحمن کہیں جگ میں سخن خوبی نزاکت سوں
عجب کیا ہے غزل سن کر اگر سارا دکن لرزے

(از بیاض پروفیسر آذر)

نعمت اللہ

جس دل میں ہے غم یار کا عشرت کے تیئں کہہ کیا کرے — جو تشنہ لب دیدار کا شربت کے تیئں کہہ کیا کرے
جو عشق کی آتش میں جل طالب ہوا دیدار کا — دوزخ سیں وہ ڈرتا نہیں جنت کے تیئں کہہ کیا کرے
جو عشق کے بازار میں بدنام اور رسوا ہوا — طالب نہیں وہ نام کا عزت کے تیئں کہہ کیا کرے
اسباب دنیا ترک کر جو بے سر و ساماں ہوا — حاجت اوسے کیا مال کی دولت کے تیئں کہہ کیا کرے
لقمان و افلاطوں جیسے دنیا سیتی جاتے رہے — دارو نہیں کو چہ موت کا حکمت کے تیئں کہہ کیا کرے

جب عشق خوباں ازازل ہے نعمت اللہ کو نصیب
تقدیر پھیرے کس طرح قسمت کے تیئں کہہ کیا کرے

(از بیاض پروفیسر آذر)

بارہویں قرن کا ربع آخر پنجاب میں بے شمار شعرا دیکھتا ہے۔ جو کثرت کے ساتھ اردو میں شاعری کرتے ہیں۔ زبان صاف ہو جاتی ہے۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ ان کے کلام میں اور ہندوستانیوں کے کلام میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس عہد کے شعرا میں ان لوگوں کا شمار ہونا چاہیئے۔ نامدار خاں دت محمد غوث بٹالوی۔ دلشاد پرسروری (پسروری) خوش دل۔ فدوی۔ شاہ مراد رام کشن وارث شاہ وغیرہ لیکن سب سے پیشتر بعض ایسی نظموں کا ذکر کیا جاتا ہے جو سکھوں کی تاریخ سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ اور ان کی تاریخ تصنیف ہم کو معلوم ہے۔
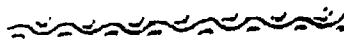
نامدار خان دت[1]

رنجیت سنگھ کا دادا چڑت سنگھ سکر چکیا مثل کا بانی ہے۔ جو امیر سنگھ کی بیٹی سے شادی کر کے بہت طاقتور ہو گیا۔ ابتدا میں اُس نے ایمن آباد کے مغل فوجدار کو قتل کر کے شہر کو لوٹ لیا۔ ۱۷۶۲ء میں اس نے گوجرانوالہ میں ایک قلعہ تعمیر کیا۔ جس پر حاکم لاہور نے اس کی بڑھتی طاقت کو پست کرنے کے لئے اس پر چڑھائی کی۔ لیکن چڑت سنگھ اور اس کے اتحادی جان توڑ کر لڑے اور حاکم کو شکست دی۔ اس فتح نے چڑت سنگھ کے حوصلوں کو اور بھی بلند کر دیا ۱۷۶۲ء میں احمد شاہ کے ہندوستان آنے پر چڑت سنگھ نے اپنے اہل و عیال کو جموں بھیجدیا۔ اور آپ افغانی فوجوں کے دائیں بائیں لگا رہا۔ احمد شاہ کی واپسی

---

[1] دت موہیال برہمنوں کی ایک شاخ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بھاردواج رشی کا لڑکا دان سے متنفر تھا اور اپنی محنت اور زورِ بازو سے کما کر کھانا چاہتا تھا۔ جب افلاس سے مجبور ہوا تو اُس نے سپہ گری سیکھی اور اس فن میں ماہر ہو گیا۔ اس کا نام درون اچارج تھا۔ یہی بعد میں کوروں اور پانڈوؤں کا اتالیق مقرر ہوا اور مہا بھارت کی جنگ میں سپہ سالار تھا۔ درون اچارج کی اولاد نے سپہ گری کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ چنانچہ دت بھی اسی کی اولاد میں محسوب ہیں۔ یہ لوگ بہادری اور سخاوت میں مشہور ہیں اور خیرات لینے کے بجائے خیرات دیتے ہیں۔ چنانچہ "دت دلتے دان کے پورے + اللہ کے سخی تیغ کے سورے" ٭ کئی دت حسینی کہلاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت امام حسین کی مدد پر دشمنوں سے لڑتے رہے۔ کہتے ہیں کہ ملک عرب میں بھی ان کا راج تھا۔ راہب ؟ جو عرب کے تخت پر بیٹھا دت تھا۔ بعض ایسے واقعات کی بنا پر کہا جاتا ہے:۔ دت سلطان آدھے ہندو آدھے مسلمان (گلشن موہیال از گوری شنکر) یہ اطلاع مسٹر کنہیا لال ایم۔ اے نے بہم پہنچائی ہے

کے بعد چڑت سنگھ نے وزیر آباد کو لوٹ لیا۔ اور وہاں کے مغل فوجدار کو نکال کر خود شہر پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد احمد آباد پر قبضہ کر لیا۔ روہتاس اُس نے نورالدین خاں بامیزئی سے چھین کر دھنی۔ چکوال۔ جلالپور۔ پنڈ دادخاں پر قبضہ کر لیا۔ صاحب خاں عامل پنڈ دادخاں نے بھاری رقم دے کر اپنی جان بچائی ۱۷۷۴ء ۱۱۸۸ھ کے قریب جموں کا راجا رنجیت دیو اپنے فرزند اور ولی عہد برج راج سے سخت ناراض تھا۔ اور چاہتا تھا کہ برج راج دیو کے بجائے اپنے دوسرے فرزند دلیل سنگھ کو ولیعہد بنا دے۔ برج راج دیو نے چڑت سنگھ کو اپنی امداد کے لئے بلایا چڑت سنگھ حقیقت سنگھ اور جے سنگھ (کنہیہ مثل) کے ساتھ مل کر ۱۷۷۴ء ۱۱۸۸ھ میں ایک بڑی فوج کے ساتھ جموں کی طرف روانہ ہوا۔ رنجیت دیو نے مقابلے کے لئے چمبہ، کانگڑہ، نورپور، بسیہر سے اور بھنگی مثل سے امداد منگوائی۔ بسنتی ندی کے قریب مقابلہ ہوا اور ایک غیر فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ جس میں اتفاق سے چڑت سنگھ اس کے کسی ہمراہی کی بندوق کے پھٹنے سے ہلاک[1] ہو جاتا ہے۔ اس وقت نامدار خاں دت چڑت سنگھ کا مرثیہ لکھتا ہے:۔

افسوس ہے جہاں کے ثبات اور قرار پر　　اس باغ بے وفا کی خزاں اور بہار پر
اس پیرزال عروس نما کے نگار پر　　دو دن کی زندگانی بے اعتبار پر
دلبستگی نہ کر دم بے اعتبار پر

احوال چڑت سنگھ کا لکھتا ہوں فی المثل　　پہونچا جب اس کا حکم قضا سیں دم اجل
آیا ولایت اپنی سے لیکر ہجوم دل　　فرصت نہ دی قضا نے چلا چل ہیں ایک پل
آیا اجل کا شیر ہرن کے شکار پر

آیا ہجوم فوج سیتی کر کے اضطراب　　جموں صبحدم جلال سوں چڑھتا ہے آفتاب

---

[1] تاریخ پنجاب (انگریزی)، از سید محمد لطیف۔

تنہا ہو اپنی فوج سوں لیا کر جنگ پر شتاب ہنگامہ ہجوم مخالف نہ کر حساب

یکبارگی دلیر چلا کارزار پر

دل موں غرور اپنی شجاعت کا دھر چلا گویا کہ رخصت اپنے رفیقوں کو کر چلا
تقدیر کے حساب سینی گرچہ مر چلا لیکن خیال مرگ سیتی بے خبر چلا

پوچھا نہ کچھ جو کھیل ہے ہم کے شمار پر

جب دھر سوں توپ ہنگامہ چلنی تھی بے شمار آیا اسی طرف سے صدا کرتا مار مار
تھی ہاتھ میں تفنگ ولایت کی برق وار کر جا گی کوں چاک پیالہ پڑی شرار

کندھے سوں نکل جلد گئی سر کو مار کر

اوڑ کر لگی تفنگ کی چھپر دماغ میں جوں تند بادیوں کا جھٹکا چراغ میں
تھا منتظر نہنگ اجل کا سراغ میں عالم کے دلموں داغ لگا اور داغ میں

افسوس ایسے مرد کا مرنا دیار پر

تیری قضا سوں چیتر بند وتن تیز تھا یک لخت دور کا سہ سر ریزہ ریز تھا
ہر سو صدا ے کوچ دم شبنم خیز تھا وہو دن نہ تھا جہان کو مگر رستخیز تھا

عالم کے دلموں داغ لگا یادگار پر

دنیا میں چند روزہ جچھے ہے زندگی مراد اس مرد کو بخوبی و نیکی کریں گے یاد
دنیا میں نیک نام تھا عقبیٰ میں ہے و شاد لکھتا ہوں مجمل اس کی تاسف کا یاد دو

تقریبات فرض تھی یہ نامدار پر

(از بیاض پروفیسر آذر)

یہ نظم اس کی معاصر نظموں سے جو دہلی اور لکھنؤ میں ان ایام میں لکھی جا رہی تھیں۔ زبان کے لحاظ سے کم نہیں ہے۔ بیان حقیقت اور جذبات کی ادائیگی میں انتہا درجہ کی سادگی سے کام لیا گیا ہے۔ اور مبالغہ نام کو بھی نہیں۔ واقعات

ایسے پیرایہ میں ادا ہوئے ہیں جو بالکل قدرتی اور فطرتی ہیں۔ ذرا مصرع "جوں صبحدم جلال سوں چڑھتا ہے آفتاب" پر غور کرو۔ بعض الفاظ ایسے ہیں جن سے مصنف کے پنجابی ہونے کا سراغ چلتا ہے۔ مثلاً جھنکا بجائے جھونکا چیڑ بمعنے ریزہ وکرچ ٭

تاریخ کے برخلاف نامدار خاں کا بیان ہے کہ یہ خود چڑت سنگھ کی بندوق تھی جو پھٹی۔ اور خود چڑت سنگھ کے ہاتھ میں پھٹی۔ یعنی کوئی چنگاری جا گی سے اڑ کر بندوق کی پیالی میں (ٹوپی کے استعمال سے پہلے اس کی بجائے بندوق کی نال میں ایک سوراخ ہوا کرتا تھا جس سے بارود کا تعلق باہر سے کوٹھی کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ یہ سوراخ جو باہر کی طرف سے پیالی کی شکل کا ہوتا تھا پیالی کہلاتا تھا۔ جاگی یعنی بتی کے ذریعہ سے پیالی کی بارود آگ لیتی تھی۔ اور کوٹھی کے بارود کو مشتعل کر دیتی تھی جس سے بندوق چلتی تھی) اتفاقیہ گر گئی۔ چڑت سنگھ نے بندوق پھینک دی۔ اور اس کی بعض کرچیں اچھل کر اس کے سر میں لگیں۔ جس سے اس کا سر پاش پاش ہو گیا۔ ہمیں اس بیان کو چڑت سنگھ کے وفات کے سلسلہ میں زیادہ صحیح تسلیم کرنا چاہیئے ٭

محمد غوث بٹالوی

سکھوں کی کنہیہ مثل کا بانی جے سنگھ ہے۔ یہ موضع کانھ کا جو لاہور سے پندرہ میل جنوب میں واقع ہے باشندہ تھا۔ ۱۷۶۳ء میں احمد شاہ ابدالی کی پنجاب سے واپسی کے بعد جے سنگھ نے قصور پر حملہ کیا اور ایک ماہ کے محاصرہ کے بعد اس پر قابض ہو گیا۔ جے سنگھ سرہند کی اس جنگ میں بھی شامل تھا جس میں زین خاں مارا جاتا ہے۔ اس کے بعد جے سنگھ ایز دبخش رئیس گھرو ٹہ کو ایک سخت جنگ کے بعد اپنا مطیع کر لیتا ہے۔ نور پور، دتار پور اور سیپہ کے رؤسا اس کے باجگزار بنجاتے ہیں۔ کمبریہ کو بہت جلد تسخیر کر لیتا ہے۔ بعد میں سنسار چند والی کٹوچ کی امداد کیلئے جو کانگڑہ کا دعویدار تھا روانہ ہوتا ہے اور فتح کرکے خود قابض ہو جاتا ہے۔ قصور پر سخت جنگ کے بعد دوبارہ قابض ہوتا ہے مگر نظام الدین خاں پھر اس پر قبضہ کر لیتا ہے۔ بٹالہ اور کلانور پر رام گڑھیا مثل والوں کا قبضہ تھا۔ جے سنگھ نے جسا سنگھ رام گڑھیہ کو ستلج پار نکال کر ان مقامات پر بھی قبضہ کر لیا۔ لیکن جے سنگھ نے مسلمانان بٹالہ کو سخت اذیتیں پہونچائیں۔ شرفا کو لوٹ لیا اور ان کے مکانات جلا دئے۔ حضرت شیخ غلام غوث بٹالوی (متوفی ۱۱۹۰ھ) کو جو حضرت شیخ غلام قادر کے فرزند اور جانشین تھے قید کر دیا اور ان کا اثاث البیت تک لوٹ لیا۔ اسی سلسلہ میں ان کا بے نظیر کتب خانہ لوٹ لیا گیا۔ مصنف تذکرۃ الابرار اس کے متعلق لکھتا ہے:۔

تا آنکہ قدم درمیدان وقاحت گذاشتہ دست تعدی بر اماکن و مساکن

آنحضرت دراز کردہ متاع واشیا و مواد و اسباب لزومی وجمیع اثاث
البیت بغارت بردند خصوصاً جواہر نایاب کتب کہ از تو ادر روزگار وعجائب
عالم بہر ود دہورو چندیں مساعی جمیلہ وانواع ترددات جمع آمدہ شب و
روز در مدرسۂ شریفہ مستعمل طلاب بود بدست آں جہال افتاد کہ
کتاب را از کباب واسباب را از اسباب فرق نمی کردند ؎"

سنہ ۱۱۹۸ھ / ۱۷۸۴ء میں سنسار چند والی کٹوچ نے جسا سنگھ رام گڑھیہ اور مہا سنگھ
پسر چڑت سنگھ نے باتفاق ہمدیگر جے سنگھ پر چڑھائی کی اور موضع اچل
کے پاس بٹالہ سے آٹھ میل کے فاصلہ فریقین میں جنگ ہوئی۔ جے سنگھ
کی فوجیں اس کے فرزند گوربخش کے زیر کمان تھیں۔ گوربخش بڑی بہادری
سے لڑا۔ لیکن موت کا کیا علاج۔ قضاء کار ایک تیر اس کے سینہ پر آکر لگا
جس نے عین میدان جنگ میں اس کا کام تمام کر دیا۔ سپہ سالار کی موت نے
جنگ کا فیصلہ کر دیا اور جے سنگھ کو شکست مل گئی۔ بوڑھا جے سنگھ اپنے نوجوان
اکلوتے بیٹے کی وفات دیکھ کر بالکل بد دل ہو گیا۔ اس نے تیر و ترکش پھینک
دیئے۔ گھوڑے سے اترا اور زار و قطار روتا ہوا دشمن کی گولیوں کی زد میں
جا کھڑا ہوا۔ غنیم اس بڈھے جنگ آزما کی نوحہ زنیوں سے بے حد متاثر ہوا
اور کسی نے اس پر حملہ نہیں کیا ؎

گوربخش سنگھ کی وفات کے موقعہ پر بٹالہ کا ایک شاعر محمد غوث جو بٹالہ
کی کچہری میں گوربخش سنگھ کی فوجداری میں ملازم تھا۔ اس کا مرثیہ لکھتا ہے
مرثیہ چونکہ دراز ہے۔ اس لئے یہاں صرف چند اشعار پر قناعت کیجاتی ہے[۵]

بہار اندر آیا تھا باغ جہاں — قضا سوں پڑی جھول باد خزاں
گرا آہ پاؤں سے سرو رواں — پڑا ہر طرف میں یہ شور و فغاں

کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں   کدھر موتیاں والا ہے نوجواں ؎
ہویلہے یہ ماتم سوں غم بے شمار   جگت اس مصیبت سوں ہے بیقرار
سر اپنے پہ غم سوں اٹھا خاک ڈار   تاسف سوں کہتے ہیں سب شہردار
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلوان   کدھر موتیاں والا ہے نوجواں
بری ساعت اندر کیا اس نے جنگ   ہویا قافیہ زندگانی کا تنگ
چھوٹی غیب سے گولۂ از تفنگ ؎   لگی پہلو پر آ چو تیر خدنگ ؎
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں   کدھر موتیاں والا ہے نوجواں
کیا اس قدر رن میں جا کارزار   کہ دشمن ہویا بھاگنے کوں تیار
بحکم قضا کار پروردگار   یہ حکمت ہویا پڑ گئی یہ پکار ؎
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں   کدھر موتیاں والا ہے نوجواں
ہویا گل ہے جی سنگھ جی کا چراغ   خزاں اندر آیا جو انیکا باغ ؎
مٹایا گوروں نے خوشی کا چراغ   جگر موں لگیا غم کا ہر یک کوں داغ
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں   کدھر موتیاں والا ہے نوجواں
پڑا شور ماتم کا ہر سُو بسُو   زمانہ موں ہوتی ہے یہ گفتگو
نہ جیتا رکھا سنگھ کو ست گرو   نہ پوری ہوئی اس کی کچھ آرزو
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں   کدھر موتیاں والا ہے نوجواں
ہویا درد سوں چاند سورج سیاہ   سیاہ پوش بیٹھے ہیں فوج و سپاہ
رضا ہے خداوند کی واہ واہ   پڑے لوگ روتے ہیں سب دردخواہ
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں   کدھر موتیاں والا ہے نوجواں
لکھا ہے نوشتہ موں یہ ابتدا   کہاں رہ سکے ہے قضا سے خدا
سبر افسوس اندر ہے شاہ و گدا   ستم یہ ہویا ہے نہایت بڑا ؎

کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں — کدھر موتیاں والا ہے نوجواں ؎
رہا یونہی سب ملک کا بندوبست — اجل نے دہی ہار آئی شکست
لکھا تھا خدا نے یہ روز الست — کر افسوس جے سنگھ ملتا ہے دست
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں — کدھر موتیاں والا ہے نوجواں
دلاور جوانمرد وہ شیر تن ؎ — چاکھاکوں اٹھا جابنا یا وطن
جوانی کے جوبن کا تھا وہ رتن — نچھوڑا اجل نے کئے سوجتن
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں — کدھر موتیاں والا ہے نوجواں
خزینے دفینے پڑے ہی رہے — دوشالا اور لاچی دھرے ہی رہے
طویلہ میں گھوڑے کھڑے ہی رہے — شتر بار زر کے گڑے ہی رہے
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں — کدھر موتیاں والا ہے نوجواں
یہ کیسا ہوا ہے ستم سخت آہ — بٹالہ کے سر سوں گیا بادشاہ
اسی درد سوں رات دن ہے سیاہ — زنکارست گور کئے اپنی چاہ

کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں
کدھر موتیاں والا ہے نوجواں

(از بیاض پروفیسر آذر)

اس نظم کو بھی گوربخش سنگھ کے واقعۂ وفات کے متعلق موجودہ تاریخ سے اختلاف ہے۔ یعنی بقول محمد غوث وہ گولی سے مارا جاتا ہے جو اس کے پہلو میں لگتی ہے۔ تاریخ کا بیان ہے کہ اس کے سینہ پر تیر لگا تھا۔ مَیں غوث کے بیان کو ترجیح دونگا۔ کیونکہ یہ مرثیہ گوربخش سنگھ کی وفات کے عین بعد لکھا گیا ہے ؞

غزل آیندہ بھی محمد غوث کی ملک ہے ؎

گر میرے یار کوں خدا لیا وے ناتواں شکر حق بجا لیا وے
دل ترفتا ہے میرا اس کے سوا قاصد اُس کوں شتاب جا لیا وے
اپنے آنے سوں گر کرے کچھ عذر دستخط اُس کا پھر لکھا لیا وے
گر وہ آزردہ ہووے مجھ سیتی کر کے منت اوسے منا لیا وے
ایسا ہووے جو کوئی مجکوں بھی پاس دلبر کے جا ملا لیا وے
یا سجن میرے کوں بہر عنواں جس طرح جانے وہ رجھا لیا وے
ہور ہاں میں غلام غوث اوس کا
جو کوئی یار کوں بلا لیا وے
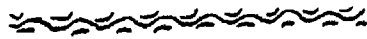
دِل محمّد دلشاد پسروری

اُردو کے علاوہ فارسی کے زبردست شاعر ہیں۔ پورا نصف دوم قرن دوازدہم ان کا زمانہ ہے۔ نام دل محمد تھے چنانچہ دیوان ؎

دل محمد بدہر نامم کنی گر از لطف شاد کامم بنام دلشاد سربر آرم دل محمد خوش از تو بادا

دیگر ؎

شاد آں کہ دل محمد اسمش با دل شاد از اں تخلص ماست

پرسرور (پرسرام پور) جس کو آج کل پسرور کہا جاتا ہے وطن تھے۔ اور دیوان اس عقیدہ کی کافی تائید کرتا ہے چنانچہ ؎

خوش آنوطن بحلاوت ملاحت آباداں ست جہان غیب شہادت نظیر ہر دو جہاں ست

اگر تو ذائقہ آب پرسرور چشی ملاحتش بدروں حلاوتش پنہاں ست

ولایتے نمکیں اندروں بروں شیریں عجب مدار کہ شہر عجائب البلداں ست

یکے دروست عجب تال آب شش پہلو بشش جہات بہ پنجاب گو کہ ثانی آں ست

دلیل شادی دلشاد نام ایں شہر است کہ پرسرور طرب بخش عالم دل و جاں ست

تعلیم کے لحاظ سے جن کیا لاکھے وہ مدعی ہیں۔ اس شعر میں درج ہیں ؎

از علم و شعر و تاریخ فقہ و سلوک و اخلاق

دارد تمام لیکن دلشاد زر ندارد

یعنے فقہ تصوّف ۔ اخلاق ۔ تاریخ اور شعر میں ماہر تھے۔

دلشاد ایک ایسے دور انقلاب میں گذرے ہیں۔ جو پنجاب کی تاریخ کا تاریک ترین ورق ہے۔ مغلیہ سلطنت اپنے تنزل کے آخری مراحل طے کر رہی

ہے۔ نادر کے بعد احمد شاہ ابدالی نے اپنے مشہور حملے شروع کر دیے ہیں۔ اور سکھ جماعت غارت و رہزنی میں مصروف ہے قتل و خونریزی کا بازار چارسو گرم ہے۔ علم و فضل کا چرچا چھوٹ گیا ہے۔ جہالت اور تاریکی ملک پر چھائی ہوئی ہے۔ پنجاب کے اس دور ظلمت کے ساتھ ساتھ دلشاد کی شاعری کا زمانہ بھی متوازی گامزن ہے۔ دوسرے الفاظ میں بارھویں صدی کے نصف دوم کے تمام واقعات ان کی آنکھوں کے سامنے ہوئے ہیں۔ اور ان واقعات عصری کی جھلک اُن کے کلام میں موجود ہے۔ کبھی وہ افغانوں کے ہاتھ سے نالاں ہیں اور کبھی سکھوں کے مظالم پر لعنت بھیج رہے ہیں۔ مصیبت اور بدحالی میں قاعدہ ہے کہ انسان کو خدا بہت یاد آتا ہے۔ مذہب سے قریبی لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اولیاؤں اور مشائخ سے لَو لگائی جاتی ہے۔ یہی کیفیت دلشاد کے قلب کی ہے۔ کبھی رسول عربی کی خدمت میں اپنی فریاد بھیجتے ہیں۔ حضرت علی رض سے استغاثہ کرتے ہیں۔ کبھی مہدی آخر الزمان کو بلاتے ہیں کبھی حضرت عیسیٰ کو پکارتے ہیں۔ اور کبھی غوث الاعظم سے ملتجی ہیں مثلاً کہتے ہیں ؎

غم ہجوم آورد ما را یا رسول اللہ اغث
درچنیں وقتے خدا را یا رسول اللہ اغث

دیگر ؎

غلوی کردہ سکان شیر حق کجا رفتی؟ بہ پنجہ از سر پرشور شاں دمار برآر؟
زہندیان سحر ملک ما بشام رسید تو از نیام بہ پنجاب ذوالفقار برآر

دیگر ؎

امام مہدی آخر زماں بیا وقت ست ندانم از تو شود کے ظہور یا قسمت

دیگر ؎

بقرست مهدی پے خویش تا کفر را نشاند   از حد گذشت اکنوں میعاد یا محمدؐ
دیگر ؎
دیں را چو محی وثیت احیا کند بہ پنجاب   ہاں عیسی زماں را ارشاد یا محمدؐ
دیگر ؎
غم شد دو چار من دگر یا غوث اعظم الغیاث   خوں میرود زیں چشم تر یا غوث اعظم الغیاث

اس صدی میں غوث الاعظم کی ایک غیر معمولی مقبولیت کا راز پنجاب کے ان سیاسی اثرات کے پر تو میں مفہوم ہو سکتا ہے جن کے تاریک بادل اس ملک کی فضا کو گھیرے ہوئے تھے۔ اس سے پیشتر متعدد نظمیں ایسی نقل ہو چکی ہیں جو بالخصوص غوث الاعظم کی شان میں ہیں۔ جب ہم دلشاد کی آواز فریاد اس طرح بلند ہوتی دیکھتے ہیں تو قیاس کر سکتے ہیں کہ پنجاب پر ان ایام میں کیا قیامت گذرتی ہوگی۔ مذہباً اگرچہ سنت جماعت ہیں۔ لیکن حبّ علیؓ سے بھی غافل نہیں ہیں۔ محرم میں وہ ماتم حسین زندہ کرتے ہیں۔ ان کی کئی نظمیں شاہد ہیں پنجتن پاک سے بھی عقیدت ہے ؎

ذکر مدح پنج تن داریم ورد پنج وقت   در مخمس گوئی اے دلشاد ناچاریم ما ؎
دیگر ؎

ہیچو دلشاد از ولائے پنج تن ؎   والئے اقلیم پنجابیم ما

پنجاب اور پنج تن کی رعایت میں کئی اشعار لکھے ہیں۔ لیکن یہ شعر نہایت عجیب ہے ؎

پنجابیئے کہ نیست درو حب پنج تن   پنجابیست غیر بد زمیست زیں دیار

اپنے وطن سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ ذیل کے ابیات ملاحظہ ہوں ان سے کس قدر محبت ٹپک رہی ہے! امام برخوردار کے بیحد معتقد ہیں ؎

شہر ما پر سرور میگویند — کان علم و شعور میگویند
اہل اخیار ہند تا بخش — اول از لاہور میگویند
شاہ فیاضے دو تا لابش — مردم و مرغ و مور میگویند
حسن ہر خانہ اش ہمی بینند — شہر حور و قصور میگویند
تیغ مردانش بہ بد خواہاں — مزۂ آب شور میگویند
از مزار امام برخوردار — طرفہ بزم حضور میگویند
خاک و دانہ اش ہمی بینند — سرمۂ کوہ طور میگویند
زین ولایت کجا رود دلشاد — شہر دہلی است دور میگویند

تاریخی لحاظ سے دیکھتے ہوئے ان کے ہاں سب سے پہلی تلمیح دہلی کے قتل عام کی طرف ہے جو ۱۱۵۱ھ / ۱۷۳۸ء میں ہوتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

قتل عام ست در جہاں آباد — آخر ایں غمزۂ تو نادر نیست

دوسری تلمیح نواب یحییٰ خاں اور قتل رائے جسپت رائے دیوان لاہور کے متعلق ہے ؎

در جہاں گر ہمسر اسکندر و خاقاں شود — از شجاعت تابع نواب یحییٰ خاں شود
گر مخالف ہمچو عکس آئینۂ نواب را — میشود شخصے مقابل صورت بیجاں شود
انتقام قاتلاں رائے جسپت رائے را — آید از تیغ تو در پنجاب گر عریاں شود

زکریا خاں کی وفات پر کچھ عرصہ کے بعد یحییٰ خاں ان کا خلف اکبر صوبیدار لاہور بنا دیا گیا۔ سکھوں کی ایک جماعت ایمن آباد کے مویشی پکڑ کر لے گئی۔ ان کی سزا دہی کیلئے رائے جسپت رائے دیوان لاہور بھیجے گئے۔ سکھوں نے شاہی فوج کا مقابلہ کیا۔ اور دیوان جسپت رائے معرکہ میں مارے گئے۔ صوبیدار یحییٰ خاں کو اس پر طیش آیا۔ اور اس نے اپنے وزیر لکھپت رائے کو ایک بڑی فوج کے ساتھ ان کی سرکوبی کے لئے تعین کیا۔ وزیر نے سکھوں کو بڑی تعداد میں قتل کیا۔ اور ایک ہزار کے قریب قیدی گرفتار کر کے لایا جو ۱۱۵۹ھ / ۱۷۴۶ء میں لاہور میں قتل کئے گئے۔

۱۱۶۲ھ / ۱۷۴۸ء میں میر منو صوبیدار لاہور چار محال (ایمن آباد، پسرور، گجرات، سیالکوٹ

اور اورنگ آباد) بروئے معاہدہ احمد شاہ ابدالی کے حوالہ کر دیتا ہے اور شاہ ان محال کا صوبہ دار بلند خاں سدوزئی کو مقرر کرتا ہے۔ دلشاد اس بلند خاں کے خیر مقدم میں لکھتے ہیں ؎

خبر زعالم بالاست قمریاں بچمن ۔ بلند خاں چو سہی سرو صوبہ دار رسید
زمین مقدم نواب منعم الدولہ ۔ بہار را دگر آب بروئے کار رسید
ہزار شکر خدا کآب رفتۂ پنجاب ۔ دگر زمین قدمش بجو بیار رسید
نظام چار محال تو حق کند دلشاد ۔ سحر بگوشش بشارت ز چار یار رسید

اِس عہد کے قبل یا بعد رنجیت دیو والی جموں جو ۱۱۹۶ھ / ۱۷۸۲ء میں ستاون سال راج کر کے فوت ہوتا ہے۔ پسرور پر قبضہ کر لیتا ہے۔ اِس سلسلہ میں دلشاد کی آمد و رفت جموں میں بھی ہو جاتی ہے۔ جموں میں ان ایام میں مسلمانوں پر سخت مظالم توڑے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کو اذان دینے تک کی اجازت نہیں ہے چنانچہ ؎

بسکہ منعست دریں شہر اذان جمعہ ۔ نکند گوش کسے نالۂ بیکاراں را
گریہ را نیست اثر در دل راجہ جموں ۔ سبزہ بر سنگ ندید چہ کند باراں را
موذیاں کردہ ہجوم اے شہ دولہ فریاد ۔ تیغ گجرات بسر نیست دل آزاراں را

دیگر ؎

مردمانش نہ ہمیں کہ سنگ دل اند ۔ جموں امروز سخت کہسار است

جموں سے پسرور صرف چالیس میل انگریزی کے قریب ہے۔ رنجیت دیو احمد شاہ ابدالی کا محکوم اور درانیوں کی فتح کشمیر کے وقت (۱۱۷۵ھ) ان کا بڑا معاون رہا ہے۔ رنجیت دیو نے دیوان نرائن داس کو ظفروال و دیگر علاقہ کا ناظم بنا کر بھیجا ہے۔ راجہ کے حکم سے نابندوبست اور پیمائش ہو رہی تھی۔ دلشاد کی

معانی میں کچھ ذہین تھے ان سے چہارم طلب کیا جاتا ہے۔ یہ عذر کرتے ہیں اسی طرح رام داس نامی کسی شخص کی دھرم سالہ ضبط کر لی گئی تھی اس سلسلہ میں دلشاد نراین داس کی خدمت میں ایک غزل بھیجتے ہیں ؎

اے مبارک فال دیوانِ نرائن داسِ ما — جز بہ لطف تو دریں دوراں کہ دارد پاسِ ما
ایں ظفر وال از قدوم تیمنت امن آباد گشت — قلعۂ دارالاماں شد مسکن و منہاسِ ما
می نماید رخ چھور از حسن اقبالت چو حور — یا رب آباداں محل عیش و استیناسِ ما
چوں رد اکرشے کہ متاحاں نامیمون قدم — بر زمین باشد ندا از بیسری مساسِ ما
ضابطانت در پے ضبط فقیراں تا طفتند — ضبط کردہ دھرم سال ذکیہ رام داسِ ما
در تقاضائے چہارم ہائے ایں قصاب کار — وضع میخواہند پائے چار ہیں از راسِ ما
آخر ایں بے رسمی شاں تا کجا خواہد رسید — کلک ایشاں رشتہ ویا تیشہ و یا داسِ ما
بخشش آیمہ را در منزلت سفے گفتہ اند — قے گرفتہا شود کار سگ کناسِ ما
عاقبت دولت سرائے راجہ رنجیت دیو — خانہ آباداں نمیگردد پر از افلاسِ ما

چوں تو دانا کے پذیرد گفتۂ ایں ناکساں
اے رضا جوئے دل خاص و عوام الناسِ ما

معین الملک عرف میر منو ۱۱۶۶-۶۴ھ / ۱۷۵۱-۵۱ء میں احمد شاہ ابدالی سے شکست کھاتا ہے اور اس کے دربار میں حاضر ہوتا ہے۔ احمد شاہ نہایت تپاک سے اس سے ملتا ہے اور اس کی بہادری کی تعریف کرتا ہے اور رستم ہند کا اس کو خطاب دیتا ہے۔ دلشاد اس موقعہ پر غزل ذیل لکھتے ہیں ؎

معین دین و پناہ دوراں امام ملت مدار گیہاں — چراغ شرع و فروغ ایماں نشاط امروز و عیش فردا
ازاں رود فتح در رکابش کہ رستم ہند شد خطابش — جبین بہادر نخاک پایش مراد دنیا نجات عقبیٰ
فلک یکے کمتریں غلامش کہ پشت خم کرد در سلامش — معین الدولہ خاں خجستہ نامش زعقل پیر و زبخت برنا

منم کہ در پرسرور باشم زدرگھٹ چند ور باشم
زحاضران حضور باشم اگر ز لطف تو باشد ایما

معین الملک کی وفات کے بعد آدینہ بیگ خاں پنجاب میں طاقتور ہو جاتا ہے۔ وہ خواجہ میرزا خاں کو حاکم لاہور بنا دیتا ہے۔ پرسرور میں جب میرزا خاں آتا ہے شاعر یہ غزل پیش کرتا ہے ؎

زبزم عیش تو نواب خواجہ مرزا خاں — بکام کینہ در ایام غیر زہر خند مباد
بجام مے عمر آدینہ را مبدل کن — بسینۂ تو غم زاہداں بلند مباد

معلوم ہوتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی کی آمد کو ابتدا میں پنجاب نے بنظر استحسان دیکھا ہے۔ اسی لئے شاعر مختلف مقامات پر نعرہ ہائے مسرّت بلند کرتا ہے۔ اور اس کے جانے پر تاسف ؎

باد نوروزی سحر در گلشن بستاں رسید — مژدۂ آمد کہ اقبال شہ دوراں رسید
ابر نیساں میرسد یا موسم باد بہار — یا بہ پنجاب اردوے شاہ درّاں رسید

دیگر ؎

ہائے پیران و فقیراں شہ درّاں ما — گر ز پنجاب رود آمدہ رفتن مدہید

دیگر ؎

خیال سرو قدش گر ز دل در خواب برگردد — فغانم از گلو افغان وش از نیلاب برگردد
حواسم رفت چوں ضیق النفس شد در گلو آہم — شہ افغاں نمی دانستم از پنجاب برگردد

دیگر ؎

خبر آمد کہ شہ پیشاور آمد — سر آمد سرور آمد افسر آمد ما
گہے بشکست سر گہ سینۂ کفر ما — شہ آمد صورت کروفر آمد

لیکن دل شاد کا یہ اظہار مسرّت زیادہ دیرپا نہیں ہے تجربہ اور افغانیوں کے

سلوک نے انہیں سبق دیا کہ قصاب اور شبان میں بڑا فرق ہے۔ چنانچہ آخر میں دلشاد کا نقطۂ نظر بدل جاتا ہے اور وہ افغانوں کے ہاتھ سے بھی دست بافغاں ہیں۔ ان کی غزلوں میں متعدد مقامات پر یہ جذبات موجود ہیں ؎

بخواب خوش چہ رود کس بملک ہندستاں　　بگوش ز آمد افغاں رسد فغانے چند
زلالہ ہیچ نماندہ است غیر داغ سیاہ　　بباغ ہند ز اغماض باغبانے چند

دیگر ؎

مدتے شد کہ اشک و افغان نیست　　شاہ در دراں نمی آید

دیگر ؎

افغان کہ بہند آید دگیر دسر خود را　　دلشاد ز آمد شد او جائے فغاں ست

لیکن دلشاد سب سے زیادہ سکھوں کے خلاف فریاد خواں ہیں یہ قوم رہزنی اور لوٹ مار سے بنی۔ مدتوں قزاقی اور قطاع الطریقی ان کا پیشہ رہا۔ زوال مغل اور احمد شاہ کے حملوں نے ان کو خروج کا موقعہ دے دیا۔ آخر سکھوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ دلشاد ؎

فغاں ز آمد و رفت قشون ابدالی　　بلاہنور سک بے شعور یا قسمت

سکھوں کے قبضۂ لاہور کی تاریخ "جہانے خراب شدہ" ۱۱۸۱ھ ہے اور شعر بالا میں شاعر اسی واقعہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

ایک اور غزل میں سکھوں کے لئے کہتا ہے ؎

الٰہی نطع ہستی کن سکان گرگ نازاں را　　زلا مقراض میگرداں سر این مو درازاں را
جو اسم آب شد از آتش دود سیہ کاراں　　بکن بیروں ز پنجاب این شرار فتنہ سازاں را
جہاں در چنگل مردار خواراں سیہ آمد　　خداوندا برین زاغاں رہا کن شاہبازاں را

دیگر ؎ سفید صحنک چینی شیشۂ پیپا ب　　زمو درازسیاہاں فنا و موا ورا

پنجاب کی آنکھیں اس وقت بھی دہلی کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ عالمگیر ثانی کے بعد جب شاہ عالم ثانی جو بنگالہ میں ۱۱۷۳ھ ۱۷۵۹ء میں تخت نشین ہوتا ہے۔ دہلی پہنچتا ہے دلشاد پنجاب میں اس واقعہ کو یوں شہرت دیتے ہیں ؎

دلشاد زپر دل خبر تازہ شنیدیم شاہنشہ والا گہر آمد خبر اینست

زین خاں سرہند کی جنگ میں ۱۷۶۲ء میں سکھوں کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے جب پسرور میں آیا تو دلشاد کہتا ہے ؎

پژمردگاں نشاط زسر برگرفتہ اند ہنگام نو بہار بوقت خزاں رسید

یعنی بہ پسرور ز فرخندگی بخت بازیب زین زینت و شان زین خاں رسید

احمد شاہ ابدالی ۱۱۷۵ھ میں رنجیت دیو کی امداد سے کشمیر فتح کرتا ہے نورالدین خاں فاتح کشمیر اس کا پہلا صوبہ دار بنایا جاتا ہے۔ پھر بلند خاں۔ پھر نورالدین خاں ۱۱۷۹ھ میں خرم خاں والی مقرر ہوتا ہے۔ اور اواخر ۱۱۸۰ھ میں نورالدین خاں تیسری بار صوبہ دار بنتا ہے۔ ۱۱۸۳ھ میں خرم خاں دوبارہ صوبہ دار بنایا جاتا ہے۔ خرم خاں کی آمد پر دلشاد بعض دوستوں کی فرمایش پر ذیل کی غزل خان کے خیر مقدم میں لکھتا ہے ؎

مژدہ آمد کہ اقبال شہ دوراں رسید (غم) ابر نوروزی سحر در گلشن بستاں رسید

ابر نیساں میرسد یا موسم باد بہار یا بہ پنجاب ار روئی شاہ ذر دراں رسید

چوں گل از باد صبا کشمیریاں خرم شوند با نشان سبز و رنگیں فوج خرم خاں رسید

دلشاد کی شاعری کی بعض ممتاز خصوصیتیں ہیں۔ وہ شعر گوئی اس لئے نہیں کرتا کہ اس کو ایک دیوان یادگار چھوڑنا ہے۔ جیسا کہ اور شعرا نے کیا ہے بلکہ ضرورتاً اقتضای ماحول دوستوں کی فرمایش وغیرہ ایسے محرکات ہیں جن کے اثر میں وہ شعر لکھتا ہے۔ اِس لئے اس کا دیوان اس عہد کے واقعات

کا آئینہ بن گیا ہے۔ مجھ کو اس انداز کا شاعر سوائے اکبرالہ آبادی کے اور کوئی معلوم نہیں۔
دلشاد کے کلام پر سادگی غالب ہے، ساتھ ہی صنعت تجنیس و مراعات النظیر
کی رعایت دیکھی جاتی ہے۔ وہ اکثر اپنی تشبیہ اور استعارے ملکی واقعات و دیگر
امور سے لیتا ہے۔ اس صنف میں وہ سب سے منفرد ہے اور اس میں بھی شک
نہیں کہ اس صنعت خاص نے اس کے کلام کو ایک زیور دے دیا ہے۔ مثلاً یہ شعر
ملاحظہ ہو ؎

گفتار تو بگرفت جہاں از لب میگوں | با فوج فرنگی شہ والا گہر آمد

دیگر ؎

خیال سرو قدش گر زدل درخواب برگردد | فغانم از گلو افغان وش از نیلاب برگردد

دیگر ؎

در زمیں پیوستہ تخم اشک می کاریم ما | گر نوئی نواب ما، آخر زمیندار یم ما
اشک چشم خود بدست خود ہمی سازیم پاک | صوبۂ پنجاب زیر آستیں داریم ما

دیگر ؎

عالم از شیریں کلامیہا مسخر کردہ ایم | درد را ہیم از قندھار می آئیم ما

دیگر ؎

مدتے شد کہ اشک و افغاں نیست | شاہ در دوراں سے نے آید

دیگر ؎

قتل عام ست در جہاں آباد | آخر ایں غمزۂ تو نادر نیست

دیگر ؎

رسید فوج لفوج اشک چشم ما ہمہ جا | جہاں گرفت قشوں و درانی ما

ان میں ظرافت اور ہجوگوئی کے بھی اوصاف موجود ہیں۔ لیکن ہجو بہت

کم لکھی ہے کسی لالہ جی کو لکھا ہے ؎

اے بندہ میاں دو عدم زندگی تست
ہشدار کہ گویند ازاں نام تو لا لا

ان اشعار کو پڑھو ؎

ہر قاں کہ بہ پنجاب دین و رزمان آست — خانست بگفتن ندر دگردۂ نان ست
تا اولاد علی گوید واللہ اعلم — ہر کھوکھر ہند کہ در ذات عوان آست
از درد فروشاں کہ بہر پیشہ مہارند — شیخے کہ بود گکے زنی پیر مغان ست
پرشپتۂ ہر شہر دو صد غول بیاباں — از نوشہیاں سپشت زمیں پر زشہان آست
در مذہب علی ہمہ نانک مشرب — ہر خانہ از مزدکیاں صاحب خان آست
سیّد کہ ہند آل نبی داناز خود را — سبائی پے اصحاب جد خود بزبان آست
ہر لا ولد بہ اگہ از نام و نشاں نیست — رجپوت ازاں گم شدہ در بے نشان است

دلشاد کا قلم ان ہجویات کے باوجود لطیف سے لطیف اور نازک سے نازک جذبات کے ادا کرنے کے قابل ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ اشعار ؎

پادشہ پرسید یک شب ہندوان خویش را — زن پس شوہر چرا سوزد روان خویش را
در حضور شمع چوں پروا نہا کردند عرض — آں عشق ایں است وساز دعشق آں خویش را
گر زما چوں شمع ایں پروانگی منظور نیست — خسروا زسوز دل افروزد روان خویش را
خسروا در عشقبازی کم ز ہندو زن مباش — کز برائے مردہ سوزد زندہ جان خویش را

بعض قراین سے معلوم ہوتا ہے کہ دلشاد تیرہویں صدی کے آغاز کے بعد بھی زندہ تھے۔ لیکن ہم ان کی تاریخ وفات سے بے خبر ہیں۔ اُردو میں انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اور اسی کو اپنی یادگار کا ذریعہ مانتے ہیں۔ چنانچہ ؎

گذاشتیم بہرگوش شعر ہندی خویش   بیادگاری ما ماندہ در کانی ما
لیکن آج یہ ذخیرہ مفقود ہے۔ ممکن ہے کہ تلاش سے دستیاب ہو سکے
مَیں یہاں اُن کے اُردو کلام کا نمونہ درج کرتا ہوں ؎

دلبر ہے نوجوان نجانوں کریگا کیا   بانکی ہے اُس کی آن نجانوں کریگا کیا
حافظ خدا ہے جوہریوں کی دکان کا   یہ موتی اس کی کان نجانوں کریگا کیا
اس لعل لب سے آگے کئی دل ہوئے تھے خون   اب کھا کے آیا پان نجانوں کریگا کیا
شیشہ شراب کا نہ لگے ہاتھ مست کے   یہ دل میرا نادان نجانوں کریگا کیا
غمزہ سوں تیر ترکش مژگاں کو سار کر   ابرو کی لے کمان نجانوں کریگا کیا
خنجر نگاہ چشم سیہ سوں کسٹا ر مار   یہ ذات کا پٹھان نجانوں کریگا کیا
دل شاد کی بھی بیتے خبر اپنے واسطے   اے شورش و فغان نجانوں کریگا کیا

سیّد محمد ولی اورنگ آبادی کی غزل کا مطلع ہے ؎

پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا   شاید کہ میرا حال اسے یاد نہ آیا

دِلشاد لکھنا ہے ؎

گذرے ہیں کئی دن وہ پریزاد نہ آیا   شاید کہ میرا وعدہ اسے یاد نہ آیا
نے خط نہ کتابت نہ خبر کچھ نہ سندیسا   پیغام ہمارا گیا برباد نہ آیا +
اس دام میں افسوس پھڑکتے ہیں کئی یار   جب ہمکوں پھنسا کر گیا صیاد نہ آیا
اک زخم کا محتاج تڑپتا رہا بسمل   پر مار کے شمشیر وہ جلاد نہ آیا
اس منتظری میں کئی شیریں نقش بدیوار   جب تیشہ گیا مار کے فرہاد نہ آیا

کہتے ہیں سبھی جمع کے آپس میں پریرو
کیا وجہ میاں ساتھ جو دلشاد نہ آیا

وارث شاہ

حضرت وارث شاہ[1] پنجابی کے بہترین شاعر مانے جاتے ہیں۔ میں مولوی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار کی ایک بیاض سے ان کی ذیل کی غزل حوالۂ قرطاس کرتا ہوں ؎

جس دن کے ساجن بچھڑے ہیں تس دن کا دل بیمار ہویا — اب کٹھن بنا کیا فکر کروں گھر بار سبھی بیزار ہویا

دن رات تمام آرام نہیں اب شام پڑی وہ شام نہیں — وہ ساقی صاحب جام نہیں اب پینا مے دشوار ہویا

بن جانی جان خراب بھی ہا آتش شوق کباب بھی — جوں ماہی بحر بے آب بھی نت وہ دن تھے بیمار ہویا

مجھے پی اپنے کو لیا وڑے یا مجھ سوں پی پہونچا ورے — یہ اگن فراق بجھا وڑے سب تن من جل انگار ہویا

جب پی یاد دن تب بھاگن ہیں ...... برا گن ہیں — اس پی اپنے کی لاگن ہوں یہ لاگ مجھے لاچار ہویا

اب پی کے درشن جاونگی تب شنگھار بناؤں گی — ..... نام سداؤنگی پی کے ساتھ اقرار ہویا

نت راگ پیا کے گاتی ہوں یہ یہ باب بناتی ہوں — مجھے شاہ کے جانی ہوں میرا تن من ... تار ہویا

تب مجنوں کامل ہویا تھا جب لیلیٰ کہہ کر دیا تھا — وہ یک دم سیج نسویا تھا اب لگ نیک شمار ہویا

سو میں اب مجنوں وارہی پردیس بدیس خوار رہی — اوس پی اپنے کی یار رہی اب میرا بھی اعتبار ہویا

جب وارث شاہ کہایا نے تب روح سوں روح ملایانے

تب سیج سہاگ سولایانے جیو جان مخزن اسرار ہویا

(از بیاض مملوکہ مولوی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار)

---

[1] کاتب نے نام کے ساتھ علیہ الرحمۃ اضافہ کر دیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس کی مراد مصنف ہیر و رانجھا سے ہے۔

خوشدل

نام محمد ابراہیم ہے۔ اور لاہور کے مشہور اہل علم خاندان چشتی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد قاضی ضیاء الحق مع اپنے عم بزرگوار مولانا نظام الدین و برادر خورد بہار الحق ایران سے ہندوستان آئے۔ اور لاہور میں متصل گڑھی شاہو سکونت اختیار کی۔ اور نواب خان بہادر نے اپنے فرزند یحییٰ خاں کا اتالیق مقرر کر دیا۔ مولانا ابراہیم علم و فضل میں یگانہ زمانہ تھے۔ لیکن لاہور میں سکھوں کے دخل کے وقت تمام جائداد سے بے دخل کر دیئے گئے۔ اور گھر لوٹ لیا گیا۔ ناچار ایک مسجد میں جو مطبع کوہ نور کے بالمقابل تھی امامت کرنے لگے۔ اور معاش اختیار کر لی۔ گوجر سنگھ نے دو آنہ یومیہ دروازۂ لاہوری و دہلی پر ان کا مقرر کر دیا۔ مولوی نور احمد چشتی مصنف تحقیقات چشتی و یادگار چشتی و تحفۂ چشتی و عجائبات چشتی مولوی محمد ابراہیم کے پرپوتے ہیں۔ چشتی خاندان تقریباً دو صدی سے اپنے علم و فضل کے لئے مشہور چلا آ رہا ہے۔ رنجیت سنگھ کے عہد کا سب سے ضخیم روزنامچہ جو بیس بائیس جلدوں میں ہے اسی خاندان کا کارنامہ ہے۔ اس خاندان میں دستور تھا کہ تخلص اکثر اوقات ہم قافیہ اختیار کئے ہیں۔ جو دل پر ختم ہوتے ہیں۔ مثلاً بیدل۔ خوشدل۔ بیدل۔ یکدل۔ مولانا خوشدل سنہ ۱۲۰۲ھ میں انتقال کرتے ہیں۔ اور "رضی اللہ عنہ" مادۂ تاریخ ہے۔ اگرچہ تحقیقات چشتی میں سنہ ۱۱۹۵ھ اور حیات رشیدیہ میں سنہ ۱۲۱۶ھ یا سنہ ۱۲۲۰ھ دیا ہے۔[1]

مولانا خوشدل کا نمونۂ کلام ذیل میں پیش کیا جاتا ہے جس میں دنیا کو

---

[1] میں اس اطلاع کے لئے مسٹر مسعود علی چشتی کا جو خوشدل کی اولاد میں ہیں ممنون ہوں۔

بڑھیا اور جسم انسانی کو چرخہ تصوّر کیا گیا ہے۔ چرخہ کی یہ نظم پنجاب میں بہت مقبول رہی ہے۔ وہو ہذا ؎

عشق کے غم سوں ہو محزون آہ دنیا سیہ مکر و فسوں جو توں چاہے تادر کوں اس عالم سوں ہو بیرون
کدھر کی بڑھیا کدھر کا توں چل رے چرخے چرخ چوں

اے رنگیں دیوانہ ہو عالم سوں بیگانا ہو دلبر پروانہ ہو (کڑا) وہ ہیگا بے شبہ و نموں
کدھر کی بڑھیا کدھر کا توں چل رے چرخے چرخ چوں

نابودیں آہ ہستی ہے بنیاد فراز ش پستی ہے کیا دولت خوابی مستی ہے مت کرا اتنا شور و جنوں
کدھر کی بڑھیا کدھر کا توں چل رے چرخے چرخ چوں

تن چرکھا بڑھیا سنسا میل کیا اس کا کرتار بھو نیا وے ایسی یار پھیر وہ ارکاتے توں
کدھر کی بڑھیا کدھر کا توں چل رے چرخے چرخ چوں

آہ جیو میرا پھیا دیوانا دنیا ساتھ بھوت پچھتانا بھول گیا اوسے اڈنا جانا اب کیا اس کا فکر کروں
کدھر کی بڑھیا کدھر کا توں چل رے چرخے چرخ چوں

کدھر گئے گور اور بہرام کدھر گئے صیاد اور دام کدھر گئے جمشید اور جام کدھر گئے گنج ارقارون
کدھر کی بڑھیا کدھر کا توں چل رے چرخے چرخ چوں

بلبل گلزار خدا کا ہو قمری شمشاد فنا کا ہو اب تارک حرص و ہوا کا ہو اہ خوب نصیحت ہے تجکوں
کدھر کی بڑھیا کدھر کا توں چل رے چرخے چرخ چوں

چھنتا نا کر نا پچھتا دا .... جیوں گزرے تیوں گزارے جا مت کر اتنا فکر فزوں
کدھر کی بڑھیا کدھر کا توں چل رے چرخے چرخ چوں

کدھر گئے حضرت یعقوب کدھر گئے یوسف محبوب کدھر گئے طالب مطلوب کدھر گئے لیلےٰ مجنوں
کدھر کی بڑھیا کدھر کا توں چل رے چرخے چرخ چوں

اہ منبر ارض و سما کا ہے جاں مرغ اسیر فنا کا ہے توں انبرت نام خدا کا ہے آخر عدم ہے دنیا دوں

کدھر کی بودھیا کدھر کا توں   چل رے چرخے چرخ چوں

کہاں سکندر سی سلطان   دارا کہاں رفیع الشان   یہ جگ کوں فانی جان   چھوڑ نہ کر مکر و فنون

کدھر کی بوڈھیا کدھر کا توں   چل رے چرخے چرخ چوں

خودی تکبر سب کوں چھوڑ   مت کر اتنا غوغا شور   جیسے چوہے کا زور   ماتی ہوا ہونا کہوں

کدھر کی بودھیا کدھر کا توں   چل رے چرخے چرخ چوں

جو غفلت کے ماتے ہیں   عصیاں سوں باز نہ آتے ہیں   پھر روز جزا پچھتاتے ہیں   یہ حکم لکھ دل میں مضموں

کدھر کی بودھیا کدھر کا توں   چل رے چرخے چرخ چوں

ایہ دنیا ہے سفر سرا ہے   غافل ہو مت آنکھ لگے   پونجی کھوئی چل پچھتاوے   پھر نہیں آوے ہاتھ کہوں

کدھر کی بودھیا کدھر کا توں   چل رے چرخے چرخ چوں

جو زاہد نہ ہونا ہو گئے   دل بے قرار ایل ریا ہو گئے   شرمندہ روز جزا ہو گئے   رو سیہ ریا سے ہو بیروں

کدھر کی بودھیا کدھر کا توں   چل رے چرخے چرخ چوں

کدہوں بیٹھے بیچ عماری   کدہوں بھی نتے تال سواری   فکر معیشت گھر کی خواری   تس پر دیکھو غرار فوں

کدھر کی بوڈھیا کدھر کا توں   چل رے چرخے چرخ چوں

خوشدل قسمت پر قانع ہو   ہنکار سوں دل کوں مانع ہو   بیلندۂ قدرت صانع ہو   کس سوں کیا مطلب تجکوں

کدھر کی بودھیا کدھر کا توں

چل رے چرخے چرخ چوں

(از بیاض پروفیسر آذر)

فدوی لاہوری

میرزا سودا ان کے حریف غالب ان کو بقال بچہ کہتے ہیں۔ فارسی و ریختہ میں کامل تھے۔ ایران میں ایک عرصہ تک رہے ہیں۔ تجارت ذریعۂ معاش تھا۔ احمد نگر فرخ آباد میں ایک عطار کی دکان پر مکان کرایہ لے رکھا تھا۔ عطار کی دکان پر اکثر آ بیٹھتے تھے۔ اور وہاں شعر کے چرچے رہتے تھے۔ فدوی نے سودا کے بعض اشعار پر اعتراض کئے تھے۔ مثلاً ایک مقام پر سودا نے شیخ و برہمن دونوں کے لئے دین کا لفظ استعمال کیا تھا۔ فدوی نے اعتراض کیا کہ دین شیخ کے لئے اور دھرم برہمن کیلئے مخصوص ہے سودا نے جواب میں آیۂ کریمہ "لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ط" نقل کی۔ اسی طرح سودا کا ایک شعر کسی اور بحر میں حسب ذیل تھا ؎

تم نے جہاں وا کئے بند قبا اپنے جان ۔۔۔ جا کے صبا نے باغ کھول دیئے گل کے کان

فدوی نے اصلاح دیکر اس طرح لکھا ؎

کھول دیئے ناز سے تم نے دو چشم اپنے جان ۔۔۔ کھولے صبا نے یونہی غنچۂ نرگس کے کان

اسی طرح شاگردوں کے بارہ میں جنگ ہوئی۔ جن میں شیدا قابل ذکر ہیں۔ نوبت ہجووں تک پہنچی۔ میرزا نے جس طرح میر ضاحک۔ فاخر مکین۔ میاں فوقی۔ شیخ صنعت اللہ۔ ندرت کشمیری۔ مرزا علی وغیرہم کی ہجویں لکھی تھیں۔ فدوی کی بھی ہجویں لکھیں چنانچہ پانچ ابتک میرزا کے کلیات میں موجود ہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہجو گوئی کا سلسلہ ایک عرصہ تک قائم رہا ہے۔ ان میں سے ایک ہجو میرزا نے پنجابی زبان میں لکھی ہے۔ جس کا مطلع ہے ؎

پٹی جو سودا شے کن یہ گل کہ فدوی جس کوں جا وندا ہے
پھلے بیے نوں شے یار اکھہ اکھہ ہجو تیندی ستا وندا ہے

یہ معرکہ ۱۱۸۶ھ میں پیش آیا۔

میر حسن فدوی کے متعلق لکھتے ہیں ؎

"فدوی مرشے بود بر خود غلط، برائے مباحثہ و مجادلہ بہ فرخ آباد پیش میرزا رفیع سلمہ اللہ آمدہ ہنگامہ برپا نمود بعد از ذلت بسیار بہ وطن خود برگشت۔ یوسف زلیخا بزبان ریختہ گفتہ بود و بہمہ عالم می نمود، ہر کسے کہ از و لطف بر می داشت از و محظوظ می شد۔ حالا معلوم نیست کہ زندہ است یا مرد از دست ؎

مژہ کی نوک سینے میں نگاہ یار سے ڈوبی — کہ جیسے بھال تو دے میں سری یک بار لی ڈوبی
نہ پوچھو رنگ مہندی کا کف قاتل پہ اے یارو — کسی کے خوں میں اس کے ہاتھ کو تلوار لی ڈوبی

میں محسوس کرتا ہوں کہ میر حسن کا فیصلہ فدوی کے حق میں چنداں منصفانہ نہیں ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ خود فدوی کے ہموطن اس کے حالات و کمالات سے قطعی بے خبر ہیں۔ اور نہ اس کی تصنیف یوسف زلیخا کا سراغ چلتا ہے تاہم اس کی بلند پایگی میں شک نہ کرنا چاہیئے۔ ذیل میں اس کے کلام کا نمونہ درج ہوتا ہے۔ جو بعد تلاش حاصل ہوا ہے ؎

آنسو نہیں ہیں دیدۂ تر میں بھرے ہوئے — موتی ہیں آبدار صدف میں دھرے ہوئے
ابرو تری کی تیغ سے سورج ڈرے ہوئے — پھرتا ہے اپنے منہ پہ سپر کوں دھرے ہوئے
ڈالی کران کو دل کے نشانیں پہ ایک بار — ترکش تری مژہ کے ہیں چاروں بھرے ہوئے
کہنے لگا کہ میری گلی کی طرف نہ آ — جاتے دل نے یا تسے ادھر کوں پھرے ہوئے
سن کے میں نے عرض کی خدمت میں اس طرح — لیکن دو دست بستہ ادب میں ڈرے ہوئے

جرأت کہاں کہ آسکوں قرآں کی قسم کو — لاتا ہے دل مرا مجھے آگے دھرے ہوئے

فدوی ہمارے دیدۂ گریاں کے فیض سے

اشجار کوہ و دشت کے یکسر ہرے ہوئے

حضرت مراد شاہؒ

والد کا نام پیر کرم شاہ عرف مستیا شاہ تھے۔ پانچ سال لکھنؤ و دیگر مقامات میں گزارنے کے بعد ۱۱۹۶ھ میں اپنے پدر بزرگوار کی معیت میں واپس اپنے وطن لاہور آرہے تھے کہ شاہجہان آباد کے قریب قزاقوں سے مقابلہ ہوا۔ اور پیر کرم شاہ مارے گئے۔ اس افتاد سے دو سال اور وطن آنا نصیب نہیں ہوا۔

حضرت مراد شاہ کئی تصنیفات کے مالک ہیں۔ دیوان کے علاوہ متعدد چھوٹی چھوٹی مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں۔ ۱۲۱۴ھ میں اپنے شاگرد حکیم علیم اللہ کی فرمائش پر قصۂ چہار درویش نظم کرنا شروع کیا۔ اور کچھ حصہ نظم کر چکے تھے کہ پیام اجل آپہنچا۔ اور عین عالم شباب میں انتیس سال کی عمر میں دنیا سے ۱۲۱۵ھ میں کوچ کیا۔ مزار موضع مردانہ تحصیل شاہدرہ میں ہے۔

ان کی طبیعت غزل سے بہتر مثنوی پر جمتی ہے۔ اس میدان میں وہ کسی سے کم نہیں اور اہل ہندوستان کے دوش بدوش ہیں۔ متواتر سات سال ہندوستان میں رہنے کی بنا پر زبان بالکل صاف ہوگئی ہے۔ سلاست اور روانی کے علاوہ کلام میں پختگی موجود ہے۔ ۱۱۹۶ھ میں ایک منظوم خط

عزیزانِ وطن کو لکھتے ہیں جو نامۂ مراد کے نام سے موسوم ہے۔ اور ہمارے مخدوم جناب غلام دستگیر صاحب نامی کی سعی سے چھپ چکا ہے۔ اس خط میں اُردو کی قبولیت کے ذکر میں فرماتے ہیں ؎

وہ اُردو کیا ہے یہ ہندی زباں ہے — کہ جس کا قائل اب سارا جہاں ہے
کلام اب تجھ سے میں ہندی زباں میں — کروں اشہرت ہوتا سارے جہاں میں
کہ اب وسعت میں اس کی سب سخنداں — سمندِ طبع کو کرتے ہیں جولاں
لطافت یہ نکالی ہے اسی میں — کہ فرق تھے نہیں کچھ فارسی میں
اسی کا شہرہ اب ہو جائے تب تک — یہاں سے تا بایراں بل عرب تک
خصوصاً شعر اب شاعر یہاں کے — نہیں کہتے بجز ہندی زباں کے
غرض ہندی کا یہ چرچا یہاں ہے — کہ شعر فرس مطعون زماں ہے
یہ شہرت ہے اب اس مضمون پر کی — نہ کوئی فارسی پوچھے نہ ترکی
نہیں ہندی سخن میں نقص ممکن — لطافت ہے بہت سی اس میں لیکن
نہ شاعر ہند کے یوں فی الحقیقت — گئے لے فرس کے مضموں پہ سبقت
جھنجوڑا فارسی کی استخواں کو — کیا پر مغز تب ہندی زباں کو
فصاحت فارسی سے جب نکالی
لطافت شعر میں ہندی کے ڈالی

لفظ اُردو کا استعمال ان کے ہاں تحسین کی طرح قدیم ہے۔ گویا تحسین نثر میں اور یہ نظم میں سب سے پہلے لاتے ہیں۔ میں ایک اور مثال ان کی مثنوی چہار درویش سے دیتا ہوں ؎

یہ قصہ جو ہے چار درویش کا — اگر نظم ہو تو بہت ہے بجا
ولیکن ہو اردو زباں میں بیاں — کہ بھاتی ہے ہر ایک کو یہ زباں

نامی صاحب ان کی مثنوی مراد العاشقین اور فارسی ترجیع بند نامہ مریداں چھاپ چکے ہیں۔ ذیل میں ان کا مخمس نامہ بطور نمونۂ کلام ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے:-

شہر لاہور قبۂ اسلام — روشن آفاق میں ہے جس کا نام

خوبی اس کی تھی شہرۂ آفاق — حسن کا اس کے تھا جہاں مشتاق

اصفہاں ہے جو ایک نصف جہاں — خوبیوں میں نہ تھا کچھ اس سے کلاں

دور و نزدیک تھا یہی مشہور — اپنے نزدیک تھا بہت سا دور

تھا عمارت سے یہ قوی بنیاد — ربع مسکوں میں افتخار بلاد

تھا بہشت بریں برشک زمیں — عجب انساں تھے اس مکاں کے مکیں

ایک سے ایک تھے دو صد چنداں — سب ملائک صفت وہ لے انساں

اولیا و مشائخ و سادات — علما اک سے اک ستودہ صفات

شہر تھا یہ کہ کان علم و ادب — کان کیا بلکہ جان علم و ادب

کیا بہار اس کی میں کروں تحریر — شہر تھا یا مرقع تصویر

گلعذاروں پہ حسن کی تھی بہار — گل تھے ہر ایک کے گلے کے ہار

کھینچتے تھے دکھا کے رخ دل کو — خانہ خانہ میں تھے کماں ابرو

عقل قبضہ میں کس کے رہتی تھی — جاں ہو قرباں دل سے کہتی تھی

تیر زد ہر کہ ترکش آساں نیست — گوشہ کرد آنکہ مرد میداں نیست

خوبرو تھے حیا سے سب موصوف — اور عاشق وفا میں تھے معروف

راہرو تھے سبھی طریقت پر — تھا قدم منظر الحقیقت پر

اور جس کو کہیں مجازی تھا — شیوہ اس کا بھی پاکبازی تھا

جو کہ عالم تمام دیکھ آتا — سو نہ دیکھ اس کو پھر کہیں جاتا

رشک آبادی جہاں تھا یہ ؛ الغرض خوب ہی مکاں تھا یہ
سوز ہلنے نے ایسی زشتی کی خوبی اس قطعۂ بہشتی کی ؛
لے کے دوزخ میں ڈالدی یکبار وقنا ربنا عذاب النار
کوئی اس میں پڑا جو بوم قدم ہے اب اس کا وجود رشک عدم
ہے مکاں کو شرف کمینوں سے نہ کہ دوں ہمتوں کمینوں سے
نہ وہ رونق نہ وہ صفائی ہے مکھیوں کی غرض دہائی ہے
زر تو شاہ زماں سدھارے لے مکھیوں کو گئے اجارہ دے
اسی صورت سے آ گئے احمد شاہ بھاگیا چھوڑ چیونٹیوں کی سپاہ
گو زمیں لی تھی سب انھوں نے گھیر مثل درانیوں کے ہو کے دلیر
راہ خالی نہ تھا جو کوئی چلے لیک رہتی تھیں جوتیوں کے تلے
اب ہیں پر مکھیوں سے سب لاچار ہیں یہ گردن پہ آہ سب کی سوار
نہیں آرام ان سے رات اور دن کھا گئیں کان سب کے کربھن بھن
دن کو کیا کہئے بات کھانے کی اٹھ گئی رسم ہی پکانے کی
آتش جوع نے جگر کو کباب جس کے دل کوں کیا سو ہو بیتاب
خشک روٹی کہیں پکاتا ہے + کس مصیبت سے وہ بھی کھاتا ہے
اور قلیہ پلاؤ کھائے کون ہو سکے کس سے اور پکائے کون
پک گئی شب کہیں جو تھوڑی دال اس کے کھانے کا کیا لکھوں احوال
ماش کا دیکھ بیچ میں چھلکا ؛ کھا کے وسواس وہ جو تھا دل کا
منہ سے لقمہ وہیں اگل ڈالا ؛ دیکھیو دال میں ہے کچھ کالا
یا یہ کہتے سے قے کیا ہوا ہے ہے لا حول طشت مجھ کو آتی ہے ..
اس میں پہنچی حکیم جی کو خبر + کوئی با قوتی آئے وہ لے کر

لے اُدھر وہ زبان پر رکھتی + پڑ گئی ناک میں اِدھر مکھی +
ناچتی ہیں کہیں جو کنچنیاں دیکھئے جا کے ملک وہاں کا سماں
ہے دھیان ان کو بھی یہ تا نو تمیں مکھیاں پڑ نہ جائیں کانوں میں
اور پاؤں کی گت سے ہے منظور مکھیاں ہوں کسی طرح سے دور
ناچنے کا غرض بہانہ ہے مدعا مکھیاں اڑانا ہے +
مکھیوں سے نہیں کسی کو نجات کچھ نہ پوچھو نمازیوں کی بات
جب کوے بیچ ڈول ڈالے ہیں مکھیوں کا ہی بھر نکالے ہیں
کرنے جس وقت بیٹھے ہیں وہ وضو پانی لے منہ میں کرتے ہیں تھو تھو
آہ بھر تا بھی ہو گیا ہے محال اور لکھنے کا کیا لکھوں احوال +
لیکے کاغذ پہ کلک جب رکھی لکھتے لکھتے ہی یک قلم مکھی
سطر کی سطر ساری چاٹ گئی اُڑ کے پھر آنکھ بد بھی کاٹ گئی
جتنے گھوڑے تھے بوریا سرِ تنگ کمسی ہو گیا ہے سب کا رنگ
شہر میں دیکھ میں یہ ہنگامہ گاؤں میں آنکھا مگس نامہ
متصل شہر کے اٹاری نام + ہے مرید ذکا اپنے جس میں مقام
لیک خالی ہے ان سے شہر نہ گاؤں کر برابر ہے ان کو دھوپ اور چھاؤں
دن کو گرتی ہیں یونکر صید پہ باز رات کو یہ اڑیں ہما پرواز
سب پرندے خطر سے بھول گئے اور درندوں کے پاؤں بھول گئے
کوئی حالت نہیں ہے انساں کی اور نہ صورت کوئی ہے حیواں کی
آہ قطع نظر ز ہر حیواں نتواں دید صورت انساں
بس کر آگے نہ کہہ کچھ اس کی بات کر مراد اب یہ ہے دعا دن رات
مکھیوں سے نجات پاویں سب [illegible]

شہر پر پھر وہی سماں ہووے — شکل بستے کی پھر وہاں ہووے
نہ رہے کوئی فتنہ اور فساد — سب خلل شہر میں رہیں آباد
اختر نحس کا عمل جاوے — سعد اختر کا دور پھر آوے
شہر میں ہو سراسر آبادی — پھر وہی رونق اور وہی شادی
اور رہے اس کو تا قیام جہاں — فتنۂ آخر الزماں سے اماں
تا بر آوے سبھوں کے دل کی مراد
فیدسے رنج و غم کے ہوں آزاد

پیر سکندر شاہ امداد

متوفی ۱۲۱۲ھ

حضرت مراد شاہ کے چھوٹے بھائی ہیں۔۔ بیس سال کی عمر میں وفات پاتے ہیں۔ مزار خانقاہ حضرت عبدالجلیلؒ واقع لاہور میں ہے۔ نمونۂ کلام سے

بادہ و جام و ساقی و گل و مل — ہے نہیں ہائے اک وہ غیرت گل
شب میں احوال اس کا کہہ نہ سکا — شیشہ ہر چند کہہ رہا قل قل
زلف مشکیں کو دیکھ کر اس کی — کٹ گیا آج طرۂ سنبل
جس گل اندام کے لیئے میں نے — کھائے اپنے بدن پہ لاکھوں گل
سوا شارہ میں اس کے خون میرا — لے گیا اس کا زنگیئے کا کل
دیکھ کر اس پری کو ہوش و حواس — آہ پرواز کر گئے بالکل
فیض شاہ مراد سے امداد
ہم نے باندھے ہیں یخنوں کے پل

رام کلی

میں رام کلی کے ایک ترجیع بند سے جو لمبا ہے۔ صرف چند اشعار پر قناعت کرتا ہوں ؎

توں بے وفا ہے مجہ تیرے اقرار کی قسم — بے اعتبار ہیں ترے اعتبار کی قسم
ناگن کی بھانت ڈس کے میرا دل الٹ گئی — مرتا ہوں مجھ کو زلف سیہ مار کی قسم
خفت میں ہو گئی ہیں تری چال دیکھ کر — سب کبک کوہسار کی رفتار کی قسم
نازک بدن ہے تیرا کروں صفت کیا بیاں — شرمندہ گل ہوے گل گلزار کی قسم
زیباں بزیب و خوبی ادیبہ نگر کے بیچ نا — کھاتی ہے تیرے سخن شکر بار کی قسم

ہم سیں نہ اپنے رخکوں چھپا شوخ نازنیں
تجھ کوں ہے رام کلی طلب گار کی قسم

(از بیاض پروفیسر آذر)

فقیر اللہ

فقیر اللہ خانوادۂ نوشاہیہ سے بیعت ہیں۔ اور شاہ امانت کے مرید ہیں حاجی نوشہ متوفی ۱۰۳۰ھ اس سلسلہ کے بانی ہیں۔ شاہ امانت کا حاجی نوشہ سے یہ واسطہ ہے کہ شاہ امانت حضرت عبدالغفور کے مرید ہیں۔ جو محمد حافظ سے بیعت رکھتے ہیں۔ اور محمد حافظ محمد ہادی سے ارادت رکھتے ہیں۔ جو بانی سلسلہ حاجی نوشہ کے مرید ہیں +

فقیر اللہ مثنوی درکنون کے مصنف ہیں۔ جو رمز العشق کی طرز میں تصوف پر لکھی گئی ہے۔ اس میں ایک ہزار سے زاید ابیات ہیں۔ اور بحر بھی تقریباً وہی ہے۔ سرخیوں کے طور پر اس میں دوہرے لائے گئے ہیں۔ اس کی تاریخ تصنیف ۱۲۰۴ھ "چراغ" کے اعداد سے برآمد ہوتی ہے۔ افتتاحیہ

انند سُنا تیرے گن گاواں ہر دم تیرا نام دھیاواں

انند بھی ست گور میں پایا اچھا جاپ جس مجھے بتایا

کُنْتُ کَنْزًا نے کیا پکارا سوہنگ آہنک آئے پکارا

اچھا جاپ جپائے کو سوے جس کا ہردا نرمل ہوے

سوہنگ ہوانا کو حیان مری شغل کا بھید پچھان +

ہو اللہ ہے اچھا جاپ جب میں کنہیں کو تاں پاپ

باہر سو بھیتر اور آہنک + اچھا جاپ ہے سوہنگ آہنک

ہوانا جب جس نے کہا + سو جن ہو اللہ ہو رہا + +

ہوانا جب سالک سکے دوئیت دوار آہنک ہو رہے

آپی ہر جی آپی توں + اَنَا اَنَا ہو بولیں توں +

ہر ہر رنگی ہے سبے پچوں جس پچونی ہیں سبھ پچوں

ہو جاپ سیں پاوے سکھ بن ہو اور سبھی ہے دکھ

ہو جاپ ہی جو تجھے پد کا+ سا ہر دپاوے بھید اس جد کا

شاہ امانت بھید بتا یا تو ہیں ان حد ناد بجایا

معنے اسم صفت کے جانوں بوجھ بھید اور سر پچھانوں

اسم مسمیٰ جانو میت سمجھ بوجھ کر دھر بوجیت

ہریک اسم کی شان پچھان لازم حفظ مراتب جان

جس نے حق کوں سن سمجھ پچھانا حفظ مراتب لازم جانا

مَیں کیا کہتا ہوں دیوانہ + + سن کر طالب کر خوشیانا

اوس کے سات مراتب جان ہر واحد کے حکم پچھان

فرق ارجمع مو جان یہ نیک بہتر دونوں کوں جانو ایک

گور ایسے بوجھ منزہ ذات نا ہو گا فرتا کمزات (کذا)

ست گور سیں یہ بھید پچھان پھر دونوں کو ایک ہی جان

ایک ہی ایک ہے ایک ہی ایک سمجھ لیؤ اور بوجھو نیک +

آپے عابد ہے معبود + + آپے ساجد ہے مسجود +

وحدت عین کثرت ہے یار و ظاہر میں تم سمجھ بچارو

اور باطن میں تمیز جان + کثرت کوں وحدت پچھان

کل اسما کی واجب جان تن عل بیچ اشیا کے مان

سبھ اسمار کیا فانی + جانو حادث اور نقصانی

خاتمہ
سر مکنوں کا جس نے جانا | اپنے آپ کوں آپ پچھانا
فقیر اللہ کیا کہی بات | سر مکنوں ہے شاہ کی ذات
شاہ ہمارا شاہ ہمارا | کل عالم کا سرجن ہارا
سر مکنوں کے سن کوں جان | یعنے عدد "چراغ" پچھان
سر مکنوں کو کیا تمام | شاہ جیلانی کا لے کر نام
ہے وہ سید عبدالقادر | ظاہر باطن اوّل آخر
عبدالقادر پیر ہمارا محی الدین نام رکھایو رے | ظاہر باطن قادر ہو کر ترکو پھر چھایو رے

رحمت شاہ

رحمت شاہ مثنوی شیر بن فرہاد کا مالک ہے جس میں ہر نو دس اشعار کے بعد بند کے طور پر دوہرے آجاتے ہیں۔ اس مثنوی کی زبان بھاشا اور پنجابی آمیز ہے اور لطف یہ ہے کہ کبھی پنجابی غالب ہے اور کبھی برج۔ رحمت شاہ نے اپنے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ حتیٰ کہ ہم کتاب کے نام و تاریخ نیز مصنف کے زمانہ سے بے خبر ہیں۔ پوری وہ اپنا وطن بتاتا ہے جہاں جگدیو کا استھان ہے۔ یہاں اس کے والدین آکر آباد ہو جاتے ہیں۔ اس کے والد نے سات مرتبہ حج کیا تھے۔

ابتدا:-

اول نام صاحب کا لیجے | پاچھے ذکر سبکا رج کیجے | جیو جنت جو اس دیا ئے | ہر ہر کرت سنگ لائے
او دا تا سبھن کا سائیں | پالے سبھن کو ہر جائیں | اوس کیا کیا کہوں بکھانو | اوسی جوت کی کلا نجانو
لاکھ جیو جو جل میں ہیں | تازا رزق ہمیشہ لیں | پنچھی اور پرندے ہاتھی | کیڑے جون کی تنگل نجاتی

خبر لیندا اوہ کرتارا اوسی وار پر کرپا کیا دھرمی کوں نہیں پاپ بھاوے پاپی کوں نہیں ما رہٹکے
ہر ہر میں ہر ہے ہر جانا کون کرے ہرن پیتا ماتا پالنہار جو رزق پہنچاوے ہو جیبو کئی نظر نہ آوے

رحمت شاہ اپنے وطن کے متعلق یہ بیان دیتا ہے

اک نگر اُت بسے سوہاوا نگر بیچ ناں لوک ملاوا دوار دوار پر کھڑے ترنگا ویہڑ ڈھولک باجے مردنگا
ہراویں کو پراو بکارے کرتے پرش گئے او بارے نس دن تیج ہدہ ماتے ہیں ستنرو سوس سر سنگ کہیں
پوری نام جگلید کو استہاناں نگر لوک ات چتر سوجاناں ہم بستے ہیں اوس نگر میں دیا دھرم کا روپ کل میں
مات پتا ہم دجب آئیو ایس نگر استہاں بنائیو پسچم اودے سیر جگ کینا ایہناں آسے سکھ بینیت لینا
مدت بار جاجی اوہ بھٹے پھر جا دیئے سے ہے
انت کال اس نگر میں آسے کیا اسرام
سب کارج پورے ہوئے نال رب دے نام

خاتمہ

دیو جنگل سبھ اکٹھے ہوئے جلد دیکھو فرماد جو موئے کیا ہویا فرہاد تی نا ہیں کتنے جو ماردیا اتن نائیں
کرہ سادی اوس کیا کچھ کیتا عاشق ماریا سبھ جیتا تائوں ہے بدلہ جو کرو کتنے کوں سولی پر دھرو
رل دیواں یہ بات بنائی کتنے کے گل پاؤ پھاہی مار مار کر بوہت ہی گالا اوہ کتنے منے احوالا
اور کی کیتا سبھ کو باوے بدلا اوہ ماحب دکھلاوے دیکھے سر تیرا حیاتیں بدلا اوہ چھوڑیندا ناہیں
اوہ بدکار جو بار کیتے بوہت بے حال
رحمت شاہ شے جفل اوہ من مول نہ ڈال

عبدالرحمن خلدی

خلدی کا زمانہ تیرھویں صدی کا پہلا منتصف تصور کرنا چاہیئے۔ اگر چہ کلام میں قدامت کی جھلک ہے ؎

گھونگٹ دُور کر مکھ دکھا رے سجن
دل عاشقاں نا ستا رے سجن

دیا جن نے جوبن کرم سے تجھے
خدا کا کرم نا چھپا رے سجن

جدائی تیری سے جلا جان و دل
جلے کا جیانا جلا رے سجن

کرم کر نر لکار کے واسطے
ترے عشق میں مر چکا رے سجن

مرے خون کا کیا کروگے جواب
جو پوچھیگا تم کو خدا سے سجن

جدائی تری سے تو میں مر رہا
مرے حال پر کر دیا رے سجن

وفا ابتدا میں بھلا چھوڑنا
تجھے کس کہا سو بتا رے سجن

سنبھالو محبت کا قول و قرار
کرو یاد اپنا خدا رے سجن

کوئی دن تو دل بیٹھو خلدی کے ساتھ
نہیں جگ موں رہنا سدا رے سجن

(از بیاض مولوی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار)

غلام قادر جلال پوریہ، غلام تخلص

اس کا زمانہ معلوم نہیں۔ لیکن تیرھویں صدی کے نصف اول میں اس کو جگہ دی جاتی ہے۔ کلام میں فارسی ترکیبیں زیادہ غالب ہیں۔ غزل ذیل سراج دکنی کی مشہور غزل کے جواب میں لکھی ہے ؎

تیرے رخ کی تابِ جمال سے نہ قمر کی وہ قمری رہی — نہ سمن کی سیم بری رہی نہ چمن کی جلوہ گری رہی

کرے خوش خرامی کی طرز میں تیرے سرو قد کی برابری — یہ ہوس ہمیشہ ہوا میں بھی نہ خیال کبک دری رہی

بجنابِ حضرتِ عشق جب لیا درس نسخۂ صلح کل — نہ کسی سے جنگ و جدل رہا نہ کسی سے کینہ وری رہی

بخیالِ صافیِ جسمِ تو شدہ خوابِ مخملِ عبقری — گئی یاد دل کی جھلک سے اس ذرا بھی تاب نہ رہی رہی

ہوئے موج خیز فنا میں ہم بکمال شوق جب آشنا — اسی سیل جوش بلا میں بھی نہ متاع دھری رہی

دل و دیں کیا ہے فدا میں نے سبب عشق جو بیچ پھنسا ہوں جب — نہ رہا ہے کچھ بھی خیال دنیا یہی سودا سر ہی رہی

بحلاوتِ لبِ لعل تو کرے سبز دعویٰ ہمسری — ہرا دل تو سدا گرہ بحذاقت نے شکری رہی

دیکھو معجزہ جبیں کیا ہے یہ تیرے حسن و نشان کے رو برو — نہ کمال شان ملک رہا نہ جمال حسن پری رہی

کیا منزلوں سے جدا رہا رہ دور کعبۂ عاشقی — یہ مراد خاطر عاشقاں اسی راہ میں سفری رہی

نگہ عنایت یار کی کرے دل کسی یاس سے صفت بیاں

کہ کرم سے حال غلام پہ ہے عین خوش نظری رہی

(از بیاض مولوی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار)

نثر

پوتھی سلوتری کی

نثر نظم سے نسبتاً کمتر لکھی گئی ہے۔ اور اس کے نمونے کمیاب ہیں۔ میں یہاں ایک ایسے رسالہ کا ذکر کرتا ہوں جو غالباً بارہویں صدی کے اواخر میں لکھا گیا ہے۔ یہ ایک فرس نامہ ہے جو دس فصلوں اور تیرہ اوراق پر شامل ہے۔ اس کا آخری ورق مفقود ہے۔ کاتب کوئی غیر مسلم ہے جس نے بسم اللہ کے بجائے "ست گور پرشاد" لکھا ہے۔ اس رسالہ میں فارسی و عربی کا استعمال کم دیکھا جاتا ہے۔ مصنف حروف ظرف و اضافت کی صورت میں کبھی پنجابی اور کبھی اردو حروف لے آتا ہے۔ اسماء و افعال بھی بعض اوقات پنجابی ہیں۔ اور اگرچہ رسالہ اردو میں لکھا گیا ہے لیکن ٹھیٹ پنجابی لہجہ میں ہے۔ نمونہ:۔

"پوتھی سلوتری کی۔ پچھان ناں کھوڑیاں کا عیب سواب، عمر کا ذات کا روک کا، سو دس بھانت کا ہے:۔

بھانت پہلی پیدا ہونے کھوڑے کے۔ دوسری کھوڑے کے سوادنے کی بھانت تیسری پچھان ناں سوکن اوکن کا۔ بھانت چوتھی پچھان ناں نحس کا بھانت پنجم پچھان ناں برساں کا۔ بھانت ششم مُل (مول) ایسیں کھوڑے کے۔ بھانت ستمی پچھان ناں ذات کھوڑے کی کا۔ بھانت آٹھمی پچھان ناں کھصیت (خاصیت) کا۔ بھانت نویں پچھان ناں روک کا۔ بھانت دسمی کرنا علاج کا۔

بھانت پہلی پیدا ہونے کھوڑے کے:۔ اک برہمن تھا نام اس کا

اسپدت تھا۔ اکن ہوتری تھا۔ اکن ہوتر سیبن ھو انکس کے جو آنکھیں میں پریا
تھا۔ تس نے آنسو جو چلنے تھے۔ داہنی جو اکھ نے آنسو چلتے تھے۔ تس نے
کھورا ہوت پھیا۔ بادیں اکھ تے جو آنسو چلنے تھے۔ تس نے کھوری ہوت
پھٹی۔ پوتر جو اس برہمن کا تھا۔ اس کا نام سالوتر تھا۔ تن پوتر اپنے نوکھیا،
اک پوتھی کھوریاں کی کرو جیس تے کوں ادکن ار روک ا۔ علاج جانیا جاسے۔
تس نیں اہ پوتھی کری " آپنا ہیں نام رکھیا "
یہ عبارت بے ربط اور اکھڑی اکھڑی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
مصنّف زبان پر عبور نہیں رکھتا۔

ہزار مسائل

رسالۂ ہزار مسائل فارسی کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ اور حفظ الرحمن صاحب
(حفظ العلوم) کی ملک ہے۔ اس کے مؤلف اور زمانۂ تالیف سے ہم بالکل بے
خبر ہیں۔ لیکن اس کی املا اور افعال و اضافت کی جمع مؤنث کو دیکھ کر جو
قدیم طرز میں ہے ہمیں تیرھویں صدی ہجری کی ابتدائی ربع میں اس کا تعین
کرنا ہوگا۔ کیاں بجائے کی۔ ہونگیاں بجائے ہونگی۔ چھیتیاں بجائے چھپتیں
ہوتیاں بجائے ہوتیں وغیرہ قدیم شکلیں ہیں جو بہرامن کے بہت جلد بعد
متروک ہو چکی ہیں۔ نسخۂ ہذا ۱۲۸۸ھ مطابق سمت ۱۹۳۰ بکرمی مطابق ۱۸۷۴ع
کا نوشتہ ہے۔ نمونہ :-

جب کے نامۂ مبارک نزدیک عبداللہ ابن سلام کے پہونچا شرطیں تعظیم

کیاں بیجا لیا کہ نامہ معظمہ کوں پڑا اور اپنی اور اپنی قوم کوں اکھٹی کرکے
مضموں نامہ مبارک کا سنایا کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم
جو آخری زمانہ کے پیغمبر ہتے۔ ایک نامہ پاس (کذا) بھیجا اور دعوت اپنے
دین کی کئی ہے۔ لازم ہے کہ ہم سب لوگ ایمان لیاویں اوران کی شریعت
اور دین کی پیروی کریں۔ کوئی متفق ہوکر جواب سناؤ۔ ان سب نے کہا کہ
اے عبداللہ ابن سلام تم سب لوگ علما ہمارے سیں دانا تر ہیں۔ اور
نبیوں کی حقیقت اور ماہیت پر بڑے واقف ہیں۔ تماری مرضی کے خلاف
ہم نہیں کرسکتے جو تم فرماویں سب راضی ہیں۔ لیکن یہ خیال ہم کوں آتا ہے
کہ کیونکر اپنے دیں کوں چھوڑیں اور ان کے دین کی پیروی کریں۔ تب عبداللہ
ابن سلام نے کہا کہ اے لوگو تم سب جانتے ہو کہ تم کو بھیں معلوم ہوگا کہ
موسیٰ پیغمبر علیہ السلام نے خبر دیئی ہے۔ اور دوسرے پیغمبروں نے
بھیں خبر دیئی ہے۔ اپنی اپنی قوم میں کہتے آئے ہیں کہ ایک نبی آخر زمانہ
میں نام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوگا اور جب اس کا زمانہ آویگا ہم سب کا
دین چھپ جاویگا۔ اور اسی کا دین مشرف ہوگا۔ اور مشرق تا مغرب تک
پھیل جاویگا۔ اور ہم سب کی کتاب اور شریعت منسوخ ہوجاویگی۔ اور
دوسرا یہ ہے کہ جو چیزیں ہمارے دین میں حلال ہیں وہ اس کے دین میں
حرام ہونگیاں۔ اور جو چیزیں ہمارے دین میں حرام ہیں۔ اس کے دین میں
حلال ہونگیاں۔ توریت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور انجیل میں حضرت عیسیٰ
علیہ السلام اور زبور میں حضرت داؤد علیہ السلام اور دوسرے صحیفوں میں
اور نبیوں نے ارشاد فرمایا ہے کہ ان کتابوں کی پیروی کرنے والیوں کوں چاہیے
کہ اس پیغمبر کی شریعت میں داخل ہوکر ایمان لیاویں اور اپنے دل کوں شمع دین
اس کی سیں روشن کریں"۔

مطبوعہ
کریمی پریس لاہور نزد کوتوالی قیم
باہتمام میر قدرت اللہ
پرنٹر

غلط نامہ کتاب ھذا
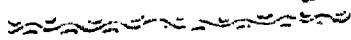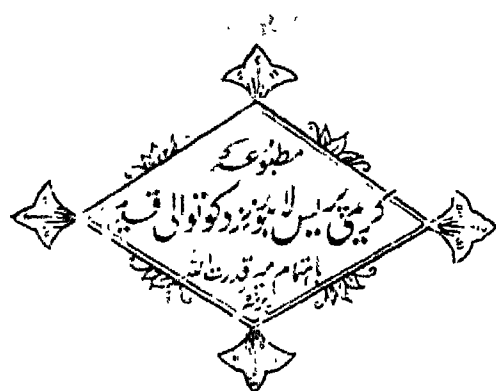
صفحہ و سطر	غلط	صحیح
الف (مقدمہ) سطر ۶	و ابستہ	وابستہ
" (") " ۱۵	تعلی	تعلق
ج (") " ۱۱	منگ	مُنگ
ص۷ سطر ۱۲	مصح	مصحح
" ۱۷ " ۶	ریختہ	ریختے
ص۲۰ سطر ۱۸	بھول	بھون
ص۲۳ " ۱۴	شمش العشاق	شمس العشاق
ص۲۷ سطر ۱	اردوئے قدیم میں	اردوئے قدیم نمبر میں
ص۲۸ " ۶	زباں	زبان
ص۳۴ " ۸	سنہ ۵۸۳ھ	سنہ ۵۸۲ھ
ص۳۵ " ۱۹	زبانوں سے	زبانوں میں
ص۳۸ " ۴	اشعار	شعر
ص۳۹ " ۱۵	ہندوستانی	ہندوستان کی
ص۴۰ " ۱۷	میں	ہیں
ص۴۱ " ۲۱	چنگیزی	چنگیزی
ص۴۴ " ۶	ملتان ہوا لاہو	ملتان و لاہو
ص۴۵ " ۲۰	سنکانو	سنگانو
ص" " ۲۱	ستنارگانو	سنارگانو
ص۴۶ " ۳	ہوشربا	ہوشربا
ص۴۸ " ۱۸	علو اقبال خاں	ملو اقبال خاں
ص۵۹ " ۱۱	جمع میں ہے	جمع ہے
ص۶۶ " ۱۸	توں	نوں

صفحہ و سطر	غلط	صحیح
ص۶۲ - سطر ۱۰	متروک	ترک
ص۶۳ " ۱۶	ناظرین کے	ناظرین کو
ص۶۹ " ۶	جس بنا	اس بنا
ص۸۱ " ۱	سنہ ۹۸۰ھ	متوفی سنہ ۱۰۲۰ھ
ص۸۲ " ۲۱	غلط ہیں	غلطی پر ہیں
ص۸۴ " ۱۲	الفاظ کہ	الفاظ کو
ص۸۶ " ۳	کڑی	لاکڑی
ص۸۷ " ۲۱	پنجاب	پنجابی
ص۸۸ " ۵	وراں	براں
ص۹۴ " ۲۰	سنہ ۱۰۳۰ھ	سنہ ۱۰۲۰ھ
ص۱۰۱ " ۱۲	ڈھنڈ	دھنڈ
ص۱۰۳ " ۸	لفظ ورائے	لفظ "ورائے"
ص۱۱۲ " ۱۹	ناظرین کے	ناظرین کو
ص۱۱۳ " ۱۵	تھا	تھے
ص۱۱۴ " ۹	سنہ ۷۲۲ھ	سنہ ۷۲۵ھ
ص۱۱۵ " ۱۰	سنہ ۷۳۶ھ	سنہ ۷۲۶ھ
ص" " ۱۶	سنہ ۹۳۵ھ	سنہ ۹۲۵ھ
ص۱۱۷ " ۱۳	سنہ ۱۰۴۷ھ	سنہ ۱۰۷۴ھ
ص۱۲۱ " ۱	رائیا	راسا
ص۱۲۲ " ۱۴	کی حیثیت	حیثیت
ص۱۲۴ " ۴	سنہ ۷۲۴ھ	سنہ ۷۲۵ھ
ص" " ۱۰	سیر آب	سیراب

Date	No.	Date	No.